www.bhatkallys.com

یہ دلی ہے

از

سید یوسف بخاری، دہلوی

Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com

ناشر

ایچ-ایم-سعید کمپنی
ناشران و تاجران کتب
ادب منزل پاکستان چوک
کراچی

www.bhatkallys.com

اس طبع دوم کے صرف حقوقِ طباعت و فروخت بحقِ ناشر محفوظ

طبع اول : فروری سنہ ۱۹۴۳ء

طبع دوم : دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء

ناشر: ایچ - ایم سعید کمپنی، ناشران و تاجران کتب - اَدب منزل،
پاکستان چوک، کراچی

طابع: ایجوکیشنل پریس، ادب منزل - پاکستان چوک، کراچی

خطّاط: حافظ حبیب اللہ

رسم الخط: نستعلیق

سرورق : جمال یوسف

صفحات ۳۶۴ - تعدادِ طبع : دو ہزار

قیمت : [illegible] روپے

سنہ ۱۹۶۳ء

www.bhatkallys.com

اِنتساب

وَالِد مَاجِد

الحاج سیّد حامد بخاری مرحوم مغفور

کے

نام

www.bhatkallys.com

Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com

Souce: Sunday Old Book Bazar, Karachi
23 March, 2014

www.bhatkallys.com

فہرست:

پیش لفظ: ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مرحوم ۳
حرفِ اوّل: مصنّف، ۵
حرفِ ثانی: مصنّف، ۷
دِلّی کی کلیاں ۱۳
دِلّی کی دِلّی ۳۰
دیوان خانہ حکیم محمد اجمل خاں ۵۹
دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں ۸۴
دِلّی کا مکتب ۱۱۸
دِلّی کی عید ۱۳۶
دِلّی کی شادی ۱۵۱
دِلّی کے شہدے ۱۷۲
دِلّی کے کرخندار ۱۹۱
دِلّی کے دھوبی ۲۱۳
دِلّی کی آتش بازی ۲۴۲
دِلّی کی پتنگ بازی ۲۶۶
دِلّی کی شطرنج ۳۰۵
دِلّی کی مُہر کنی ۳۲۷
دِلّی کی سادہ کاری ۳۴۳

www.bhatkallys.com

پیش لفظ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، معتمد انجمن ترقی اردو (ہند)

یوں تو دلی پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن سید یوسف بخاری صاحب نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ خاص چیز ہے اور ان چیزوں کا لکھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی اور چھپی ڈھکی باتوں سے انھیں ایسی گہری واقفیت کیوں کر حاصل ہوئی۔ آنکھ، کان، غور و فکر اور تخیل سے کام لینے کے علاوہ انھوں نے تلاش و تحقیق میں بھی بڑی کاوش کی ہے۔ ایسے مضمون وہی لکھ سکتا ہے جو بقول میر امن کے دلی کا روڑا ہو اور ساتھ ہی لکھنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ جس مضمون کو لیا ہے اُس کا نقشہ ایسی زبان میں اور ایسے ڈھنگ سے کھینچا ہے کہ پورا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

جس عید کی کیفیت آپ اس کتاب میں دیکھیں گے وہ آج کل کی عید نہیں اور نہ پھر کبھی ایسی عید آئے گی۔ یہ شاہی زمانے کے ساتھ تھی اور اُس کے ساتھ یہ بھی گئی۔ سید یوسف صاحب نے نہ معلوم کہاں کہاں سے کھوج لے کر ایک ایک بات نکالی ہے اور پھر اُن کو ایک سلسلے میں جوڑ کر کیسا دلچسپ مضمون بنا دیا

www.bhatkallys.com

ہے۔ یہ خیالی باتیں نہیں، سچے واقعات ہیں۔ باقی دوسرے مضامین مثلاً دِلّی کی گلیاں، دِلّی کا ایک محلہ۔ دِلّی کے "کرخندار"۔ دِلّی کے شہدے، دِلّی کے دھوبی۔ دِلّی کی پتنگ بازی وغیرہ بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ ہر جماعت، ہر فرقے اور ہر فن والے کی بولی، اُن کے خاص خاص محاورے اور اصطلاحیں، اُن کے لب و لہجے کی نقل، آپس کی نوک جھونک بڑی خوبی سے دکھائی ہے۔ یوں تو ہر مضمون پُرلطف ہے لیکن پتنگ بازی کا بیان بڑی معلومات کا ہے۔ پتنگ بازی کے معرکے، کامل اُستادوں کا ذکر، پتنگ کی قسمیں، لڑانے کا ڈھنگ، اُس کی اصطلاحات سب اپنے اپنے موقع پر خوب بیان کی ہیں۔ آخر میں مختلف قسم کے پتنگوں کی شکلیں اور اُن کے نام بھی دیے ہیں۔

غرض یہ کتاب بہت ہی دلچسپ ہے۔ دلچسپی کے علاوہ اس میں بہت سی کام کی باتیں بھی ہیں، آپ اس میں بہت سے نئے لفظ، نئے محاورے اور نئی معلومات پائیں گے۔ سید یوسف صاحب بخاری کا طرزِ بیان دلکش ہے اور اس کے ساتھ شوخی و ظرافت کا بھی چٹخارا ہے۔ زبان سادہ، شگفتہ اور دِلّی کی زبان ہے اور ہر بیان اور موقع کے مناسب ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ "یہ دِلّی ہے"۔

عبدالحق

۲۰ر فروری ۱۹۴۴ء

www.bhatkallys.com

حرفِ اوّل

سید یوسف بخاری

دِلّی مٹ گئی، دِلّی والے خاک میں جا سوئے مگر دِلّی اور دِلّی والوں کی تہذیب آج بھی تاریخ کا سب سے رنگین، دل آویز اور دیدہ افروز صفحہ ہے۔ اِن تمام مضامین میں دِلّی کی اُسی قدیم معاشرت اور تہذیب کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس نے دِلّی کی شہرت کو چار چاند لگا دیے اور اُسے غیر فانی اور لاثانی بنایا۔ افسوس! وہ مذاق اب رفتہ رفتہ فنا ہوتا جا رہا ہے لیکن اِس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ آج سے نصف صدی پہلے کی وہ باتیں اَب بھی درد مند دلوں کو آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی اور تڑپاتی ہیں اور جب کبھی اُس زمانے کی یاد آئے گی تو کلیجہ توڑ دے گی۔

اس مجموعے میں "دِلّی کے شہدے" اور "دِلّی کی پتنگ بازی" دونوں بالکل نئے مضمون ہیں، باقی مضامین آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے تقاریر یا فیچر کی صورت میں وقتاً فوقتاً نشر ہو چکے ہیں۔ لیکن یہاں اُن کو کافی ترمیم و ایزاد کے بعد شامل کیا گیا ہے۔ کیونکہ اپنے موضوع اور بحث کے اعتبار سے اُن میں گھٹانے اور بڑھانے کی کافی گنجائش تھی۔

www.bhatkallys.com

اس کے بغیر وہ تشنہ رہتے۔

اِن صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خیالی باتیں نہیں، گزرے اور بیتے ہوئے واقعات ہیں، اِن کو تحقیق کرنے کے لیے مختلف کتابوں کا مطالعہ کیا۔ دِلّی کے اکثر اُن بزرگوں سے مِلا جو اِس موئی مٹی کے موڑ نام ہیں اور اُن لوگوں میں بھی پہنچا جن کے متعلق بعض مضامین ہیں اور اس طرح جو کچھ حاصل کر سکا وہ پیش کر دیا۔ پھر بھی آپ سے یہ استدعا ہے کہ اگر آپ کی تحقیق اور مطالعے میں کوئی بات غلط یا نئی ثابت ہو تو براہِ کرم مجھے اُس سے ضرور مطلع فرمائیں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کا خیال رکھا جائے۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دوں کہ "دِلّی کے شہدے" والے مضمون میں صفحہ ۱۴۱ پر حضرت امیرؔ کے نام سے جو شعر درج کیا گیا ہے وہ امیرؔ کی بجائے حضرت حالیؔ مرحوم کا ہے، ناظرین پڑھتے وقت اس کی صحت فرمالیں۔

سید یوسف بخاری

گلی امام صاحب
اُردو بازار، جامع مسجد
دِلّی۔

www.bhatkallys.com

حرفِ ثانی

سید یوسف بخاری

سچ پوچھیے تو دلّی میرؔ اور غالبؔ ہی کے سامنے مرحوم ہو چکی تھی۔ اُن کے بعد آنے والوں نے جس دِلّی کو دیکھا وہ میرؔ و غالبؔ کے زمانے کی دِلّی کا صرف ایک نقشِ موہوم تھا اور کچھ نہ تھا۔ ہم جو اُن کے پس ماندگان کہلائے، اُس جنّت نشان، دِلّی کے محض سوگوار اور پرستار تھے۔ دِلّی کے چند بچے کھچے بوڑھوں اور قدیم آثاروں کو دیکھ کر جو باقی رہ گئے تھے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیا کرتے تھے۔ اُن میں سے بھی اکثر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب معمول یہ ٹھہرا کہ جب گزشتہ زمانے کی یادستانی اور دِلّی کی برگزیدہ ہستیاں اپنے زندۂ جاوید کارناموں کے آئینے میں نظر آتیں، تو بے اختیار دل میں ایک درد اُٹھتا، کلیجہ منہ کو آتا اور آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ جاتی۔ لہو کے آنسو روتے اور آنسوؤں کے اِن تاروں سے صفحۂ قرطاس پر گُل بوٹے بناتے اور یوں ہم خستہ دل اپنے دلوں کی کچھ بھڑاس نکالتے رہتے۔

لیکن کیا کیا جائے اِس فلکِ پیر کو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک اور خونچکاں اِنقلاب رُونما ہوا۔ جن آنکھوں نے کبھی

www.bhatkallys.com

کشتوں کے پُشتے اور خون کی ندیاں بہتی صرف کتابوں میں پڑھی تھیں، اُن کو یہ خونی نظارہ خود دیکھنا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں دلّی اِس طرح اُجڑی، عزیز اقربا، کلیجوں کے ٹکڑے، آنکھوں کے تارے، محبوب اور پیارے، بے سان و گمان یوں بچھڑے جیسے بادِ تند کے جھونکوں سے پھول پتّی سے بکھر جائیں، پنکھڑیوں سے پتّیاں جُدا ہو جاتی ہیں اور خوش بُو آوارہ۔ جن کو پائے رفتن مقدر نہ ہوا وہ اُسی خاکِ پاک سے وابستہ رہے۔ اُن میں سے بھی اب بہت سے چل بسے۔ اور جن کو جائے ماندن ہاتھ آئی، وہ دلّی اور دلّی والوں کو خیرباد کہہ کر کوئی کہیں جا رہا اور کوئی کہیں جا پڑا۔ یوں دلوں کی یہ رہی سہی بستی بھی اُجڑ گئی۔ اب یہاں، وہاں اور نہ معلوم کہاں کہاں بستیوں پر بستیاں قائم ہو رہی ہیں، لیکن کون جانے دل کی پہلی سی بستی کبھی بس سکے گی یا نہیں۔ بستی اُجڑنا تو سہل ہے لیکن بسنا بسانا دشوار۔

۱۹۴۳ء میں جب برصغیر پاک و ہند کے باغیانوں میں رزم آرائیاں اور آسمانوں میں اُس کی بربادیوں کے مشورے ہو رہے تھے، ہم نے عہدِ کہن اور ماضی قریب کی چند داستانوں کو "یہ دلّی ہے" میں اس خیال سے پیش کیا تھا کہ شاید اس فریاد میں کچھ لذت ہو گی اور سوزِ نہاں سے شمعِ دل جل اُٹھے گی۔ بزمِ خاموش میں چراغاں ہو گا۔ دلّی کے بوستاں میں پھر سے بہار آ جائے گی لیکن کلکِ ازل کچھ اور ہی رقم کر رہی تھی۔ گل چینوں نے باغ تو باغ نشانِ برگ و گل بھی نہ چھوڑا۔ بقول عیش دہلوی اب تو یہ کہنا

www.bhatkallys.com

بھی مشکل ہے کہ یہاں غنچہ تھا اور یہاں گُل تھا۔

یہ اور بات ہے کہ فروری ۱۹۴۷ء میں جب یہ نقوش پہلی بار شائع ہوئے تو اہلِ دل نے کہا "ہاں! یہ دِلّی ہے"۔ شاید سچ مچ اُن کے سامنے دِلّی آ گئی تھی۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم، خدا اُنھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے، انہی دنوں مرحوم دِلّی کے مرحوم عربک کالج کے ایک ادبی جلسے میں جو اُن کی صدارت میں ہوا تھا، اسی کتاب کا ایک مضمون "پتنگ بازی" سُن کر مجھ سے زیرِ طبع مسودہ طلب کیا اور دوسرے یا تیسرے دن راقم کو یہ توقیع مرحمت ہوئی:

"ایسے مضمون وہی لکھ سکتا ہے جو بقول میر امن دِلّی کا روڑا ہو
کتاب پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ "یہ دِلّی ہے"۔"

اسی طرح مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم مغفور نے دِلّی سے دکن جاتے ہوئے دورانِ سفر میں اس کتاب کو پڑھا اور دکن پہنچ کر یہ نامۂ فرحت بھیجا:

"لوگوں کے لئے یہ کتاب "یہ دِلّی ہے" ہو تو ہو، ہمارے لئے تو "یہ دِلّی تھی" ہو گئی ہے۔ کان اُن آوازوں اور طریقۂ گفتگو کو ترستے ہیں جو اس کتاب میں درج ہے۔ میرے لئے تو یہ کتاب نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔"

حضرت نیاز فتح پوری ابھی حیات ہیں اور تا دیر زندہ و سلامت ہی رہیں، وہ "نگار" لکھنؤ اشاعت جون ۱۹۴۷ء میں اُن کی اس یزدگار نگارش نے "یہ دِلّی ہے" کو اس طرح چار چاند لگائے:

www.bhatkallys.com

"پُرانی دِلّی اور وہاں کی زندگی کو دِلّی ہی کی زبان میں پیش کیا گیا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ۔ اب کہ قدیم تہذیب و معاشرت ہر جگہ مٹتی جا رہی ہے ایسی کتابیں بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔"

مولینا تاجور نجیب آبادی مرحوم نے اپنے "شاہکار" لاہور میں رقم کیا:

"اگر آپ دِلّی دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ "یہ دِلّی ہے" اُردو ادب کے اس بحرانی دَور میں اُن بہترین کتابوں میں سے ایک ہے جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔"

"ڈان" (انگریزی) دِلّی نے لکھا:

"یہ دِلّی ہے" میں بہت سے مفید اور پُراز معلومات مضامین ہیں..... بسا اوقات وہ (راقم الحروف) اپنی جودتِ طبع، شوخی اور ظرافت میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کے ہم پلّہ نظر آتے ہیں۔"

جناب وقار عظیم سابق مُدیر "آج کل" دہلی نے شمارہ مئی ۱۹۴۵ء میں یہ رائے دی:

(راقم الحروف) دہلی کے اُن چند لکھنے والوں میں سے ہیں، جنھوں نے دہلی کی مٹتی ہوئی معاشرت اور تمدّن کی مُصوّری اپنی کتابوں میں کی ہے..... "بازگشت" بعض حیثیتوں سے پچھلے مجموعہ (یہ دِلّی ہے) کا ضمیمہ ہے..... اِن میں "دِلّی کی بھرکنی" اور "دِلّی کی سادہ کاری" مضامین اُسی سلسلے کی کڑیاں ہیں جو

www.bhatkallys.com

ہمیں "یہ دلّی ہے" میں ملتے ہیں۔"

باور کیجیے کہ اِن فرمودات کو یہاں نقل کرنے کا مقصد، گزارشِ احوالِ واقعی، اور اس کے سوا کچھ نہیں کہ اِن قدر دانیوں نے میرا دل بڑھایا، شوق میں اضافہ ہوا، جنوں نے وحشت کی راہ دکھائی۔ دلّی سے کالے کوسوں دُور چل کر اِس "پاک" سرزمین کو پالیا۔ لیکن دل ابھی تک اُنہی گلیوں اور رہ گزروں میں پڑا ہے۔ جن کے ذرّوں میں سیکڑوں جوہر مخفی ہیں۔ انہی جواہر کو میں نے پھر ٹٹولنا اور ٹانکنا شروع کر دیا ہے:

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

"یہ دلّی ہے" کا یہ دوسرا نقش ہے جسے حاجی محمّد ذکی صاحب ایم۔ اے (علیگ) مالک ایچ۔ ایم سعید کمپنی و ایجوکیشنل پریس کراچی کی ذکاوت نے اپنے لئے منتخب کر لیا ہے۔ ع

غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

اُنھوں نے مندرجۂ ذیل چند تازہ مطبوعہ نقوش بھی مجھ سے چھین کر اس میں شامل کر دیے ہیں:

(۱) درد کی دلّی، (۲) دیوان خانہ حکیم اجمل خاں، (۳) دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں، (۴) دلّی کی آتش بازی، (۵) دلّی کی شطرنج اور جناب وقار عظیم کی رائے کے مطابق "بازگشت" کے یہ دو مضمون بھی:

(۶) دلّی کی مہر کنی، (۷) دلّی کی سادے کاری۔

www.bhatkallys.com

خدا اُن کو اس ستم ظریفی کی جزا لئے خیر دے اور مجھ کو ایک بار، کم از کم ایک بار اُس خاکِ پاک پہ لے جائے تاکہ

میں اُس خانۂ خدا، جامع مسجد کی وہ اذان سُن آؤں جس کی صدا کعبے تک پہنچتی ہے۔ شاہ جہاں کے اُس لال قلعے اور محل کو دیکھ آؤں جو دُنیا کے سرتاج "تاج" میں محوِ خواب ہے۔ جمنا سے آبِ حیات کے دو گھونٹ پی لوں اور باوضو ہو کر بائیس خواجہ کی چوکھٹ پر فاتحہ کا نذرانہ پیش کر آؤں۔

دلّی کے اوراقِ مصوّر کوچہ و بازار میں گھوم آؤں، گلی امام میں اپنے مولد و مسکن کو دیکھ آؤں۔ اپنے لڑکپن اور جوانی کے ساتھی، ہم سایہ ماں جایہ، اختر انصاری سے معانقہ کروں اور جی بھر کر باتیں کروں اور اُن دوستوں سے بھی مِل آؤں جن کی یاد بھلائے نہیں بھولتی۔

دلّی! تیری کوکھ ٹھنڈی رہے، دلّی! تیری گود بھری رہے، دلّی! تو ہمیشہ آباد اور سلامت رہے۔

بُخارا رہا اب نہ دھلی ہماری
کراچی میں ہے "بیتِ یوسف بُخاری"

۱۳۸۱ھ

سیّد یوسف بخاری

یکم ستمبر ۱۹۶۳ء

بیتِ یوسف بخاری
۵-۱۴-کے-۲-ناظم آباد-کراچی

www.bhatkallys.com

دِلّی کی گلیاں

یہ دِلّی ہے! دِل لینے والی دِلّی!! اِسے لوگ ہندوستان کا دِل سمجھتے ہیں، لیکن سچ پوچھو تو یہ سارے جہان کا دِل ہے۔ یہ دِلّی کبھی اندرپرست موہنا تھی، جس میں راجا اندر کے جشن ہوا کرتے تھے۔ ہندو پجاری اِس دِلّی میں پوجا پاٹ کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے اور اَب بھی سمجھتے ہیں۔ اِسی موہنا دِلّی نے راجا دہلو، حاکمِ قنوج کا دِل موہ لیا تھا۔ وہ دِلّی کو دہلو کہتا تھا۔

یہی دِلّی کچھ مُدّت شیر شاہی دِلّی کہلائی پھر ہمایونی دِلّی بنی اور بالآخر شاہجہاں آباد ہو گئی۔ لال قلعہ تعمیر ہوا، تختِ طاؤس رکھا گیا۔ بادشاہ اور وزیروں کے اونچے اونچے محل بنے۔ شاہی امیروں کی عالی شان حویلیاں کھڑی ہوئیں۔ دِل کشا باغات لگے۔ نہریں جاری ہوئیں۔ حوض بنائے گئے۔ فوارے لگائے گئے۔ شہر کی فصیل، بڑے بڑے دروازے، چوڑی چوڑی سڑکیں، شان دار چوک قائم ہوئے، چھوٹے بڑے مختلف بازاروں، گلی اور کوچوں میں گنجان اور خوشنما مکانات

www.bhatkallys.com

بنے۔ ہر گوشہ ایک چمن اور کوچہ و بازار اوراقِ مصوّر بن گئے۔ بقول ظہورؔ :-

نقوشِ پیکرِ ارژنگ تھے درو دیوار | نگار خانۂ چینی تھے کوچہ و بازار
مکاں مکاں سے ہویدا تھا جوشِ فصلِ بہار | بنا محلّہ محلّہ تھا غیرتِ گلزار

فلک صفائیٔ عمارت پہ زہر کھاتا تھا
چمک سے ذرّوں کی خورشید تھرتھراتا تھا

پھر جو زمانے نے ایک کروٹ لی اور ذرا اپنا رنگ بدلا تو اسی دلّی پر وہ آفتیں نازل ہوئیں، متواتر اور پے در پے کہ الاماں والحفیظ۔ ڈھائی سو سال قبل جب عالمگیر کے بیٹے معظم اور اعظم خانہ جنگی میں مُبتلا تھے، اُردو زبان کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اُس وقت جعفر زٹلی جیسے شاعر نے دلّی کی بربادی پر ایک نوحہ لکھا تھا جو قدیم اُردو کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

کہاں اب پائیے ایسے شہنشاہ | مکمّل کامل و اکمل دِل آگاہ
رُکت کے آنسوؤں جگ رُوتا ہے | نہ بیٹھی نیند کوئی سوتا ہے
صدائے توپ بندوق است ہر سُو | بسر اسباب و صندوق است ہر سُو
دِوا دُو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے | بچہ در گود سر گٹھیا دھری ہے
کٹا کٹ و لٹا لٹ ہست ہر سُو | جھٹا جھٹ و پھٹا پھٹ ہست ہر سُو
بہر سُو مار مار و دھاڑ دھاڑ است | اَدِھل چال و تبر خنجر کٹار است
ازاں اعظم وزیں سوئے معظم | جھڑا جھڑ و دھڑا دھڑ ہر دو یا ہم
بہ بینیم تا خدا از کیست راضی | بخوانند نامہ بر نام کہ قاضی

www.bhatkallys.com

سن ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ آزادی دلّی پر آخری اور بے پناہ ضرب تھی۔ اُس نے مغلیہ سلطنت کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو یکسر گل کر دیا۔ بہادر شاہ اور زینت محل دو نوں رنگون میں جا سوئے۔ شاہی پسماندگان سوگوار اور رعایا اشکبار ہو کر رہ گئی۔ اُن لوگوں کو جو دلّی کے روحِ رواں تھے بادشاہت کی بربادی اور اپنی تباہی کے بعد اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ دلّی کو چھوڑ کر فیض آباد اور لکھنؤ وغیرہ میں جا بسیں۔ لیکن جس انقلاب کے ہاتھوں لاکھوں اور کروڑوں دلوں کی یہ بستی ایک خرابہ ہو گئی تھی، اسی کی بدولت چند ہی دن بعد لکھنؤ جیسا شہر بھی اُجڑا دیار بن گیا۔ حضرت داغ مرحوم نے دلّی کی تباہی پر جو دردناک مرثیہ لکھا تھا اس کا یہ ایک بند ملاحظہ ہو:

فلک زمین ملائک جناب تھی دہلی
بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دہلی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اُسے کھا گئی نظر کس کی

تاریخ کے اس سرسری سے جائزے کی روشنی میں یہ قدیم دلّی کی صرف ایک جھلک تھی۔ آئیے اب دلّی کی اُس معاشرت اور تہذیب پر بھی ایک نظر ڈالیں جو اُس سے متعلق ہے، جس کی شہرت نے دلّی کو چار چاند لگائے اور اب مٹتا جا رہا ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس نظر سے دلّی کو دیکھا۔ دلّی کی عمارتوں، بازاروں اور کوچوں کی سیر کی۔ بھول بھلیاں جیسی گلیوں میں پھرے یا "ہنوز دلّی دور است" کے مصداق سچ مچ دلّی کو دور سمجھ کر اپنا جی مسوس کر رہ گئے۔

www.bhatkallys.com

آیئے! اس جنّت سواد، شاہجہاں آباد، دِلّی کو میری آنکھوں سے دیکھیے اُس دِلّی کو دیکھیے جو رِشی اور جگت گروؤں کا استھان، بائیس خواجہ کی چوکھٹ، ہندو مسلمان راجاؤں اور بادشاہوں کی راج دھانی، علم و حکمت کا مرکز، تہذیب و تمدّن کا سرچشمہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔

دِلّی کی وہ صفائی اور آب و تاب، وہ رنگ روپ اور سج دھج، وہ چاندنی چوک، وہ لال کنواں، وہ جامع مسجد اور اس کا چوک جہاں گُل و بُلبل کا سودا ہوتا ہے۔ جہاں ہاتھوں کے طوطے اُڑتے بھی ہیں اور بکتے بھی ہیں۔ ایک طرف کبوتر باز اور چڑی ماروں کا غول ہے تو دوسری جانب لالوں کے شوقین اور کلکدم لڑانے والوں کی ہنسی اور ٹھٹھول ہے۔ حضرت "ہرے بھرے" کے مزار پر پھولوں کی مہک ہے۔ وہیں سڑک پر ایک بھنڈ ابردار ایک بڑا سا خوبصورت گڑگڑا لئے کھڑا ہے۔ کاندھے پر تمباکو اور کوئلوں کا چرمی تھیلا ہے۔ حقے پر چاندی کی سفید مُنال ہے جس کی ریشمی سٹک پر اُس پر لپیٹے ہوئے پھولوں کی وجہ سے وہ پھولوں کی ایک چھڑی معلوم ہوتی ہے۔ جس شوقین کی اُس پر نگاہ پڑتی ہے وہ دو چار کش لے کر لطف اُٹھاتا ہے اور اس کی مٹھی گرم کر دیتا ہے۔ جا بجا ساقی پانی کی مشکیں پھلائے کھڑے کٹورا بجا رہے ہیں۔ کہنے کو کنوئیں کا پانی، لیکن اتنا میٹھا، سُبک اور ٹھنڈا کہ برف کو شرمائے اور خواہ مخواہ پیاس لگ آئے۔ کٹوروں کی جھنکار ملہار بن کر کانوں میں گونجے۔ سودا بیچنے والوں کی معنی خیز صدائیں جن کو سُن کر خواہ مخواہ جی للچائے اور طبیعت کھانے پر مجبور ہو۔ تماشا یوں

www.bhatkallys.com

کی وہ کثرت کہ کھوے سے کھوا چھل جائے اور تھالی پھینکو تو سروں پر چلی جائے۔

وہ سر شام بازاروں کی رونق اور چہل پہل، آدمیوں کا ہجوم، سیرانی جیوڑوں کا اِدھرے اُدھر ایلا گیلا پھرنا۔ وہ اُن کا ہنسی مذاق اور ٹھٹول۔ کوئی پیدل ہے تو کوئی گھوڑا سوار، کوئی گاڑی میں ہے تو کوئی موٹر میں۔ گاڑی بانوں کی ہٹو بچو، موٹروں کی بھوں بھوں، ٹمٹموں کی ٹن ٹن، دکانیں ایک سے ایک بڑھ کر مرصع و مزین، لاکھوں کے زر و جواہر اور ہزاروں روپے کے قیمتی سامان سے بھری اور سجی۔ ان میں خوبصورت مرد، حسین عورتیں، بھولے بھالے ہنس مکھ بچے خرید و فروخت میں مصروف ہیں۔ ذرا کی ذرا میں ہزاروں اور لاکھوں روپے کی ریل پیل ایک معمولی بات ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی دلّی کے غریب دکرخندار، کوتھے کا پاجامہ، مہین ململ کا کڑھا ہوا کرتا۔ کرتے میں سے رنگین ازار بند جھلکتا ہوا، بدن پر ریشمی پھول وار واسکٹ۔ سر پر کام دار ٹوپی۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی یا پتلی نوک کا انگریزی چمک دار پمپ پہنے خوب بنا ٹھنا پان رچائے دوست کے گلے میں باہیں ڈالے ضرور سرِ بازار پھرتا ہوا پاؤ گے۔

دِلّی کے چند دروازوں اور کھڑکیوں کے نام سنئے:

سب سے پہلے تو دِلّی دروازہ پھر ترکمان دروازہ اور اجمیری دروازہ۔ بعض کھڑکیوں[1] کے نام بھی دروازوں ہی کے ناموں پر ہیں اور بعض

[1] شہر یا قلعہ کا چھوٹا دروازہ۔

www.bhatkallys.com

علیحدہ، مثلاً کھڑکی اجمیری دروازہ، کھڑکی فراش خانہ، کھڑکی تفضل حسین خاں۔

بعض گلی کوچوں کے نام ملاحظہ ہوں:

گلی امام، گلی شاہ تارا، گلی بتاشاں، گلی بندوق والی، بلبلی خانہ، فراش خانہ، کٹرہ گوکل شاہ، کٹرہ نیل، کٹرہ بڑیاں، کوچہ تاراچند، کوچہ چیلان، مٹیا محل، رنگ محل، چاندنی محل، تیلی واڑہ، قاضی واڑہ، مالی واڑہ، پہاڑی املی، پہاڑی بھوجلہ، مچھلی والان، سوئی والان، سرکی والان، پھاٹک حبش خاں، تراہا بیرم خاں، باڑہ ہندو راؤ، رودگراں، حویلی اعظم خاں، حویلی ککو خواص، حویلی حیدر قلی، اردو بازار، موتی بازار، گلشن گنج، طوطا میدا، بارہ دری میر درد وغیرہ وغیرہ۔

آیئے! اب ذرا ان گلیوں کی سیر کریں اور دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔ چلیے اسی سامنے والی گلی بھوجلہ پہاڑی میں چلیں۔ یہ بڑی لمبی گلی ہے۔ دائیں بائیں بہت سی گلیاں واقع ہیں۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں نکلیے دوسری سے تیسری میں اور تیسری سے چوتھی میں۔ اسی طرح یہی ایک گلی یا اس گلی کی مختلف گلیاں آپ کو مختلف گلی کوچوں اور بازاروں میں پہنچا دیں گی۔ بھول بھلیاں جو ٹھہری۔

دیکھنا! وہ سامنے سے کچھ لڑکے چیختے چلاتے چلے آتے ہیں "کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے، برسے گا برسا دے گا، کوڑی کھیت لگا دے گا، کوڑی گئی ریت میں، پانی آیا کھیت میں"۔ ان کے بدن پر صرف ایک لنگوٹی ہے، باقی سارا دھڑ ننگا اور منہ کالا۔ ایک کے ہاتھ میں رکابی ہے۔

www.bhatkallys.com

محلہ در محلہ، مکان بر مکان پہنچ کر یہی آواز لگاتے ہیں۔ وہاں سے کچھ نہ کچھ پیسہ یا دھیلا مل جاتا ہے۔ ان چیخنے والے لڑکوں اور ٹُن کرنے والوں کا خیال ہے کہ جب بارش نہ ہوتی ہو تو اس طرح ہو جاتی ہے۔

اس گلی میں زیادہ تر کارخانے دار بھائی رہتے ہیں۔ کوئی تار کش ہے، کوئی بتیا، کوئی زردوز ہے، کوئی زرکوب، کوئی لوہار ہے تو کوئی سنار، کوئی تو کٹنے اور کٹوڑیاں بناتا ہے تو کوئی اُس کے وزن اور باٹ، ان میں سے اکثر غریب ہیں لیکن سب کے سب مخلص اور ملنسار، سیر سپاٹے اور کھیل تماشے کے بے انتہا شوقین۔ چنانچہ ان کے لڑکے بھی ویسے ہی کھلنڈرے اور بے فکرے ہیں جن کو صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک سوائے آپس میں کھیلنے، لڑنے بھڑنے اور آوارہ پھرنے کے کوئی دوسرا کام نہیں۔

ان لڑکوں کے کھیل بھی دنیا سے نرالے اور دلچسپ ہیں۔ جاڑے کے کھیل الگ ہیں، گرمی اور برسات کے الگ۔ پھر موسم کے ساتھ ساتھ ان میں وقت کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ یعنی دن کے کھیل اور ہیں اور رات کے کھیل اور۔ بعض محض تیوہاروں کے لئے مخصوص ہیں۔ اگر ان سب کھیلوں کو تفصیل کے ساتھ لکھا جائے تو اس کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ لیکن میں آپ کو ان سے بے خبر بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ پہلے آپ سردی کے موسم کے کھیل سنئے۔ یہ سب تقریباً دن کے وقت دھوپ

لہ زر و جواہر تولنے کی چھوٹی ترازو۔ لہ پیتل کے چھوٹے چھوٹے کٹوری نما پیالے۔

www.bhatkallys.com

میں کھیلے جاتے ہیں، کیونکہ جاڑے کے زمانے میں رات کے وقت سردی زیادہ ہوتی ہے۔

گلی ڈنڈا، گیڑیاں، گھُگھی پالا، جھُوٹرانی یا سات سمندر، لنگر، ہتھا بالشت، نوکنکرہ، کچا لو بچنا، بھڑیں پکڑنا۔

گرمی کے کھیل جاڑے کے کھیلوں کی بہ نسبت تعداد میں زیادہ ہیں اور دلچسپ بھی ہیں، کیونکہ گرمی اور برسات کے زمانے میں ویسے بھی گھروں میں رہنا وبال معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح گھر کے بڑے رات کو گیارہ گیارہ اور بارہ بارہ بجے چل پھر کر واپس آتے ہیں اسی طرح یہ لڑکے بھی گرمی اور برسات کی کالی اور چاندنی راتوں میں کم از کم دس گیارہ بجے تک یہ کھیل گلی کوچوں اور سڑکوں پر برابر کھیلتے رہتے ہیں۔ دن کے وقت، رنگیل کنیل کانٹیاں، کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے، چوسر، شطرنج، بچیسی، ریل گاڑی، بانس کا گھوڑا، مٹی کے بیل اور گھروندے رات کے وقت کوڑا جمال شاہی، آتی پاتی یا چھُپنی مُنّی کا پہاڑ ودا، آنکھ مچولی، کوڑی جگن مگن، سُرنگ لال گھوڑی، چادر چھپول، اکڑ بکڑ، اٹکن بٹکن، عدالت اور انصاف، کہانیاں اور پہیلیاں، رسّہ کشی۔ ان کے علاوہ قسم قسم کی آتش بازی شب برات پر اور عید بقر عید کے تہواروں پر پتنگ بازی، محرم کے دنوں میں سبیل، تعزیہ داری اور مرثیہ خوانی اور پھر جاڑا ہو یا گرمی جب جی چاہا کبڈی کھیلنے لگے۔ کبڈی کا مقابلہ عموماً جمعرات یا جمعہ کے دن شام کے وقت شہر سے باہر کسی کھلے اور پُر فضا میدان میں ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ

www.bhatkallys.com

تماشہ ہی ہونے لگا۔ صبح سے شام تک کبوتر ہی اُڑاتے رہے۔ کوئی اُستاد مل گیا اور محلے میں اکھاڑا قائم ہوا تو صبح شام کسرت اور کشتی کے داؤں پیچ کے علاوہ رات کو لکڑی چلانے کا فن بھی سیکھتے ہیں۔

شاید دلّی کے مشہور شاعر حضرت میر نے انہی تیز اور شوخ لڑکوں کی شوخی اور شرارت سے بھرے کھیلوں کو دیکھ کر یہ شعر کہا ہوگا:

کیا میر تو روتا ہے پامالیٔ دل ہی کو
اِن لونڈوں نے تو دلّی سب سر پہ اٹھالی ہے

لڑکے اپنی ٹانگوں میں جو بانس کا ایک ٹکڑا لے کر اپنا گھوڑا بنائے گلی میں دوڑتے اور کودتے پھرتے ہیں اُس کے متعلق حضرت میر فرماتے ہیں:

چاہت بری بلا ہے کل میر نالہ کش بھی
ہمراہ نَے سواراں دوڑے پھرے نفر سے

اسی طرح ایک جگہ گڈّی اُڑانے والے لڑکوں کے متعلق لکھتے ہیں:

جب سے کاغذ باد کا ہے شوق اُسے
ایک عالم اُس کے اوپر ڈور ہے
اُڑاتا گڈّی وہ باہر نہ آوے
مُبادا مجھ کو بھی گڈّا بنا وے

جاڑے کے زمانے میں جب بھڑوں اور تتیوں کے ڈنک کا زہر سردی کے اثر سے گھل کر کم ہوجاتا ہے اور لڑکے ان کو ڈورے میں باندھ کر اڑاتے پھرتے ہیں اُس کے متعلق کسی کا شعر ہے:

پَر نہ باندھا پاؤں باندھا بلبلِ ناشاد کا
کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا

www.bhatkallys.com

ذرا دیکھنا! یہ چھوٹے چھوٹے ہم عمر لڑکے "سُرنگ[1] لال گھوڑی" کھیل رہے ہیں۔ اِن میں سے دو لڑکے جو عمر میں اوروں سے ذرا بڑے ہیں سردار بنے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں اپنے لئے کھلاڑیوں کا انتخاب کر رہے ہیں۔ اِن کا طریق انتخاب بھی کیسا عجیب اور کتنا دلچسپ ہے کہ اس میں کوئی جھگڑا یا ٹنٹا پیدا ہی نہیں ہوتا۔ باری باری دو دو لڑکے جوڑیاں ملا کر یعنی ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے، مٹکتے اور اٹھلاتے ہوئے سرداروں کے سامنے آتے ہیں۔ اور گانے کے انداز میں لہک لہک کر یوں اپنا تعارف کراتے ہیں۔ ذرا ان کی یہ تُک بندی سُنیئے:

"اٹنگ بٹنگ میں پڑی زنجیر
کوئی لے مُکّا کوئی لے تیر
تیر کی بیٹی سبز کمان
کوئی لے بڈھا کوئی لے جوان

ایک کا نام موٹر ایک کا نام ریل۔ بولو سردار ریل لوگے یا موٹر؟"

باری باری دونوں سردار ریل یا موٹر، لڈو یا امرتی کو یا جو نام بھی وہ لڑکے اختیار کر کے بتاتے ہیں، انتخاب کرتے جاتے ہیں۔ لیجیے آڑی تو بٹ گئے اور دو مقابل فریق بن گئے۔ اب کھیل کا آغاز کس فریق کی جانب سے ہوگا۔ وہ بھی معلوم

---

[1] سُرنگ سُرخ رنگ کے گھوڑے کو کہتے ہیں۔ فارسی میں اس کا نام کرنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ نے کرنگ کے بجائے اس کا نام سُرنگ رکھا کیونکہ ہندی میں ک بدی کی اور س اچھائی کی علامت ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان ناخواندہ کھلنڈرے لڑکوں کو یہ نام کیونکر سوجھا۔

www.bhatkallys.com

کر لیجئے۔ ان ہی دونوں سرداروں میں سے ایک سردار نے اپنے پاؤں سے جوتی نکال کر اوپر اُچھال دی اور کہا کہ اگر جوتی سیدھی گری تو کھیل کا آغاز ہماری جانب سے ہوگا اور اگر اَپٹ گری تو دوسرا فریق کھیل کی ابتدا کرے گا۔ اس قرعہ اندازی یا فیصلے کے بموجب اب کھیل شروع ہوتا ہے قرعہ جیتنے والے فریق کے تمام کھلاڑی سوار اور ہارنے والے اُن کے گھوڑے قرار پائے۔ اب ایک بڑے دائرے کی شکل میں گھوڑے آگئے اور سوار اُن پر سوار ہوگئے۔ جیتنے والے سردار نے دوسرے سردار کو اپنا گھوڑا بنا لیا۔ ایک ہاتھ سے اُس کی آنکھیں بند کرلیں اور دوسرے ہاتھ کو اوپر اُٹھا کر اپنی چند انگلیاں سب کو دکھاتے ہوئے اپنے گھوڑے سے پوچھا:

"آلو رتالو تیری چلتی کمر باندھوں گُل خُشبُو کے پیڑ تلے بول
گُر دُکے؟"

اگر گھوڑے نے انگلیوں کی تعداد غلط بتائی تو پھر یہ سوار اپنے ساتھیوں سے یہ کہتا ہے:

"غلط بتایا۔ (انگلیوں کی صحیح تعداد بتا کر مثلاً) دو کی ماری
ٹنٹنی گھوڑا سواری پہ چڑھ مارو۔"

سب سوار پہلے گھوڑے کو چھوڑ کر دائیں جانب کے دوسرے گھوڑے پر سوار ہوجاتے ہیں۔ اِس نئے گھوڑے سے بھی یہی سوال کیا جاتا ہے جب کوئی گھوڑا انگلیوں کی صحیح تعداد بتا دیتا ہے تو کھیل کا رُخ بدل

www.bhatkallys.com

جاتا ہے یعنی گھوڑے، سوار اور سوار، گھوڑے بن جاتے ہیں۔ بڑی دیر تک یہ کھیل یوں ہی جاری رہتا ہے۔

"اٹکن بٹکن" چھوٹے بچّوں کا کھیل ہے جس میں کئی بچّے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کھڑی کر کے زمین پر ٹکا دیتے ہیں۔ ایک بچّہ سب بچّوں کے ہاتھوں پر ایک انگلی باری باری رکھتا جاتا ہے اور یہ کہتا جاتا ہے: "اٹکن بٹکن دہی چٹکن، اگلا جھولے بگلا جھولے ساون ماس کریلا پھولے، پھول پھول کی بالیاں، باوا گئے گنگا لائے سات پیالیاں، ایک پیالی پھوٹ گئی، نیولے کی ٹانگ ٹوٹ گئی کھنڈا مارو ل یا چھری؟" اگر اس نے کہا "کھنڈا" تو وہ کہے گا "تیری ماں کا پیٹ ٹھنڈا" اگر اس نے کہا "چھری" تو وہ کہے گا "تیری ماں بُری"

"آنکھ مچولی" جسے پورب میں آنکھ مُندول کہتے ہیں فارس میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ وہاں اس کو چشم بندک کہتے ہیں۔ اس کے متعلق رشک کا ایک شعر ہے:

چار آنکھ نہ ہو نا ہی اُسے مدِّ نظر ہے
کھیلوں میں سے اُسے آنکھ مچولی نظر آئی

اسی کے متعلق سیّد احمد دہلوی مصنّف فرہنگ آصفیہ کہتے ہیں:

کوسوں کی دیکھو آنکھ مچولی نہیں سند
جب تم ہی یاں نہ ہو تو وہاں چھونے جائے کون

انہی گلیوں میں جہاں لڑکے رات دن کھیلتے اور اُدھم مچاتے پھرتے

www.bhatkallys.com

ہیں وہاں دن کے وقت کبھی مداری، کبھی بندروالا، کبھی سانپ والا، اور کبھی نٹ اپنے کھیل تماشے دکھاتا ہے اور جب کسی کے گھر میں ولادت ہو تو اس کی خوشی اور مبارکباد میں ہیجڑے اور بھانڈ آکر ناچتے گاتے اور انعام لیتے ہیں۔ فال نکالنے والا جسے اپنے صرف چند ٹکوں سے کام ہے، سادہ لوح مردوں اور خاص کر توہم پرست عورتوں کو کچھ کا کچھ بتاکر خوش اور پریشان کرتا ہے۔ اگر کوئی منہیار آتا ہے تو اچھی خاصی پردہ دار عورتیں چوڑیاں پہننے کے لیے اپنا سونٹا سا ہاتھ کواڑوں کی درز میں سے بے دھڑک باہر نکال دیتی ہیں۔ گلی میں بازی گر اپنا کھیل تماشا دکھانے میں مصروف ہو یا برات کے ساتھ کوئی دولہا گھوڑے پر گزرے یا اس کے برخلاف کسی اہلِ محلہ کی میت نکلے تو یہ عورتیں ضرور اپنے گھروں کی چھتوں اور دیواروں، برآمدوں اور کھڑکیوں میں جھانکتی ہنستی یا روتی ہوئی نظر آئیں گی۔ برسات کے زمانے میں رات کے وقت جب آسمان پر گھٹا چھائی ہو اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو اس وقت یہ عورتیں جھولا جھلانے میں مصروف ہوں گی اور اس بھیگی ہوئی رات کے سناٹے میں آپ کو یہ ملہار ضرور سنائی دیں گے:

فرق اتنا ہے کہ اس میں رس ہے مجھ میں ہائے ہے

چھا رہی ہے کاری گھٹا جیا مورا لہرائے ہے

یا پھر پرانے گیتوں میں سے یہ گیت۔

اماں آڑد جامن گھلے دھرے   اماں میں نہیں کھاتی میری ماں

www.bhatkallys.com

مال، ایک کریلا میں بویا بھابی سے کہیو توڑے نا۔

دن کے وقت صبح ہی صبح یا سرِ شام اِن عورتوں کی لڑائی کا منظر بھی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے دروازوں پر لگی کھڑی ہیں آدھا دھڑ اندر ہے آدھا باہر۔ دونوں ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیخنے بکنے کوسنے اور گالیاں دینے میں مصروف ہیں۔ بعض اوقات صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہوجاتی ہے لیکن لڑائی ختم ہونے پر نہیں آتی۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی گلی میں اپنے دوست کے مکان پر اُس کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ برابر کے دروازے سے آپ کو آواز آئے گی "ارے بھئی ذرا منہ پھیر لینا" آپ حیران ہو کر اُس طرف دیکھیں گے، اُس دروازے میں کہ جس کا ایک کواڑ بالکل کھلا ہوا ہے اور دوسرا بند، کواڑ کے پیچھے ایک عورت اپنا چہرہ باہر نکالے کھڑی ہوئی ہے جوں ہی آپ کی نگاہ اُس پر پڑے گی وہ فوراً آپ کی نظروں سے نظریں ملا کر نہ دیکھنے کے انداز میں دیکھتی ہوئی کہے گی "ارے بھئی ذرا منہ تو پھیر لو ہم اُدھر جائیں گے" آپ صورتِ حال سے گھبرا کر منہ پھیرنے کے ساتھ ساتھ گلی کے باہر جانے کا ارادہ کریں گے اور وہ آپ کے پیچھے اپنا دوپٹہ سنبھالتی اور گھبراہٹ میں پاؤں سے نکلی ہوئی جوتی کو ایک دوبارہ پہنتی، نکلی ہوئی آئے گی، آپ پہلے سے زیادہ پریشان ہو کر اُسے پھر پلٹ کر دیکھیں گے۔ وہ کہے گی "کیسا بے شرم مردوا ہے پلٹ پلٹ کر دیکھے ہی جاتا ہے" اور پھر فوراً اُس مکان میں گھس جائے گی جہاں اُس کو جانا ہے۔

www.bhatkallys.com

چلتے چلتے بھی آپ کو دو تین اور آفتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ دو منزلہ مکانوں کے برآمدوں اور سریوں پر گیلی دھوتیاں لٹک رہی ہیں اور اُن میں سے پانی نپ رہا ہے کہ برابر ٹپک رہا ہے۔ آپ اُس سے بچ کر اپنا راستہ دوسری طرف اختیار کریں گے کہ ایک دفعہ ہی آپ اُس ٹوکری سے ٹکرا ئیں گے جس کو اوپر سے ایک عورت نے اس لئے نیچے پھینکا ہے تاکہ ترکاری فروش اُس میں ترکاری ڈال دے اور وہ آنے جانے کی تکلیف سے بچ جائے۔

ابھی آپ دو ہی قدم آگے بڑھے ہیں کہ دوسرے برآمدے میں سے ایک میلی کچیلی بڑھیا اپنا آدھا جسم باہر نکالے، دال سے بھرا ہوا مٹی کا ایک آبخورا یا نیکھے پر کوڑا اکرکٹ مکان کے چبوترے پر پھینکتی ہوئی نظر آئے گی۔ اگر آپ اُس کی زد میں نہ آئے تو یقیناً خوش قسمت ہیں ورنہ کیا کہنا۔ ایسے کوڑے کے ڈھیر جن پر آم کی گٹھلیاں، گھر کا بچا ہوا کھانا اور نالیوں کی کیچڑ ہوتی ہے آپ کو تقریباً ہر دروازے کے سامنے ملیں گے۔

انہی چبوتروں پر بیٹھ کر سودے سلّے کا بیوپار ہوتا ہے۔ اس درمیان میں آپ دیکھیں گے کہ گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے۔ نل کا پانی بے کار بہ رہا ہے یا پختہ فرش دُھل رہا ہے یا چوٹھے کی لیپا پوتی ہو رہی ہے۔

میت کے عزادار مرد بھی گلی ہی میں چارپائیوں پر بیٹھتے ہیں، اور شادی و غمی کے کھانے کی دیگیں بھی گلی ہی میں کھنکتی اور پھر خالی ہونے کے بعد گھنٹوں وہیں پڑی بھنکتی رہتی ہیں۔ اینٹوں اور پتھروں کے عارضی چولھے اور جلی ہوئی لکڑیاں، راکھ اور کوئلوں کے ڈھیر، آلو اور پیاز کے چھلکے

www.bhatkallys.com

بھی دہیں ملتے ہیں۔ شہر کے کنگلوں اور بھکاریوں کو مہمانوں کا بچا کھچا کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ اور وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے شرمناک لوٹ کھسوٹ اور چیخ و پکار کا بازار گرم کرتے ہیں۔ اتفاق سے اُسی وقت کھلونے بیچنے والی چماریاں، ٹرّو، کاغذ کی رنگین ڈگڈگی، گڑیا کی ڈولی بچوں کو دے کر اُن کے عوض کھانا لیتی ہیں۔ گھر کا سقہ، محلے کا بھنگی اور چوکیدار یہ تینوں بھی روٹیوں کے کونڈے، دال سالن سے بھرے ہوئے پتیلے سر پر لے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شام کے وقت مکان پر فقیروں کی صدائیں "یاد رب کی اور خیر سب کی۔ یہاں دے اور وہاں لے۔" کچھ دیر بعد پھول بیچنے والوں کی سُریلی آوازیں "لو کٹورے موتیا میاں لو کٹورے موتیا، بیٹیں آرہی ہیں چنبیلی ہیں، کیا بہار ہے زرد چنبیلی ہیں۔" رات کو برادری والوں کی پنچایت، خانگی قضیوں کا فیصلہ اور حکم، کٹ پتلیوں کا تماشا، وعظ، سوانگ اور خیال پڑھنے والوں کی محفلیں، اگر ان میں سے کچھ بھی نہیں تو کم از کم سستا اور مفت کا مطالعہ کرنے والے شوقین سرکاری لالٹین کے نیچے چبوترے یا کسی چارپائی پر بیٹھے یا لیٹے کوئی ناول یا داستان یا مہابھارت اور رامائن کے ہندی اشعار پڑھتے اور اپنے دو تین اَن پڑھ دوستوں کو سُناتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور پھر رات گئے تقریباً ایک دو بجے جب خدا کی ساری مخلوق آرام سے بے خبر سوتی ہے تو محلے کا بہادر اور وفادار چوکیدار اپنا موٹا شام دار لٹھ زمین پر

www.bhatkallys.com

ٹپکتا اور کواڑوں پر آہستہ آہستہ بجاتا اور چیختا ہوا سنائی دیتا ہے " جاگتے رہیو جاگتے رہیو "

ایسی زمین، ایسے زمان، ایسے مکیں، ایسے مکاں اور ان باتوں کے ہوتے ہوئے کس کا دل چاہے گا کہ وہ دلّی اور دلی کی گلیوں کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں لال قلعہ نہ ہو، جامع مسجد نہ ہو اور جمنا نہ بہتی ہو، حضرت ذوق مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں:

گرچہ ہے ملکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

www.bhatkallys.com

درد کی دلّی

دلّی کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ آج دلّی، دلّی والوں سے خالی ہے۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ وہ پہلے ہی ایسی کون سی آباد تھی۔ ہندوستان غیر منقسم کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر زمانے اور ہر دور میں اس پر آفتیں ہی نازل ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ شاہ جہاں بادشاہ نے دلّی کو اپنا پایۂ تخت بنا کر اسے نئے سرے سے آباد کیا۔ یکایک زمانے نے پھر ایک کروٹ لی۔ رنگ بدل گیا۔ ہوا پلٹ گئی، سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ ایک آزاد بادشاہ قیدی اور محکوم اور محکوم ایک مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھا۔ یعنی شاہ جہاں قید ہوا، داراشکوہ، شجاع اور مُراد اس کے بیٹے "جی" قتل ہوئے اور اورنگ زیب شہنشاہ عالمگیر کہلائے۔ اُن کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ سکّہ جاری ہوا۔ اسلامی سلطنت کے آخری عروج و اقبال کا بس یہی زمانہ تھا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت کی بنیادیں برابر کمزور اور کھوکھلی ہوتی چلی گئیں۔

محمد معظم شاہ عالم ابن عالمگیر سے لے کر ابوظفر سراج الدین

www.bhatkallys.com

محمد بہادر شاہ ظفر تک دس بادشاہ ہوئے۔ اُن میں سے چھ بادشاہوں نے صرف چند ماہ یا چند سال بادشاہت کی۔ البتہ محمد شاہ نے ۲۹ سال، شاہ عالم نے ۴۵ سال، اکبر شاہ ثانی نے ۳۱ سال اور بہادر شاہ نے ۲۸ سال تک یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ لیکن یہ سب کے سب نام کے بادشاہ تھے۔ کام کا ایک بھی نہ ہوا۔

اس تاریخی پس منظر کو اپنے خیال میں رکھئے اور اب حضرت درد کے زمانے پر نظر ڈالیے۔ ان سطور میں اُس وقت کی دہلی کے صرف سیاسی حالات، ادبی فضا اور مذہبی ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت خواجہ میر درد ۱۹ ذی قعدہ ۱۱۳۳ھ کو بعہد جلال الدین فرخ سیر پیدا ہوئے۔ اور ۲۴ صفر المظفر ۱۱۹۹ھ کو ۶۸ برس کی عمر میں شاہ عالم ثانی کے زمانے میں وفات پائی۔ ترکمان دروازے دہلی کے باہر اُن کا مدفن ہے۔

فرخ سیر کے زمانے میں مغلوں کے تاج و تخت پر سید عبد اللہ اور سید حسین علی جو سادات بارہہ سے تھے قابض تھے۔ یہ دونوں، گویا بادشاہ گر تھے جس کو چاہتے تخت پر بٹھاتے اور جسے چاہتے معزول کر دیتے یا مروا ڈالتے۔ چنانچہ فرخ سیر اگرچہ نیک خو اور نیک سیرت تھا لیکن اُسے اُن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہنا شاق تھا، کوشش کے باوجود اُس کی کچھ نہ چلی۔ غریب کو پہلے اندھا کیا گیا۔ بعد ازاں قتل کر دیا۔ سات ماہ میں جو چار بادشاہ بنائے یا گھڑے گئے اُن میں چوتھے بادشاہ

www.bhatkallys.com

محمد شاہ رنگیلے تھے۔ بادشاہ کی رنگ رلیاں مشہور ہیں۔ محمد شاہ کے عیش و عشرت اور غفلت کے باعث اسلامی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ہندو مسلم صوبائی ریاستیں اور دور پاس کی تمام غیر ملکی طاقتیں کھڑی ہو گئیں۔ چنانچہ ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے مارچ ۱۷۳۹ء میں دہلی پر حملہ کر دیا۔ محمد شاہ نے شکست کھائی۔ پھر اپنی ہی بے وقوفی سے قتل عام کرایا۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ بازاروں اور گلیوں میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ جانیں تلف ہوئیں۔ سنہری مسجد متصل کوتوالی میں بیٹھ کر یہ قیامت برپا کرانے کے بعد نادر شاہ، شاہ جہاں کا تخت طاؤس اور اس کے علاوہ اسی کروڑ روپیہ اپنے ہمراہ لے گیا۔ جاہ و مال کا یہ سارا نقصان محمد شاہ رنگیلے کی بدولت بے گناہ رعایا کو بھگتنا پڑا۔

ابھی یہ زخم مندمل نہ ہوا تھا۔ لوگ اپنے کلیجے کے ٹکڑوں اور پیاروں کو رو رہے تھے کہ ۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا، لیکن سرہند کے مقام پر شکست کھائی۔ اس لڑائی میں محمد شاہ کے وزیر قمر الدین شہید ہوئے۔ اس صدمۂ جانکاہ سے بادشاہ کی روح بھی پرواز کر گئی۔ محمد شاہ کی جگہ اس کا بیٹا احمد شاہ ۱۷۴۸ء میں تخت نشین ہوا اور نواب منصور علی خاں، صفدر جنگ اس کے وزیر مقرر ہوئے۔ مغلیہ دور کی یہ آخری فتح تھی۔ اس کے بعد پھر کبھی فتح کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اقبال کے بجائے آہستہ آہستہ زوال و ادبار آتا رہا۔

www.bhatkallys.com

صوبے باغی ہوگئے۔ دلّی لوٹنے اور تباہ کرنے کے لئے لٹیروں کو میدان مل گیا۔ روہیلوں نے زور پکڑا۔ اُن کا استیصال کرنے کے لئے صفدر جنگ نے مرہٹوں اور جاٹوں سے مدد مانگی۔ جن کی تنخواہیں مفتوحہ علاقوں کے محاصل سے ادا کی جاتی تھیں۔ اسی اثنا میں بادشاہ نے لاہور اور ملتان کے صوبے دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔

مرزا احمد شاہ کے بعد عزیز الدین عالمگیر ثانی نے ۱۷۵۴ء میں تخت سنبھالا۔ اس وقت صفدر جنگ کا انتقال ہو چکا تھا اور حکومت کی ساری باگ ڈور، نظام الملک کے پوتے، نواب غازی الدین کے ہاتھ میں تھی۔ سلطنت گھٹتے گھٹتے اطراف دہلی کے صرف چند اضلاع پر رہ گئی تھی۔ اودھ اور دکن کی ریاستیں خود مختار ہو چکی تھیں۔ باقی ملک کا سارا حصہ مرہٹوں کے قبضے میں تھا۔ غازی الدین نے نظام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے عالمگیر ثانی نے شاہ ابدالی کو طلب کیا۔ شاہ ابدالی اور غازی الدین کے درمیان پہلے تو خوب مقابلہ ہوا لیکن بعد میں کچھ ایسی گفت و شنید ہوئی کہ شاہ ابدالی غازی الدین کا کلمہ پڑھنے لگا، اور بادشاہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ شاہ ابدالی نے دہلی میں داخل ہو کر وہ ظلم و ستم ڈھایا کہ نادر شاہ کے حملے کی یاد تازہ ہو گئی۔ ۱۷۵۹ء میں تیسری بار پھر آدھمکا۔ اس مرتبہ غازی الدین نے سوچا کہ نہ معلوم اس وقت اونٹ کس کل بیٹھے، پہلی دفعہ تو میں نے اس کو شیشے میں اُتار لیا تھا اس بار کہیں بادشاہ اس پر اپنا دست شفقت نہ پھیر دے اور مبادا

www.bhatkallys.com

مجھ پر کوئی آفت آئے۔ اُس نے یہ سوچ کر اور موقع پاکر ایک دن بادشاہ کو کوٹلہ فیروز شاہ میں قتل کرادیا۔ شاہ ابدالی کو تو دلّی لوٹنے کے لئے محض ایک بہانہ درکار تھا۔ اُس نے بادشاہ کے قتل کا الزام بے گناہ رعایا کے سر تھوپا۔ سات دن تک قتل عام اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ لوٹ لاٹ بلند شہر چلتا بنا۔

اب مرہٹے اور جاٹ آپس میں خوب شیر و شکر ہو گئے اور مسلمانوں کو دودھ میں مکھی کی طرح سمجھنے لگے۔ چنانچہ اسی زعم میں دو مرتبہ شاہ ابدالی سے مقابلہ کیا۔ پہلی مرتبہ ہارے دوسری مرتبہ جیتے۔ دہلی میں گھس کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ قلعے کے دیوان خاص کی چاندی اور دیواروں اور ستونوں کے جواہرات تک اکھیڑ کر لے گئے۔ ۱۷۶۱ء میں اُنہوں نے پچاس ہزار کے لشکرِ جرّار کے ساتھ پانی پت کے میدان میں شاہ ابدالی سے لڑے لیکن منہ کی کھانی پڑی۔ شاہ ابدالی کا پھر دلّی پر قبضہ ہو گیا۔ لیکن اُسے تو بادشاہت کے عوض لوٹ مار کر آزادانہ زندگی پسند تھی اس لئے اُس نے عالمگیر ثانی کے بیٹے شاہ عالم ثانی کو بلوا کر جو غازی الدین کے خوف سے لکھنؤ میں مقیم تھا اُسے اُس کا تاج و تخت سونپ دیا۔

۱۷۶۷ء میں شاہ عالم کے زمانے میں جب سکھوں نے دلّی پر یورش کی تو شاہ عالم کے وزیر نواب نجیب الدولہ افغانی نے شاہ ابدالی کو پھر یاد کیا۔ ابدالی آیا لیکن بے نیل مرام واپس ہوا بلکہ ہمیشہ

www.bhatkallys.com

کے لئے ہندوستان سے چلا گیا۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ۱۷۸۸ء میں، اس پیر فرتوت کی جگہ غلام قادر خاں روہیلہ کور باطن پیدا ہوا۔ جس نے ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم ثانی کی دونوں آنکھیں نکالیں اور نہ صرف قلعہ بلکہ شہر اور آس پاس کے علاقوں میں وہ ظلم وستم توڑا کہ الامان والحفیظ۔ آخر میں وہ بھی اپنی سزا کو پہنچا۔ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم ثانی نے بھی رحلت کی اور احاطۂ درگاہ قطب صاحب دہلی میں جا سوئے۔

یہ تھے حضرت درد کے زمانے کے سیاسی حالات۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں ہنگامۂ آزادی برپا ہوا جو اس دلی پر آخری اور بے پناہ آفت تھی۔ اس نے خاندان تیموریہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو یکسر گل کر دیا۔ اسلامی سلطنت ختم ہو گئی۔ پس ماندگان سوگوار اور رعایا اشکبار ہو کر رہ گئی۔

بنی ہوئی تیری قسمت بگڑ گئی دلی
بسی ہوئی تیری بستی اجڑ گئی دلی!

ہمیں یہاں غدر اور مابعد غدر کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مذکورہ بالا واقعات سے صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ ان سیاسی تاریخی انقلابات کی وجہ سے ہماری معاشرت اور تمدن پر بہت زیادہ اثر پڑا۔ بد امنی کے علاوہ عزت و ناموس کی تباہی ہوئی۔ علوم وفنون کی بے قدری ہونے لگی۔ صنعتیں برباد ہو گئیں۔ صناع اور کاریگر کساد بازاری

www.bhatkallys.com

اور بے روزگاری سے عاجز آ گئے۔ کیا امیر اور کیا غریب، کیا بڑا اور کیا چھوٹا، ہر ایک مفلس اور قلانچ ہو گیا۔ ان حالات میں جب ہم اس زمانے کے ادبی ماحول کا جائزہ لیتے ہیں تو اسے بھی خراب و خستہ پاتے ہیں۔ اصل میں شاعری بھی بے فکروں اور پیٹ بھروں کا سودا ہے۔ جب تک انسان کو ملکی واقعات سیاسی حالات اور نجی معاملات کی طرف سے مکمل اطمینان اور فراغت حاصل نہ ہو کوئی شاعری کا حامی اور موئد نہیں ہوتا۔ بادشاہت قائم ہو تو شاعروں کا دربار بھی قائم اور جب حکومت اور نوابی خطرے میں ہو یا ختم ہو جائے تو پھر وہ قدردانی اور سرپرستی بھی ختم۔

احمد شاہ کے عہد میں جاوید خاں خواجہ سرا جو محمد شاہ کی بیوی نواب قدسیہ بیگم کا مشیر خاص تھا جب قتل ہوا تو میر تقی میر اور دوسرے شعراء کی قدردانی مفقود ہو گئی۔ اسی طرح عماد الملک نواب غازی الدین خاں کے اقتدار و حکومت میں فرق آیا تو سودا اور کئی دوسرے شعراء معاش کی وجہ سے پریشان ہو گئے۔ اس دور کے شعراء میں صرف حضرت میر درد ہی ایک ایسے قانع اور متوکل شاعر تھے جو کبھی کسی بادشاہ کے حضور میں نہ گئے اور نہ کبھی کہیں ملازمت کی۔ توکل کا وہ سجادہ جو اُن کے بزرگوں نے بچھایا تھا اُسی پر قناعت کے ساتھ بیٹھے رہے۔

نہیں مذکورِ شاہاں دردؔ ہرگز اپنی مجلس میں
کبھی کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادھم کا

www.bhatkallys.com

انتہا تو یہ ہے کہ قتل و خوں ریزی کے زمانے بھی دِلّی کو چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ آپ کا پورا نام خواجہ محمد میر تھا اور دردؔ تخلّص۔ حضرت دردؔ کے والد حضرت خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ حضرت گلشنؔ کے پیر صحبت تھے اور شاہ گلشنؔ حضرت شاہ محمد وحدت متخلص بہ گلؔ کے مرید تھے۔ اب گُلؔ کی رعایت سے سلسلے وار جو تخلّص ظہور میں آئے اُن کی غرابت اور ندرت دیکھئے۔ شاہ محمد وحدت گلؔ، شاہ سعد اللہ گلشنؔ، خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ خواجہ محمد میر دردؔ، خواجہ محمد میر اثرؔ، خواجہ ضیاء الناصر اَلمؔ، خواجہ محمد نصیر رنجؔ، خواجہ محمد ناصر جان محزوںؔ، خواجہ امام الدین ناصری غمؔ، خواجہ سید محسن علی ملالؔ، خواجہ ناصر نذیر فراقؔ، گویا گُل سے گلشن بنا۔ گلشن میں عندلیب پیدا ہوا، عندلیب کے دل سے درد نکلا۔ درد نے اپنا اثر الم اور غم کی صورت میں پیش کیا۔ اور بالآخر فراق ہوا۔

حضرت میر دردؔ اردو شعراء کے دورِ سوم سے تعلق رکھتے ہیں آپ کے ہم عصروں میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، مرزا جان جاناں مظہرؔ اور سراج الدین خاں آرزوؔ (میر تقی میرؔ کے ماموں) اور حضرت میر تقی میرؔ جیسے شہرۂ آفاق شعراء تھے۔ عمر کے لحاظ سے میر تقی میرؔ، خواجہ صاحب سے چند برس چھوٹے اور سوداؔ تقریباً ہم عمر تھے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ خواجہ صاحب پندرہ برس کی عمر میں رسالہ "اسرار الصلوٰۃ"[1] تصنیف کر چکے تھے اور میر اُس وقت اپنی تعلیم کی تکمیل میں مصروف تھے۔

---

[1] آب حیات مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۷ء صفحہ ۱۸۵۔

www.bhatkallys.com

ان دونوں آرزو کے مکان پر ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو ایک مراختہ (صحبتِ ریختہ گویاں) ہوا کرتا تھا۔ وہاں جب یہ بند ہوگیا تو یہ محفل خواجہ صاحب کی بارہ دری میں قائم ہونے لگی۔ مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ اور دیگر شعراء بہ نہایت پابندی کے ساتھ اس محفل میں شرکت کیا کرتے تھے۔ ہر چند کہ یہ محفل، مشاعرے کی محفل ہوا کرتی تھی لیکن مشاعرہ ختم ہونے کے بعد خواجہ میر درد اور یہ اساتذۂ سخن اُردو زبان کی درستی اور اصلاح کے لیے غور و فکر بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے باہمی مشورے سے جو اصلاحات تجویز ہوتی تھیں اُن کو اپنے کلام میں لاکر مقبولِ عام بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ کچھ مدت بعد جب خواجہ میر درد نے اس مجلس کو اپنے ہاں موقوف کیا تو میر کو اپنے گھر پر منعقد کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ میر رقم طراز ہیں:

"از پیش کہ باایں احقر اخلاص دلی داشت گفت کہ ایں مجمع را شما اگر بخانۂ خود معین بکنید بہتر است۔ نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد"[۱]

حضرت میر اپنی اور خواجہ میر درد کی شاعری کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے وہ میر ہی کے الفاظ میں سنئے:

(۱) "الحمد للہ والمنۃ کہ حرفِ آں سرِ سلسلۂ خدا پرستان[۲]

---

[۱] نکات الشعراء، مصنفہ میر دہلوی مطبوعہ انجمن ترقی اُردو دکن ۱۹۳۵ء ص ۵۱

[۲] " " " " " " " " ص ۵۰

www.bhatkallys.com

سودا افتاد۔ باطن آں قافلۂ اہلِ عرفاں کہ از ظاہرش ظاہر تر است زود کار کرد۔"

(۲) "جوش بہارِ گلستانِ سخن، عندلیب خوش خوانِ چمنِ این فن .... درچمنِ شعرش لفظ رنگیں چمن چمن، گلچین خیال او را گل معنی دامن دامن، شاعر زور آور ریختہ۔"[1]

میر کی تحریر کے ان الفاظ سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ میر صاحب خواجہ کے گلزارِ سخن کے خوشہ چیں رہی نہیں اُن کی توجہ کے ثمر کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔

سودا ہر کس و ناکس کی ہجو قلم بند کرنے کے لئے ہمیشہ کمر بستہ بیٹھے رہتے تھے۔ جہاں کسی نے ذرا خلافِ مزاج بات کہی اور وہ گرجے۔ "غنچہ لائیو ذرا میرا قلمدان" اور پھر آن کی آن میں اس غریب کی ایسی تیسی کر ڈالی۔ لیکن جہاں تک خواجہ میر درد کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ سودا جیسا ہجو گو خواجہ صاحب ہی کا نہیں بلکہ اُن کی کئی کئی پشت کی مداحی میں مصروف نظر آتا ہے۔ چنانچہ کلیاتِ سودا میں خواجہ میر درد کے پرنانا نواب میر احمد خاں کی مدح موجود ہے۔ نیز خواجہ میر درد کی شان میں سودا کا یہ شعر

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ
اے بے ادب تو درد کے بس دو بدو نہ ہو

---

[1] نکات الشعراء مصنفہ میر دہلوی مطبوعہ انجمن ترقی اردو دکن ۱۹۳۵ ص ۴۶، ۵۰۔

www.bhatkallys.com

اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ سوداؔ کو ان کی بزرگ شخصیت اور قادر الکلامی کا حد درجہ احترام اور اعتراف تھا۔ یہاں اس وقت اس مبحث کو چھیڑنے کی کوئی حاجت نہ تھی لیکن جملہ معترضہ کے طور پر اسے اس لئے چھیڑنا پڑا کہ آزاد نے "آبِ حیات" میں جو بیک وقت ادب و تنقید کا ایک نادر قلمی شاہکار اور شعراء کا لاجواب تذکرہ ہے۔ حسبِ عادت طبع اوّل میں جہاں میر ضاحکؔ اور مومنؔ وغیرہ کو نظر انداز کر گئے، وہاں خواجہ میر دردؔ جیسے کامل اور فرشتہ صفت کی ہستی کو داغ دار بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ ہم بجا طور پر یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ "میر ضاحکؔ کو اپنے مضامین اخباروں میں چھپانے کے لئے" نہیں بلکہ خود آزاد کو اپنی من مانی کارروائی کے لئے یعنی تعریف کرنے پر آئیں تو دوسروں کے معائب کو محاسن بنا دیں اور مذمت منظور ہو تو اُس کی ہجو ملیح کر ڈالیں، کے واسطے "قلم اور[1] روشنائی ہاتھ آئی تھی"۔

میرؔ و سوداؔ کی تحریریں پڑھ کر کوئی نادان سے نادان آدمی بھی آزاد کی اس گپ کا یقین نہیں کر سکتا کہ لکھنؤ میں میرؔ سے کسی نے پوچھا ہوگا اور انھوں نے بقول آزاد اُس کو یہ جواب دیا ہوگا:

(۱) "کیوں حضرت[2] آج کل شاعر کون کون ہے؟ کہا۔ ایک تو سوداؔ دوسرا خاکسار اور کچھ تامل کر کے کہا آدھے خواجہ میر دردؔ"۔

---

۱ آبِ حیات مطبوعہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۷ء صفحہ ۱۸۱

۲ " " " " صفحہ ۲۱۸

www.bhatkallys.com

(۲) "باوجود اس کے سودا اور میر تقی میر کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں ہر گز اُن سے کم نہیں۔" اور پھر لطف یہ ہے کہ آگے چل کر خود ہی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:

"خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں

گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے ناوک چلانے اور نشتر چبھونے میں آزاد حد درجہ آزاد اور بے باک واقع ہوئے تھے، مولانا شبلی نے سچ ہی کہا تھا۔ "وہ (آزاد) تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہونے لگتی ہے۔" اہلِ نظر و انصاف خود یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میدانِ شاعری میں خواجہ میر درد پیش رو تھے یا میر و سودا اور یہ کہ کون کس کا حریفِ سخن تھا۔ حق بات یہ ہے کہ میر نے غزل کا رتبہ آسمان پر پہنچایا۔ سودا نے فارسی قصیدوں کو نیچا دکھایا۔ درد نے اُن میں تصوف کی چاشنی دے کر سوز و گداز اور درد پیدا کیا۔ بقول امیر مینائی "بسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی تھیں۔" درد کی غزل سُن کر ناممکن ہے کہ کوئی دردمند دل نہ تڑپ لے۔ خود فرماتے ہیں:

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص کر دے

دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو!

۱؎ آب حیات مطبوعہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۷ء صفحہ ۱۸۵

۲؎ " " " " " " "

www.bhatkallys.com

میرؔ کے بہتر نشتر مشہور ہیں۔ نشتر کی خوں فشانی شبے سے بالاتر ہے اور اس کے مقابل پھانس کی ارزانی اور ہیچ مدانی بھی ظاہر ہے۔ لیکن دردؔ کے اس شعر میں سانس کی روانی کے ساتھ پھانس کی خونناب فشانی بھی دیکھئے کس درجہ گہرائی اور گیرائی رکھتی ہے۔

اس طرح جی میں سانس کھٹکے ہے
سانس ہے یا کہ پھانس کھٹکے ہے

یہ پُر درد اشعار بھی میر دردؔ ہی کے درد کا صدقہ ہے۔

جو ملنا ہے مل پھر کہاں زندگانی
کہاں تو کہاں میں کہاں نوجوانی
عجب خواب درپیش ہے پھر تو سب کو
سُنا لو ٹک اب اپنی اپنی کہانی
نہ جاوے گا جب تک مرے جی میں جی ہے
ترا غم ہے پیارے مرا یار جانی

ایک غزل کے دو شعر:

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

اور اب ذرا یہ نامۂ پیچیدہ بھی ملاحظہ ہو:

www.bhatkallys.com

مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا بارے
زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ

دنیا کے مصائب اور بے ثباتی :

تہمت چند اپنے ذمہ دھر چلے
جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے
شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

پیارے خاں مرحوم دلی کا ایک مشہور فن کار قوال تھا۔ ہمیشہ ایک ستار پر گایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا لڑکا ڈھولک بجاتا تھا ادھر اس کا زخمہ ستار کے تاروں کو چھیڑ کر ساز پیدا کرتا ادھر اس کی آہنگ میں درد کی یہ غزل ایک عجیب سوز پھونکتی :

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بے گانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا
اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

www.bhatkallys.com

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں | کبھو تو نے آ کر تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے | ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا
حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم | کھلی آنکھ جب، کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے دردؔ درپے ہو اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

بادۂ دردؔ کے یہ چند جرعات:

صبا جاتا ہوں گریاں میں چمن سے | گلوں کو باغ میں رکھیو تو خنداں
ہنس قبر پہ میری کھل کھلا کر | یہ پھول چڑھا کبھی تو آ کر
قصۂ زلفِ یار کیا کہیے | ہے دراز اور عمر ہے کوتاہ
ہستی نے تو ٹک جگا دیا تھا | پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم
یاروں ہی سے دردؔ ہے یہ چرچا | پھر کوئی نہیں جو گئے ہم

آپ کی تصانیف[۵۱] میں دیوانِ دردؔ اور اردو و فارسی رسالہ، اسرار الصلوٰۃ، وارداتِ دردؔ، علم الکتاب، آہِ سرد، نالۂ درد، دردِ دل، شمعِ محفل اور سوزِ دل ہیں۔ اِن میں سے دو چار ہی چیزیں اب بمشکل ملتی ہیں باقی تمام غدر میں تلف ہو گئیں۔

۵۱۔ آزاد نے آبِ حیات میں صفحہ ۱۸۵ پر خواجہ میر دردؔ کی تصانیف میں "واقعاتِ درد" کو بھی اُن کی تصنیف بتایا ہے۔ حالانکہ تحقیق کے باوجود اس کا کوئی وجود ثابت نہیں ہوتا۔ یہی صورت "حرمتِ غنا" کی ہے۔ اسی طرح آزاد کی تحقیق کا ایک

www.bhatkallys.com

آپ کے مشہور شاگرد:-

(۱) میر غلام حسن، حسنؔ، مشہور مثنوی سحر البیان آپ ہی کی ہے۔

(۲) جھمن لال جھمنؔ، امیر الامرا نواب ضابطہ خاں کی سرکار کے ایک معزز امیر "بہار دانش" کے مترجم۔

(۳) شاہ محمدی بیدارؔ بدایونی۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے مرید۔ آپ کا مزار آگرے میں زیارت گاہ خواص و عوام ہے۔ نالۂ عندلیب میں بھی آپ کا مذکور ہے۔

(۴) شیخ قیام الدین قائمؔ چاندپوری۔ بادشاہی اسلحہ خانے کے داروغہ۔ قابل فخر شاگرد تھے۔

نادر نمونہ یہ بھی ہے کہ خواجہ میر دردؔ کے والد کی مشہور تصنیف "نالۂ عندلیب" کے بارے میں رقم فرماتے ہیں کہ "وہ ایک رسالہ ہے" راقم اس نسخے کو دیکھ چکا ہے نیز اہل علم پر یہ بات بخوبی روشن ہے کہ نالۂ عندلیب دو جلدوں پر مشتمل ہے اور ایک ہزار صفحات سے زائد اس کی ضخامت ہے اس کے برعکس اسی آب حیات میں صفحہ ۱۷ پر "خالق باری" (منسوب بہ خسرو) کے متعلق آزاد لکھتے ہیں "کہ خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے، کبھی بڑی جلدوں میں تھی" حالانکہ متعدد نسخوں کی چھان بین کے بعد جواہر خسروی، مرتبہ عباسی صاحب چڑیا کوٹی میں خالق باری کے اشعار کی تعداد صرف ۱۹۵ ہے)۔

www.bhatkallys.com

(۵) حکیم ثناء اللہ خاں فراق - شاعری میں زانوئے ادب تہ کرنے کے علاوہ آپ سے محمدی طریقہ مجاہدہ بھی حاصل کیا۔

(۶) لطیف علی لطیف - شاگرد اور مرید۔

(۷) مرزا اسمٰعیل طپش - کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت سید جلال بخاری کی اولاد سے ہیں۔ سنسکرت کے عالم تھے۔ مرزا جہاں دار شاہ کی فوج میں ملازم تھے۔ شمس البیان اور مثنوی بہار دانش آپ کی تصانیف ہیں۔

(۸) شیخ محمد بقا اکبر آبادی - حافظ لطف اللہ خوش نویس کے فرزند۔ یہ وہی بقا ہیں جن کے معرکہ سخن میر تقی میر اور سودا سے ہوا کرتے تھے۔

(۹) محمد پناہ خاں پناہ - علم طب - موسیقی اور شاعری میں طاق تھے۔

(۱۰) لال مکند لال حضور - خواجہ صاحب کی صحبت میں اسلام قبول کیا۔ لیکن ہمیشہ ہندوانی وضع قطع میں رہتے تھے۔

(۱۱) مرزا محمد جان سیاقی، ان کے بزرگ دشت قبچاق کے رہنے والے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کے ملازم اور خواجہ صاحب کے خاص شاگرد تھے۔

(۱۲) لالہ نرائن داس بے خود - دلی کے مہاجنوں میں سے تھے۔ ہمہ وقت نشہ میں چور اور شاعری میں محو رہتے تھے۔

(۱۳) علی نقی محشر لکھنوی - اپنے وطن میں ایک شخص مرزا عیسیٰ کو قتل کرکے دلی بھاگ آئے تھے۔ واپس لکھنؤ گئے تو مقتول کے وارثوں

www.bhatkallys.com

نے اُن کو بھی ہلاک کر دیا۔

(۱۴) حضرت شاہ عبد القادر رح، حضرت شاہ عبد العزیز رح کے برادر خورد تھے۔ اُردو نثر نگاری میں حضرت دردؔ کے شاگرد ہوئے۔ اُن کا ترجمۂ قرآن مجید بے مثل اور مشہور ہے۔ کچھ مدت تصوّف اور سلوک کے مسائل بھی حضرت دردؔ سے معلوم کئے۔ حضرت دردؔ کے ہم عصروں میں محمد شاہ بادشاہ کی بیوی نواب قدسیہ بیگم (دہلی میں اُن کا قدسیہ باغ مشہور ہے) کا ذکر کرنا بھی مناسب ہے۔ اُن کا اصل نام ادھم بائی تھا۔ مذہباً شیعہ تھیں۔ اور رعناؔ تخلص کرتی تھیں۔ یہ شعر انہی کا ہے۔

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا
کمبخت کیسی آنکھ لگی اور دُکھ ہوا

یہ تھی حضرت دردؔ کی علمی اور ادبی دُنیا۔ آیئے اب اس عارف باللہ کی عارفانہ زندگی اور ماحول پر بھی ایک نظر ڈالیں:

آپ حسینی سیّد ہیں۔ آپ کا آبائی سلسلۂ نسب بارہویں پشت میں خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی رح سے ملتا ہے۔ خواجہ صاحب کے دادا شہر بخارا سے عہدِ عالمگیر میں دِلّی آئے تھے۔ آپ کے نانا سید محمد حسنی نواب میر احمد خاں کے صاحبزادے تھے۔ جیسا کہ انشائے نادری میں درج ہے، یہ میر احمد خاں معرکۂ پانی پت میں شہید ہوئے۔ آپ کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب اپنے وقت کے مشہور اہل اللہ میں سے تھے۔ صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرِ شیریں کلام بھی تھے۔ اُن کی

www.bhatkallys.com

تصنیف نالۂ عندلیب کی پہلی غزل کا یہ مطلع ملاحظہ ہو:

عندلیبم داستانِ گلستاں آوردہ ام
غنچہ سال در یک دلیہا صد زباں آوردہ ام

ایک دوسری غزل کا شعر ہے:

یار در خانہ، خود دارم و آرامم نیست
چشم دیدۂ من حلقہ بیرونِ در است

وزرت نے والد بزرگوار کا یہ روحانی فیض خواجہ دردؔ کو بھی بدرجۂ اتم ودلیعت فرمایا تھا۔ چونکہ آپ نے اپنے والد ہی کی آغوش میں پرورش پائی اور ابتدائی تعلیم بھی آپ ہی سے حاصل کی اس لئے خود بھی بلند مرتبہ درویش اور شاعر ہوئے۔ آپ نے اپنے والد ہی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے سجادہ نشین ہوئے۔ آپ نے جس طرح اپنی آبائی طریقت کو اختیار کیا اسی طرح تالیف وتصنیف کے میدان میں بھی اپنی نظم ونثر کی بنیاد عشقِ الٰہی پر رکھی۔

ابتدا میں آپ "بربدہ کا نالہ" واقع پہاڑ گنج رہا کرتے تھے۔ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ چلا گیا تو شہزادی مہر پرور کے بے انتہا اصرار پر کوچۂ چیلان میں منتقل ہو گئے۔ مہر پرور آپ کی مرید اور نہایت معتقد تھی۔ اُس نے اپنے صرفِ خاص سے آپ کے لئے چھوٹے بڑے نو مکان، ایک کشادہ بارہ دری اور ایک پختہ مسجد تعمیر کرائی تھی۔ چنانچہ یہ بارہ دری آج تک آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔

www.bhatkallys.com

اس بارہ دری میں یوں تو ہر روز مُریدوں اور معتقدوں کا خاص اجتماع اور ذکرِ خدا ہوتا تھا لیکن بقول خواجہ صاحب کے نواسے سید ناصر نذیر فراق مرحوم اس مجلس کی قابلِ ذکر شئے ایک لاکھ دانوں کی وہ تسبیح تھی جس کا ڈورا اتنا طویل تھا کہ بارہ دری کے چاروں گوشوں اور چہار سمت بیٹھنے والوں کے پاس بآسانی پہنچ جاتا تھا۔ اوّل تو یہ تسبیح خواجہ صاحب کے روبرو رکھی جاتی۔ آپ اس کا ایک سِرا اُٹھا کر درود پڑھنا شروع کرتے۔ اس کے بعد حاضرینِ مجلس میں سے جو جہاں بیٹھا ہوتا وہیں اس تسبیح کے ڈورے کا ایک حصّہ اٹھا کر وِرد میں شریک ہو جاتا تھا۔ اس طرح یہ تسبیح جامِ شراب کی طرح ساری بزم کا دُور کیا کرتی۔

فی الحقیقت خواجہ صاحب ایک خدا شناس اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے جو اپنے لیل و نہار کا بیشتر حصّہ اپنی بارہ دری کی خاموش اور پُرسکون فضا میں یا ادائیگی فرض نماز کے وقت مسجد میں گزارا کرتے تھے اُن کو عزلت پسندی اور گوشہ نشینی بہت محبوب تھی۔ اسی لئے طالبِ دُعا اور حاجت مندوں نیز خواص کو اُن سے بھی کم ملاقات کا موقع نصیب ہوتا تھا۔ بادشاہ و وزراء اور امراء سے تو انھیں دُور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہِ وقت جیسی عظیم شخصیت بھی اُن کی خلوت ہو یا جلوتِ خاص بلا اجازت باریاب نہ ہو سکتی تھی۔

چونکہ آپ سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک تھے اس لئے سماع کی

www.bhatkallys.com

طرف آپ کا کوئی رجحان نہ تھا اور کبھی آپ نے ذاتی رغبت سے اپنے ہاں کسی محفل سماع کا کوئی اہتمام کیا۔ ہمیشہ اس سے گریزاں ہی رہے لیکن اہل اللہ کی ایک نشانی اور مسلک یہ بھی ہے کہ وہ خلق اللہ میں سے کسی کی دل آزاری نہیں کرتے۔ بلکہ دل نوازی اور دل داری کے اصولوں میں ایک خاص وضع رکھتے ہیں۔ بقول نظیری ؂

نیازارم ز خود ہرگز دلے را
کہ می ترسم درآں جائے تو باشد

واقعہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے زمانے میں اہل چشت کی وجہ سے حلقۂ صوفیاء میں مجالس سماع کا انعقاد کچھ زیادہ ہو گیا تھا، لیکن بایں ہمہ اُن میں وہ عامیانہ جھلک اور بازاری رنگ نہ تھا بلکہ خاص آداب و قواعد کے تحت بڑی موقر اور سنجیدہ مجالس ہوتی تھیں۔ بنابریں بعض مخصوص صاحب دل بزرگ دوستوں کی بدولت خواجہ صاحب کی بارہ دری میں بھی گاہے ماہے ایک خوش گوار اور لطیف مجلس سماع منعقد ہو جاتی تھی جس میں کبھی کبھی خواجہ صاحب بھی بادل ناخواستہ شریک ہو جاتے تھے۔

اس سماع کے موضوع پر بھی آزاد نے انتہائی غلط بیانی اور الزام تراشی سے کام لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس غلط تحقیق میں خود خواجہ میر درد کے نواسے ناصر نذیر فراق مرحوم بھی اپنے ایک مضمون "کمالات خسروی"[1] میں اپنے اُستاد آزاد کے قدم بقدم نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

---

[1] مضامین فراق۔ مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دھلی۔ صفحہ ۱۱۱

www.bhatkallys.com

"معمول[1] تھا کہ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیس کو شہر کے بڑے بڑے کلاونت، ڈوم، گوّیے اور صاحبِ کمال، اہلِ ذوق جمع ہوتے تھے اور معرفت کی چیزیں گاتے تھے.......

شاہ صاحب (شاہ عبدالعزیزؒ) "عالمِ طفولیت" میں تھے۔ ایک دن جلسے میں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ اُن کی مُرید بہت سی کنچنیاں تھیں........ سب سامنے حاضر تھیں باوجودیکہ مولوی صاحب اس وقت "بچہ" تھے مگر اُن کا تبسم اور طرزِ نظر دیکھ کر خواجہ اعتراض کو پا گئے اور کہا کہ "فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں" مولوی صاحب نے کہا "ماں بہنوں کو عوام الناس میں لے کر بیٹھنا کیا مناسب ہے؟" خواجہ صاحب خاموش ہو رہے۔"

(آزاد)

"ہمارا[2] گھرانا خواجہ میر دردؒ سے لے کر خواجہ ناصر امیر مرحوم تک اس فن کا ماہر گنا جاتا تھا۔ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو راگ کی دو محفلیں ہوتی تھیں جن میں شہر کے تمام قوال اور گوّیے اور کنچنیاں بے بلائے

---

[1] آبِ حیات مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۷ء صفحہ ۱۸۷۔

[2] مضامین فراق مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی صفحہ ۱۱۱۔

www.bhatkallys.com

حاضر ہوتی تھیں اور رات بھر گا بجا کر اپنا اپنا ہنر دکھاتی تھیں......... حضرت شاہ عبد العزیزؒ اس تقویٰ اور طہارت پرہیزی موسیقی کے ارتھ وِدیا کو ایسا جانتے تھے کہ جب گویوں میں......... جھگڑا ہوتا تھا جو شاہ صاحب کی خدمت میں آکر عرض کرتے تھے کہ ہمارا فیصلہ کر دیجئے۔ شاہ صاحب اس تشریح کے ساتھ انھیں سمجھاتے تھے کہ وہ آپ کے قدم چوم لیتے تھے۔"

(ناصر نذیر فراق)

کیوں نہ ہو فاضل اُستاد کے لائق شاگرد تھے۔ استاد کی تحقیق، استاد کی تحریر اُن کے لئے ادبی فرمان اور صحیفے سے کم نہ تھی۔ غنیمت جانیئے کہ پھر بھی فراق نے اپنے اُستاد کی تحریر میں قدرے تصرف سے کام لیا کہ ڈوم اور یہ کنچنیاں وغیرہ "بے بلائے" حاضر ہوتی تھیں۔ البتہ شاہ عبد العزیزؒ کے متعلق جو ارشاد کیا گیا ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔

شاہ عبد العزیزؒ "عالم طفولیت" میں تو اس درجہ غیرت مند، غیور اور صاف گو تھے کہ انھوں نے بھری مجلس میں خواجہ میر درد کو ٹوک دیا، اور جب جوان، بالغ نظر اور صاحب علم ہوئے تو خود ڈوم ڈھاریوں اور کنچنیوں کے راگ اور موسیقی کے جھگڑے چکانے لگے۔

ہمیں تو وہ ایک لاکھ دانوں والی تسبیح کی روایت بھی جو فراق

مرحوم کی بیان کردہ ہے سرتاپا ایک مبالغہ ہی نظر آتی ہے۔ ہم اس روایت کا اصولِ درایت سے اس طرح تجزیہ کرتے ہیں کہ ہم نے متوسط درجے کی سو دانوں کی ایک تسبیح کا وزن کیا تو وہ تین تولے برآمد ہوا۔ اس طرح ایک لاکھ دانوں کی تسبیح کا وزن ۳۷½ سیر نکلا۔ اس وزن میں دھاگے کا وزن شامل نہیں ہے۔ عام تسبیحوں میں جو دھاگا استعمال ہوتا ہے وہ دانے کے درمیانی باریک سوراخ کی وجہ سے ... زیادہ موٹا اور مضبوط نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ تسبیح کا دانہ بڑا ہو تو اسی نسبت سے دھاگے کی جسامت اور وزن بھی مثلِ زُنّار ضرور بڑھ جائے گا۔ اگر ہم اس ایک لاکھ دانوں والی تسبیح کے دانوں کو عام دانوں کے مطابق تصور کریں تو دانوں کا وزن (۳۷½ سیر) دیکھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ اس کا باریک کمزور ڈورا اتنے وزن کا متحمل ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ یہ تسبیح کافی عریض و طویل رقبۂ بارہ دری میں ہر تسبیح خوان کے پاس روزانہ کم از کم دو تین گھنٹے گردش میں رہتی تھی، اس کا دھاگا کیونکر سلامت اور قائم رہتا ہوگا۔ بالغرض اگر اس میں دھاگے کی جگہ پیتل یا لوہے کا باریک تار بھی ڈالا جائے تو بل کھا کر اور الجھ کر ٹوٹ جانے کا اندیشہ بدستور باقی رہتا ہے۔

لہٰذا ظاہر ہے کہ بارہ دری کی ایک لاکھ دانے والی تسبیح کا دانہ عام تسبیح کے دانوں سے کم از کم دوگنا یا تگنا ریٹھے کی گولی کے برابر ہوگا اور اسی لحاظ سے ان دانوں کا سوراخ اور دھاگا بھی اتنا ہی موٹا اور

www.bhatkallys.com

مضبوط ہوگا نیز اسی نسبت سے اُس کا وزن بھی دوگُنا یا سہ گُنا ہوگا یعنی تقریباً (۱۱۱) سیر یا دو من ۳۱ سیر ہوگا۔ عقل باور نہیں کرتی کہ دو من ۳۱ سیر یا گئی گزری (۲، ۲½) سیر کی تسبیح بارہ دری میں استعمال ہوتی ہوگی۔

ہم نے تو دلّی اور اجمیر شریف کے صوفیائے کرام کے حلقوں میں تسبیح خوانی کا طریق یہ دیکھا ہے کہ ایک لمبی چوڑی چادر پر درمیان میں بیٹھنے کی گولیاں یا اِملی کے بیجوں کے بے شمار ڈھیر پڑے رہتے ہیں اور ان دانوں کو اہلِ حلقہ اُٹھا اُٹھا کر پڑھتے اور اپنے روبرو جمع کرتے رہتے ہیں۔

فراق مرحوم کی کچھ اسی تحریر پر موقوف نہیں۔ آپ ان کے دیگر مجموعہ مضامین ــــــــ لال قلعے کی ایک جھلک، چار چاند اور مضامینِ فراق وغیرہ کا مطالعہ کیجئے تو اس میں محض مضمون نگاری اور عبارت آرائی کے شوق میں جابجا زمین و آسمان کے قلابے ایک نظر آتے ہیں۔ اس قسم کی مبالغہ آرائی کچھ شعر و شاعری میں تو شاید زیب دیتی ہے لیکن مضامینِ نثر میں یہ شدّتِ مبالغہ ذوقِ سلیم کے لئے سراسر بار ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم یہ کیسے باور کرلیں کہ جس کی مجلس میں بادشاہ وقت بلا اجازت نہ آسکتا ہو وہاں فن کار طوائفیں ہی نہیں بلکہ کم تر درجے کی کنچنیاں بغیر اجازت برملا شرکت کرسکتی تھیں۔ ان طوائفوں کی فن کاری، حاضر دماغی اور علمِ مجلسی کا ایک نمونہ ہم انھیں سطور میں آگے چل کر پیش کریں گے۔

دوسری اور جو ہیں تاریخ کا التزام بھی کسی قابل سند تذکرے (ماسوا تذکرہ مصحفی اور وہ بھی بلا ثبوت) سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ

www.bhatkallys.com

خواجہ صاحب کی تصانیف میں سماع کے ضمن میں اس کا کوئی ذکر ملتا ہے
ان بے بنیاد باتوں کا ازالہ خود خواجہ میر درد کے حسب ذیل جوابات سے
ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے معترضین کے لئے تحریر فرمائے تھے:

"مرا نہ چنداں شوق ایں امر ست کہ مستغرقان ایں
کار باشد و نہ آں ہمہ ایں عمل نیک می شمارم کہ اہلِ
سماع از صوفیاں می پندارند" (آہِ سرد)

"بہر حال ایں مرا خدا می داند کہ من از خود خوانندگاں را
می طلبم و نہ مزدے بایں ہا می دہم و اگر تمام عمر نیایند
ہرگز مرا خطرہ شنیدنِ ایشاں نیاید۔ (آہِ سرد)

اس کے برعکس اب آزاد کے بیان کی روشنی میں غور کیجیے کہ
اگر حضرت میر درد سماع و غنا کے اس درجہ شوقین اور دلدادہ تھے اور
ڈوموں اور کنچنیوں سے ملاقات کرنے میں بھی انھیں کچھ عار نہ تھا تو پھر
انھوں نے رسالہ "حرمتِ غنا" کس شوق کے ماتحت تصنیف فرمایا تھا۔

قصہ کوتاہ گاہ بگاہ منعقد ہونے والی اس محفلِ سماع میں اس زمانے
کا مشہور قوال فیروز خاں اور اس کے ہم پلہ دوسرے ماہرانِ فن کی چوکیاں
از خود حاضر ہوتیں اور چند ساعت کے لئے اس بارہ دری کی فضا حافظ و
خیام، عرفی و جامی اور خسرو کا میکدۂ عرفاں بن جاتی اور راگ و موسیقی کا
ایک سمندر موجیں مارتا نظر آتا۔

آئیے کچھ دیر کے لئے اس محفلِ سماع کو چھوڑ کر بادشاہ کی اُس بزمِ رقص

www.bhatkallys.com

وسرود کا نظارہ دیکھیے جہاں ایرانی چنگ و رباب کے دل کش نغموں کے درمیان نور بائی طوائف کے گیتوں کی رسیلی تانیں اور رقص کی من موہنی ادائیں محمد شاہ بادشاہِ دہلی اور نادر شاہ ایرانی دو بادشاہوں کو اپنا متوالا بنا رہی ہیں مراد ہر انعام واکرام کی بارش ہو رہی ہے - اُدھر نور بائی کے لئے یہ حکم نادری صادر ہو رہا ہے -

نور بائی روئے ہند را سیاہ کن بیا کہ بہ ایرانت بریم"

نور بائی یہ حکم نادری سُن کر ایک دفعہ بدحواس اور پریشان تو ضرور ہوئی لیکن وہ جتنی خوش رُو، خوش گلو اور خوش ادا تھی اُس سے کہیں زائد نگاہ باز اور مردم شناس بھی واقع ہوئی تھی، وقت اور موقع شناسی سے کام لے کر فوراً ایک دوسری غزل شروع کی جس کے دو شعر یہ ہیں:

من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی
سوزم گرت نہ بینم، میرم چو رخ نمائی
نزدیک ست ایں چنینم دوراں چناں کہ گفتم
نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی

نادر شاہ یہ ذو معنی جواب سُن کر لاجواب اور بہت مسرور ہوا اور نور بائی کا مطلب سمجھ کر اپنے ارادے سے باز رہا - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کی طوائفیں بھی رقص و موسیقی میں طاق ہونے کے علاوہ علم مجلسی سے کس درجہ آگاہ اور ہوشیار تھیں - شاید اسی باعث دلّی اور لکھنؤ کے اکثر رؤسا اپنے لڑکوں کو آدابِ محفل کی تعلیم کے لئے اُن کے

www.bhatkallys.com

پاس بھیجا کرتے تھے۔

غرض یہ کہ حضرت دردؔ اپنے دوستوں کی منعقد کردہ محفلِ سماع میں جو یک سر فقیرانہ ہوتی تھی گاہ بگاہ شریک ہوا کرتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق ایک مرتبہ شاہ عالم بھی اسی جلسے میں شریک تھے۔ اتفاق سے اس دن اُن کے پاؤں میں کچھ درد تھا۔ بیٹھے بیٹھے ذرا پاؤں پھیلا دیا۔ خواجہ میر دردؔ نے فوراً بادشاہ کو ٹوکا۔

"یہ حرکت فقیر کے آدابِ محفل کے خلاف ہے۔"

بادشاہ نے اپنی معذوری کا اظہار کیا تو کہا۔ "اگر عارضہ تھا تو تکلیف فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟"

شانِ فقر اور بے نیازی اور بے خوفی کی شاید اس سے بہتر کوئی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔ اس زمانے کے کم و بیش تمام بزرگ ہی اعلائے کلمۃ الحق میں ایسے ہی بے باک جری اور دیدہ دلیر تھے۔ مثلاً خواجہ میر زبیر، خواجہ محمد ناصر، خواجہ میر اثرؔ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح، مولانا شاہ عبد العزیز رح، مولانا شاہ رفیع الدین رح، مولانا شاہ محمد الحق رح، مولانا مخصوص اللہ رح، مولانا فخر الدین رح اور مولانا شاہ آفاق رح ایسے ایسے صاحبِ دل۔ نیک نفس اور روشن ضمیر ہستیاں موجود تھیں جن کے دم قدم کی برکت سے ایک طرف عشق و معرفتِ الٰہی کے چشمے رواں تھے تو دوسری جانب فارسی اور اردو ادب کے پودے اُن کے ہاتھوں نشو و نما پا کر نئے نئے گل بوٹے کھلا رہے تھے۔ یہ انھیں صوفیائے کرام

www.bhatkallys.com

کا صدقہ جاریہ ہے کہ آج فارسی سے زیادہ اردو زبان زندہ ہے اور طول و عرض پاک و ہند سے نکل کر یورپ، امریکہ میں بھی اس کے عاشق زار موجود ہیں۔ یہ تھا حضرت دردؔ کا مذہبی ماحول اور اُن کی زندگی سے

دردؔ درویش ہوں مری تعظیم — خلق کرتی ہے کہہ کے یا اللہ

حضرت دردؔ کی وفات کے بعد اُن کے بھائی حضرت میر اثرؔ اُن کے سجادہ نشین ہوئے، پھر اُن کی رحلت کے بعد حضرت دردؔ کے صاحبزادے ضیاء الناصر آلمؔ جانشین ہوئے۔ حضرت آلمؔ کی دو اولادیں ہوئیں۔ ایک صاحبزادہ اور ایک صاحبزادی اُمانی بیگم صاحبہ۔ اِن امانی بیگم کے بطن سے عمدہ بیگم اور عمدہ بیگم کے بطن سے شمس النساء بیگم ہوئیں۔ یہی ہمارے مرحوم ناصر نذیر فراقؔ، دہلوی کی والدہ ماجدہ تھیں۔ ناصر خلیق فگارؔ، فراقؔ مرحوم کے فرزند ہیں۔ یہ قیام پاکستان سے قبل ۱۹۴۷ء تک اسی قدیم تاریخی مکان میں رہتے تھے۔ جس میں کبھی حضرت میر دردؔ کی رہائش تھی۔ ۱۹۴۷ء میں اُن کو بھی ہماری طرح پاکستان آنا پڑا۔ اب خدا جانے وہ کراچی میں ہیں یا کہاں؟ وہ جہاں بھی ہوں انھیں خدا شاد و آباد رکھے۔

---

www.bhatkallys.com

دیوان خانہ حکیم اجمل خاں

دیوان خانے کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مخصوص مجلس جہاں چند ہم مشرب ہم راز اور بے تکلف دوست جمع ہوں اور اِدھر اُدھر کی باتیں کریں، آپ بیتی کہیں، جگ بیتی سنیں۔ مقامی، غیر مقامی، ملکی اور غیر ملکی حالات اور واقعات پر تبصرہ ہو، خوش گپیاں اور ہنسی مذاق کی باتیں ہوں۔ اس طرح دن بھر کی کلفت کو دُور اور ایک دوسرے کی فلاح و بہبود کا سامان پیدا کیا جائے۔

شاہی زمانے میں سب سے بڑا دیوان خانہ لال قلعہ دہلی کا دیوانِ خاص تھا۔ جہاں بادشاہ کے وزراء اور امراء باریاب ہوتے اور تفنن طبع کے علاوہ امورِ سلطنت سے بادشاہ کو آگاہ کرتے تھے۔ بادشاہ اُن کی تدبیروں اور اپنی حکمتِ عملی سے ملک و ملت کی نگہبانی کرتا تھا۔ اسی طرح وزراء اور امراء کے دیوان خانے تھے۔ وہ بھی اپنی اپنی محل سراؤں، حویلیوں اور ڈیوڑھیوں میں جمع ہوتے تھے جہاں مختلف قسم کی چہ میگوئیوں، خیال آفرینیوں اور خوش مذاقیوں کے ساتھ ساتھ قومی و ملکی ترقی و فلاح کے متعلق غور و فکر ہوتا تھا۔

غدر کے بعد آخر میں جب دلّی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تو بہت سے

www.bhatkallys.com

دلّی والے اپنا وطن چھوڑ کر نہ معلوم کہاں کہاں جا بسے، پھر بھی اس قسم کے دیوان خانوں کا سلسلہ ایک مدت تک دلّی کے چند بچے کچھے امیروں کے یہاں باقی رہا۔ یہ لوگ ملکی ثقافت کے علم بردار، علم و ادب کے نام لیوا اور مخدوم ملّت سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے دل میں خدا کا خوف تھا، غریبوں کا درد تھا۔ ملک و ملّت کے لئے جگہ تھی اور ہمدردی و ایثار میں اپنی مثال آپ تھے۔ اِن دیوان خانوں میں یہ چند دیوان خانے زیادہ مشہور ہوئے:

دیوان خانہ حکیم اجمل خاں۔

دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں۔

دیوان خانہ ننھے خاں۔

دیوان خانہ لالہ سری رام۔

دیوان خانہ لالہ پارس داس خزانچی۔

دلّی کے جس چاندنی چوک کا ذکر غالبؔ کے خطوط میں آیا ہے اُسی کے قریب محلہ بلّی ماراں تھا۔ جہاں اب ہندوستانی دواخانہ واقع ہے، اس کے عین مقابل حکیم شریف خاں کی تعمیر کردہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے زیر سایہ مرزا غالب کا رہائشی مکان تھا۔ اس مسجد کے روبرو شریف خانی منزل ہے۔ اس کے اندر حکیم اجمل خاں مرحوم کا خاندانی مطب اور دیوان خانہ تھا۔ اس دیوان خانے کی کیفیت قلم بند کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس مطب اور دیوان خانے کی سابقہ عظمت اور شہرت پر کچھ روشنی

www.bhatkallys.com

ڈالی جائے جس کے باعث یہ اس قدر مشہور ہوا۔

حکیم صاحب کے آباؤ اجداد کا وطن کاشغر تھا۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ بابر بادشاہ (۱۵۲۶ء - ۱۵۳۰ء) کے ہمراہ تقریباً ۱۵۲۶ء میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ علم و حکمت کا یہ کارواں سب سے پہلے سندھ میں مقیم ہوا۔ عہدِ بابر تک یہ خاندان زیادہ تر امورِ سلطنت میں منہمک رہا۔ بعد ازاں اُن میں سے چند افراد کا رُجحان سیاست سے مذہب کی طرف ہو گیا۔ چنانچہ اس خاندان کے دو بزرگ خواجہ ہاشم اور خواجہ قاسم حیدرآباد سندھ میں مشہور درویش گزرے ہیں۔ اُن کے زہد و تقویٰ کی بنا پر ہندو اور مسلمان دونوں بکثرت اُن کے مرید تھے۔ اِن دونوں حضرات کے بعد مُلّا نورالدین علی قاری نے جو اپنے وقت کے امام تھے اپنی علمیت اور مذہبیت کی وجہ سے شہرتِ عوام اور بقائے دوام پائی۔ آج تک لوگ اُن کی بیش بہا تالیفات اور تصانیف سے استفادہ کرتے ہیں۔

بقول مشہور پادری سی۔ ایف۔ اینڈ روز انہی قاری کے بیٹے حکیم محمد فاضل خاں نے سب سے پہلے میدانِ طبابت میں قدم رکھا۔ اُن کے بعد اُن کے بیٹے حکیم محمد واصل خاں (اوّل) عہدِ عالمگیر (۱۶۵۹ء - ۱۷۰۷ء) آگرے سے دہلی آئے اور شاہی عہدۂ طبابت پر فائز ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) میں وفات پائی۔ اُن کے دو بیٹے حکیم اکمل خاں اور حکیم اجمل خاں (اوّل) ہوئے۔ محمد شاہ نے

www.bhatkallys.com

حکیم اکمل خاں کے حق میں نہ صرف اُن کے باپ کا منصب طبابت اور دو لاکھ کی جاگیر برقرار رکھی بلکہ حاذق الملک کے خطاب سے مزید عزت بخشی۔ بادشاہ کو اُن پر اس قدر اعتقاد اور اعتماد تھا کہ شاہی خاصے پر روزانہ حکیم صاحب کی مہر لگتی تھی۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد جب احمد شاہ (۱۷۴۸ء - ۱۷۵۴ء) تخت نشین ہوا تو کسی بنا پر عتاب شاہی کے باعث جاگیر ضبط ہو گئی اور حکیم صاحب گوشہ نشین ہو گئے۔ لیکن چند ہی روز بعد فرمانِ عفو جاری ہوا مگر اکمل خاں نے انکار کر دیا۔

افسوس ہے حکیم اجمل خاں (اوّل) کا کچھ حال زندگی معلوم نہ ہو سکا۔

حکیم اکمل خاں نے بھی اپنے ورثا میں دو لائق و فائق فرزند حکیم محمد شریف خاں اور حکیم محمد سعید خاں چھوڑے۔ ان میں حکیم شریف خاں نے ایسی شہرت و عظمت پائی کہ آگے چل کر یہ خاندان، خاندانِ شریفی کے نام سے مشہور ہوا یہ حکیم شریف خاں امامِ طب ہونے کے علاوہ مختلف علوم و فنون کے عالم فاضل بھی تھے۔ چنانچہ آپ نے متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ دربارِ شاہی میں بھی ان کو بڑا مرتبہ اور اعزاز حاصل تھا۔ آپ کو اشرف الحکما کا خطاب اور ضلع پانی پت میں ۲۵ ہزار کی جاگیر حاصل تھی۔ ۱۸۰۹ء اور بقول بعض مورخین ۱۸۱۵ء میں وفات پائی۔ درگاہ حضرت قطب صاحب واقع مہرولی، دہلی میں دفن ہوئے۔

حکیم شریف خاں کے چھ لڑکے تھے۔ ان میں حکیم صادق علی خاں بلند پایہ طبیب اور عالم ہونے کی وجہ سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بقول

www.bhatkallys.com

حکیم محمود خاں اُن کے زمانے میں سلطنتِ مغلیہ میں وہ پہلا سا جاہ و جلال اور دم خم باقی نہ رہا تھا اس لئے لال قلعہ کے ساتھ ان کی وابستگی اور تعلق بھی برائے نام تھا۔ انگریزوں نے خاندانی جاگیر ضبط کر کے حکیم صادق علی خاں اور ان کے پانچوں بھائیوں کا کچھ مشاہرہ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی خاندانی روایات اور عزت کو قائم اور زندہ رکھا۔ کم و بیش اسی سال کی عمر پائی۔ ۱۲۴۷ سنہ ہجری میں انتقال کیا۔ یہ بھی صاحبِ تصانیف بزرگ تھے۔ اِن کے تین صاحبزادے تھے۔ حکیم غلام محمد خاں، حکیم غلام محمود خاں اور حکیم غلام مرتضیٰ خاں۔

حکیم غلام محمد خاں خلفِ اکبر نے بعد حصولِ سعادتِ حج ۴۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ انھوں نے بھی مختلف علوم و فنون پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ مہاراجہ پٹیالہ کے معتمد خاص تھے۔ اِن کے بیٹے حکیم غلام اللہ خاں (خسر حکیم اجمل خاں ثانی) تھے۔ غالباً ریاست پٹیالہ سے اسی تعلقِ خاص کی بدولت ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آزادی میں جب سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تو شریف خانی منزل سرکاری فوج اور بلوائیوں کے دست برد سے محفوظ رہی۔

حکیم غلام مرتضیٰ خاں نے ۴۵ سال کی عمر پائی اور ۱۲۹۲ھ میں انتقال کیا۔ حکیم محمود خاں کا حال ہم قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ یوں تو یہ تینوں بھائی اپنے علم و فضل اور کمالات میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے لیکن حکیم محمود خاں اپنی علمی خصوصیات، طبی کمالات اور باطنی خوبیوں کے باعث ایسے مقبول اور ہر دل عزیز ہوئے کہ اُن کے طریقہ، علاج کے متعلق

www.bhatkallys.com

عجیب وغریب حکایتیں آج تک مشہور ہیں۔ اُن کی شہرت برصغیر پاک و ہند سے نکل کر افغانستان، ترکستان، ایران، عراق اور عرب تک پہنچی۔ اِن ممالک کے مریض دہلی آکر حکیم صاحب سے رجوع ہوتے تھے۔ حکیم صاحب اپنے طبی مشاہدات اور تجربات کو بلا ناغہ ایک روزنامچے کی صورت میں تحریر کیا کرتے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے برابر لکھتے رہے۔ اگرچہ یہ روزنامچہ اب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تبرک کی طرح اولاد میں تقسیم ہو چکا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک یہ قیمتی یادگار محفوظ ہے۔ فنِ طب سے متعلق تمام پیچیدہ مسائل اور اختلافی اُمور میں حکیم صاحب کو اپنے مشاہدے اور تجربے کی اساس پر علم یقین کا درجہ حاصل تھا۔ ایسے مواقع پر اُن کا فیصلہ ہمیشہ ناطق اور صائب ہوتا تھا۔

ہنگامۂ آزادی کے بعد جب دِلّی والے غدر کے مصائب میں مبتلا اور اپنی زندگی سے مایوس تھے تو ایسے پُر آشوب اور نازک وقت میں اِسی بندۂ خدا کا کام تھا جس نے اِن بے گناہوں اور مظلوموں کی دست گیری کی اور اُنھیں آفات و آلام سے محفوظ رکھا۔

حکیم صاحب ڈاڑھی چڑھاتے تھے۔ دو کلیہ ٹوپی، کرتا، کرتے پر کبھی ململ یا تن زیب کا انگرکھا، سخت جاڑے کے جاڑوں میں ایک نیم آستین اور صبح کے وقت ایک تیلی اونی چادر، اُڑسی تراش کا چُست پاجامہ یہ اُن کا خاندانی لباس تھا جو کم و بیش ایک مدت تک اُن کے ورثا میں باقی رہا۔ البتہ حکیم اجمل خاں نے اپنے اس خاندانی لباس میں شیروانی اور ترکی ٹوپی کو بھی شامل کر لیا تھا اور کانگریسی دور میں کھدر کی کشتی نما ٹوپی بھی پہنتے تھے۔

www.bhatkallys.com

حکیم محمود خاں اپنی زندگی کے لیل و نہار ایک باقاعدہ نظام کے مطابق بسر کرتے تھے۔ روزانہ کا دستور العمل یہ تھا کہ شب کو دو بجے بیدار ہو کر اوّل نماز تہجد ادا کرتے۔ اس کے بعد صبح تک اوراد و وظائف کا عمل رہتا۔ پھر علی الصبح گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاتے۔ ٹھیک سات بجے مطب میں تشریف لاتے۔ یہ بارہ بجے تک جاری رہتا۔ امیر ہو یا فقیر ہر ایک کا بلا امتیاز باری باری معائنہ فرماتے کھانا کھانے کے بعد دوپہر کو بلا ناغہ اپنا روزنامچہ لکھتے۔ پھر بے تکلف احباب کا اجتماع ہوتا۔ شطرنج کی بازی لگتی۔ شام کا مطب عصر کے بعد شروع ہو کر آٹھ بجے شب ختم ہوتا۔ شب کا کھانا کھاتے۔ پھر نماز عشاء اور وظائف سے گیارہ بجے شب فارغ ہو کر آرام کرتے۔ صوم و صلوٰۃ اور شرعی اوامر و نواہی کی پابندی کے ساتھ صوفی صافی اور صاحب نسبت و ادراک بزرگ تھے۔

حکیم محمود خاں کے بھی تین لڑکے ہوئے، حکیم عبد المجید خاں، حکیم واصل خاں ثانی اور حکیم محمد اجمل خاں ثانی اول الذکر نے مطب کی شہرت و عزت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اپنی دُور بینی سے انھوں نے طب یونانی کی ترقی و استحکام اور خدمت خلق کے لئے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یہ باب وہ درسگاہ طبیہ تھی جس کی بنیاد انھوں نے گلی قاسم جان کے ایک مکان میں ڈالی تھی۔ عمائدین شہر نے اس کا افتتاح کیا۔ لائق و فائق اساتذہ مقرر کئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ درس و تدریس میں بھی انھوں نے

www.bhatkallys.com

بہ نفسِ نفیس حصّہ لیا۔ تقریباً چودہ برس تک قانون شیخ اور دیگر طبی مسائل کا طلبہ کو درس دیتے رہے۔ اِن خاندانی وذاتی اوصاف اور خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں حکومتِ وقت نے آپ کو حاذق الملک کا خطاب اور تمغا پیش کیا۔ اس مخدومِ ملت نے ۲۳ ربیع الاوّل ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ درگاہ سیّد حسن رسول نما واقع نئی دہلی میں مدفون ہوئے۔ کتبۂ قبر پر کئی تاریخیں درج ہیں۔ اُن میں سب سے مختصر اور جامع تاریخ یہ ہے:

"مرقدِ پاکیزہ حاذق الملک"

۱۳۱۹ھ م ۱۹۰۱ء

بھائی کے انتقال کے بعد حکیم واصل خاں ثانی کا آفتابِ حکمت اور خدمت چمکا آپ نے بھی مطب کی آبائی مسند اور بڑے بھائی کی قائم کردہ درس گاہ کی گدّی پر بیٹھ کر اپنی حکمت اور بے لوث خدمات سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچایا۔ اپنے برادرِ خورد حکیم اجمل خاں ثانی کی صلاح پر درس گاہ کے اخراجات کے لئے ایک ہندوستانی دواساز ادارہ قائم کیا جو بعد میں ہندوستانی دواخانہ کے نام سے مشہور اور مقبول ہوا۔ افسوس اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد آپ صرف تین یا چار سال زندہ رہے اور صرف ۴۳ سال کی عمر پائی۔ ۱۹۰۴ء میں انتقال کیا۔ مذکورۂ بالا درگاہ سیّد حسن رسول نما میں اپنے بھائی کے قریب جگہ پائی۔

"شدہ واصلِ حق واصل خاں" آپ کی تاریخِ وفات ہے۔

www.bhatkallys.com

حکیم محمد اجمل خاں ثانی ۱۷؍شوال المکرم ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ موصوف اپنی غیر معمولی قابلیت اور شخصیت کی وجہ سے سچ مچ شرفِ خاندان ثابت ہوئے۔ حکیم صاحب کو اپنے آبائی علم طب کے علاوہ منطق، طبیعیات، ادب، فلسفہ، حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ پر بھی بڑا عبور حاصل تھا۔ حافظِ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے خطاط، ادیب، اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کی بعض غزلوں میں اُن کا تخلص "حافظ" پایا جاتا ہے لیکن بعد میں شیدا کے نام سے مشہور رہے۔ چنانچہ شرکت کاویانی برلن سے اُن کا جو دیوان شائع ہوا تھا وہ "دیوانِ شیدا" ہی کے نام سے معروف ہے یہ دیوان اب نایاب ہو چلا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو دوبارہ شائع کیا جائے۔

حکیم صاحب کو خدمتِ خلق اور ذوقِ مطالعہ کے سوا کوئی دوسرا شوق نہ تھا۔ ذاتی کتب خانے کے علاوہ خدا بخش لائبریری پٹنہ اور رامپور کا شاہی کتب خانہ بھی اُن کی علمی پیاس بجھانے کے لئے ناکافی تھا۔ ۱۳۳۳ھ میں حکیم صاحب سیر و سیاحت کی غرض سے عراق تشریف لے گئے۔ اس سفر میں بھی اُن کی دلچسپی کی خاص چیزیں اور تحائف صرف کتابیں تحقیں یا طبّی کالجوں، شفا خانوں اور دوا سازی کے کارخانوں کا معائنہ اور سیر تھی۔ اس سیاحت میں حکیم صاحب کے ہمراہیوں میں راقم الحروف کے والد، سیّد حامد بخاری مرحوم مغفور بھی شامل تھے۔

www.bhatkallys.com

حکیم محمود خاں کی طرح اُن کی طبیعت بھی تصوف کی طرف بہت زیادہ مائل تھی۔ اللہ والوں سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے بعض احباب سے فرمایا کہ میں دو سو فقراء اور درویشوں سے مل چکا ہوں، لیکن میری روح نے جس قدر تسلّی اور اطمینانِ قلب پایا ہے وہ مولانا سیّد شاہ محمد عبدالحئی ساکن چاٹگام کے فیوض اور برکات کا ثمر ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ میدانِ کارزار بنا ہوا تھا تو حکیم صاحب نے حضرت شاہ موصوف کی خدمت میں ایک منظوم عریضہ بھیجا تھا۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

اے مسیحائے زماں دردِ دلم را چارہ
باختم تاب و تواں در رنجۂ دردِ لعیں

از تو می پُرسم بفرما، منزلِ سلمیٰ کجا است
یا ز انگشتِ شہادت یا ز چشمِ سرمگیں

چارۂ شک چوں بجویم از تو در شبہائے تار
زانکہ برافروختی از بہرِ ما شمعِ یقیں

چوں ز حالِ من کسے پُرسید بگویم در جواب
از وصالِ یار دُورم بار قیباں ہم نشیں

حکیم صاحب بارہا حضرت شاہ صاحب موصوف سے مشرف مُلاقات کے طالب ہوئے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب حضرت کا مزاج ناساز تھا حکیم صاحب نے حاضرِ خدمت ہونا چاہا لیکن شاہ صاحب کی

www.bhatkallys.com

کی جانب سے حکیم صاحب کو صرف اتنا جواب ملا کہ "میں اچھا ہوں، آپ کے سامنے بہت کام ہے ابھی آپ یہاں آنے کا ارادہ نہ کریں۔" اس پیرروشن ضمیر نے ۱۰؍ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ کو رحلت پائی۔ جب حکیم صاحب کو اطلاع ہوئی تو اس قدر رقت طاری ہوئی کہ روتے روتے گاؤ تکیے پر گر پڑے اور آنسو دے کر گاؤ تکیہ تر ہو گیا۔

حق یوں ہے کہ حکیم صاحب کے اسی اعتراف حق، اہل اللہ سے عقیدت، خلق خدا سے محبت، سخاوت، فیاضی، غربا پروری، شرفا نوازی اور قومی ہمدردی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو سچی قومیت اور ملت پرستی کا سبق پڑھایا۔ ان جذبات سے سرشار ہو کر جب حکیم صاحب سیاست کی طرف متوجہ ہوئے تو اپنے ہم وطنوں کے دل میں آزادی کی سچی روح اور گاندھی جی کو ملک کی ایک نمایاں شخصیت اور کانگریس کو اپنے عہد کی ایک نمائندہ جماعت بنا دیا۔ آپ کو بھی حکومت نے آپ کے خاندانی خطاب حاذق الملک سے نوازا تھا۔ لیکن جب تحریک خلافت رونما ہوئی تو مسلمانوں میں سب سے پہلے آپ نے اپنا خطاب حکومت کو واپس کیا۔ اس کے عوض قوم نے آپ کو مسیح الملک کا خطاب پیش کیا۔ آپ ہمیشہ اسی خطاب سے موسوم ہوتے تھے۔ الغرض جب تک زندہ رہے ملک و قوم کی خدمت اور راہ نمائی کرتے رہے۔ کئی مرتبہ جیل جاتے جاتے رہ گئے۔ بلوۂ عام کے اندیشے سے حکومت وقت اُن کو محبوس کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ حکومت کو اس غلط اقدام سے روکنے میں در پردہ جو شخصیت خاص طور پر کوشاں تھی

www.bhatkallys.com

وہ اُن کے لڑکپن کے ساتھی اور قدیم دوست شمس العلماء مولوی سید احمد، امام جامع مسجد دہلی کی ذات تھی جو اس ضمن میں براہِ راست والیٔ ہند سے جا کر ملے تھے۔

نوابوں اور راجاؤں کے معالجِ خصوصی اور بالخصوص مرحوم نواب رام پور کے طبیبِ خاص اور جلیس ہونے کے باوجود اُن کا آبائی مطب ہمیشہ جاری رہتا۔ حکیم صاحب کے حاضر و غائب لوگ دُور دُور سے علاج کے لئے آتے اور شفایاب ہو کر جاتے۔ صحیح تشخیص کے ساتھ جب مناسب نسخہ اور اس نسخہ کی دوائیں اصلی، وہ بھی اوزان اور اصول کے مطابق تیار نہ کی جائیں تو مریض کا صحت یاب ہونا معلوم! حکیم صاحب نے اس ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ چنانچہ اپنے برادرِ بزرگ حکیم واصل خاں کے آخر زمانۂ حیات میں کہ ۱۹۰۲ء تھا انھوں نے اپنے چند مخلص احباب کے تعاون سے گلی قاسم جان میں ہندوستانی دواخانے کی بنیاد رکھی۔ اس طرح ہندوستان کو جڑی بوٹیوں کی شناخت، دوا سازی اور دوا فروشی کا فن سکھلایا۔

انھوں نے اس دواخانے کے بعد ایک زنانہ مدرسہ طبیہ و شفاخانہ بھی جاری کیا۔ اس کی بدولت طبی دنیا میں عورتوں کی طبی تعلیم اور معالجے کی بنیاد پڑی اور اُن سیکڑوں قیمتی جانوں کو جو نسوانی امراض اور جاہل دائیوں کے ہاتھوں آئے دن ضائع ہوتی تھیں موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا۔ اس مدرسے کا افتتاح سر لوئی ڈین لفٹنٹ گورنر پنجاب اور

www.bhatkallys.com

اُن کی لیڈی نے کیا تھا۔ اسی طرح جس مدرسۂ طبیہ کی داغ بیل اُن کے سب سے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں کے ہاتھوں گلی قاسم جان کے ایک مکان میں پڑی تھی اُسے اتنا فروغ دیا کہ ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ سے قرول باغ، دھلی کی سرزمین میں سنگِ بنیاد رکھوا کر اُسے باقاعدہ ڈگری کالج بنا دیا جس کا ہزاروں روپے سالانہ کا خرچ محض ہندوستانی دواخانے کی آمدنی سے چلتا رہا۔

اِن گوناگوں حالات و واقعات کی وجہ سے شریف خانی منزل میں مقامی اور غیر مقامی مریضوں کے علاوہ عالموں، درویشوں، ادیبوں شاعروں اور لیڈروں کا مجمع رہا کرتا تھا۔ ریاستوں کے نواب اور راجا مختلف ممالک کے سفیر اور سیاح، اربابِ حکومت، مختلف وفود کے ارکان اور خاص دوست احباب اِس دیوان خانے میں تشریف لایا کرتے تھے:

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

ذرا اِس دیوان خانے کا نقشہ ملاحظہ کیجئے۔ افسوس نقشہ کہاں اب تو اس کا نقشِ کہن بھی باقی نہیں رہا۔ کچھ اس دیوان خانے ہی پر موقوف نہیں۔ آپ پورے برصغیر پاک و ہند میں گھوم جائیے آپ کو نہ کوئی دیوان خانہ ملے گا اور نہ کوئی اُن کا دیوانہ۔ دیوان خانے کی جگہ اب جگہ جگہ کلب ہیں جہاں "دیوانہ" کے عوض مغربی تہذیب کے متوالے "عاقل و فرزانہ" صرف راگ و رنگ میں مشغول نظر آئیں گے۔ یقین کیجئے کہ مستقبل

www.bhatkallys.com

قریب میں یہ دیوان خانہ محض ایک لغت بن کر صرف لغات کے صفحات میں مستور نظر آئے گا۔

اس تاریخی دیوان خانے کے سینے پر جدید وضع کی ایک نئی عمارت کھڑی ہے جس میں آج کل حکیم صاحب مرحوم کے صاحبزادے حکیم جمیل احمد خاں صاحب فروکش ہیں۔ وہ بھی اب بوڑھے ہو گئے اور جلن ہاروں میں ہیں۔ یہ نئی دو منزلہ عمارت جس کے دامن میں کبھی حکیم صاحب کا دیوان خانہ تھا شریف منزل کے صدر دروازے سے گزر کر بائیں جانب شمال میں واقع ہے۔ دائیں سمت جنوب میں ایک نہایت وسیع دوہرا دالان ہے جس میں حکیم صاحب کے بعد اُن کے عزیز حکیم محمد احمد خاں اور اُن کے بعد حکیم ظفر احمد خاں صاحب اپنا مطب فرماتے تھے۔ اللہ اللہ یہ دونوں بھی دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ القصہ یہ دیوان خانہ اپنی وسعت میں ایک متوسط درجے کے کمرے سے ذرا بڑا تھا۔ اس میں پندرہ بیس افراد تو بخوبی اور مطب کے وقت تیس چالیس آدمی سما جاتے تھے۔ درو دیوار پر سفیدی، اُس پر روغن کے رنگین حاشیے، جا بجا قدیم قلمی طغرے اور کتبے، اُن کے درمیان مناسب مقامات پر خاندانی بزرگوں کی چند قلمی تصاویر، چھت میں ایک یا دو خوش نما جھاڑ، فانوس، دہلیز میں پائے داؤن کی جگہ مرگ چھالیں اور دروازوں پر کھاروے کے پٹا بیٹی کے پردے، زمین پر دری، دری پر براق سی چاندنی، چاندنی پر دائیں بائیں اور درمیان میں نرم و خوبصورت ایرانی قالینوں کا فرش۔ دونوں طرف

www.bhatkallys.com

دیواروں کے سہارے نرم نرم بڑے گول تکئے، پھول دار غلاف چڑھے ہوئے، بدری کے کام کا حقہ، ایک دو فالتو کلیاں، پاندان، پیک دان قرینے سے رکھے ہوئے، دو تین خدمت گار خدمت کے لئے ہر وقت موجود رہتے تھے۔

حکیم صاحب کے دم سے دیوان خانے کی یہ تاریخی صحبتیں روزانہ شب کو آٹھ بجے کے بعد شروع ہوتیں اور بارہ بجے تک محفل گرم رہتی تھی نواب فیض احمد خاں فیضی۔ شمس العلما سید احمد امام جامع مسجد دہلی اُن کے برادر خورد سید حامد (راقم الحروف کے والد) نواب شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ۔ مولوی عبد الحق مفسر تفسیر حقانی۔ حکیم مولوی جمیل الدین احمد دہلوی۔ حکیم اسد علی خاں مضطرؔ۔ نواب امین الدین خاں والیٔ لوہارو۔ شفاء الملک حکیم رضی الدین خاں عبید الرحمٰن صاحب بیاںؔ۔ مرزا محمد علی خاں علیؔ۔ لالہ جگل کشور وکیل اور لالہ ہزاری مل جوہری یہ وہ نمونۂ روزگار اور یادگار زمانہ چند بزرگ تھے جو اپنی شائستہ گفتگو اور سنجیدہ مذاق سے ایک دوسرے کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوتا، کبھی منطق اور فلسفے پر گفتگو ہوتی۔ کبھی احادیث بیان کی جاتیں، کبھی آیاتِ قرآنی کو تفسیر کی روشنی میں دیکھا جاتا۔ کبھی فقہ کے مسائل سامنے آتے۔ کبھی حضرت صلعم کے عہدِ مبارک اور دورِ خلافت پر نظر جاتی۔ اسلاف کے کارناموں پر تبصرہ ہوتا سلطنتِ مغلیہ کے عروج و زوال کے نقشے آنکھوں کے سامنے کھلتے جن لک

www.bhatkallys.com

کی موجودہ ابتر حالت کو دیکھتے ہوئے وقتی سیاست پر گفتگو ہوتی۔ کبھی طبیہ کالج۔ ہندوستانی دواخانہ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ دھلی کو ترقی دینے کی مختلف تدبیروں اور مشوروں پر غور کیا جاتا۔ اسی دوران میں موسم اور وقت کے لحاظ سے طرح طرح کے ماکولات اور مشروبات، مٹھائیاں، پھل، خشک میوے، چائے یا قہوہ، پان اور حقے کے دور چلتے۔

کبھی میر باقر علی داستان گو خود مجلس میں آتے یا بلوائے جاتے تو ان کی داستان، زبان اور طرز بیان سے لطف اٹھایا جاتا، میر صاحب کو چُنیا بیگم (افیون) سے عشق تھا لہٰذا افیون کی کٹوری بھری مجلس میں اُن کے سامنے رکھی جاتی۔ وہ ایک ہاتھ سے افیون گھولتے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک چُسکی لگاتے۔ جس قدر افیون کا نشہ چڑھتا اُسی قدر اُن کی تیغ زبان کے جوہر کھلتے۔ اور داستان اپنے رنگ و شباب پر آتی۔ سننے والے عش عش کرتے داد دیتے۔ ایک روز کا ذکر سنئے۔ میر باقر علی صاحب کی داستان ہو رہی تھی میر مجلس اور حاضرین محفل سب داستان کے طلسم رنگ و بو میں گم تھے کہ ناگاہ دلّی کا ایک پستہ قد بوڑھا فقیر دونوں آنکھوں سے معذور، آشفتہ حال و مجبور، پریشان گیسو، پارینہ لباس، لکڑی ٹیکتا شریف منزل میں آنکلا۔ اس فقیر کو راقم نے بھی بارہا دیکھا ہے۔ یہ اپنی صدا میں صرف حضرت میر دردؔ رح کی یہ غزل بڑی پُرسوز لَے سے پڑھا کرتا تھا:

تہمت چند اپنے ذمہ دھر چلے   جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے

www.bhatkallys.com

اسی غزل کے اشعار پڑھتا ہوا وہ شریف منزل کے اندرونی پھاٹک پر آن کھڑا ہوا۔ اُس کی درد بھری آواز کا حکیم صاحب کے کانوں میں پہنچنا تھا کہ معاً ایک نشتر آب دار اُن کے دل میں پیوست ہو گیا۔ بے قرار ہو گئے اور ضبطِ نفس کے باوجود حکیم صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اور جب اس عالم کیفیت سے بے خبر گداگر نے یہ شعر پڑھا:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

تو حکیم صاحب پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ تمام رفقائے مجلس اس خیال سے ڈر گئے کہ کہیں حکیم صاحب کو قلب کا کوئی دورہ پڑ جائے فوراً اس کو منع کرایا اور اندر بلوایا۔ حکیم صاحب نے کئی روپے دے کر اُس کو رخصت کر دیا۔

اسی مختصر سی صحبت میں شعرائے مجلس اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجے کے ساتھ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ ہم اس موقع پر اس گھریلو مشاعرے کی دو اہم غزلیں تبرکاً یہاں درج کرتے ہیں جو حکیم اجمل خاں شیدا اور نواب سراج الدین سائل مرحوم کی فرمودہ ہیں:

غزل شیدا

وفا اُس سے جفا مجھ پر، ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی
عدو پر میرے دلبر کا کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

www.bhatkallys.com

ستایا کچھ فلک نے ہے، ستم کچھ آپ کا بھی ہے
مری آنکھوں میں اشکِ خوں بہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

رہیں یہ آرزوئیں یا نکل جائیں برابر ہے
مریضِ عشق سے پوچھو تو غم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تعصب بر طرف مسجد ہو یا ہو کوئی بُت خانہ
رہ دل دار میں جاتا قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

وہ لیلیٰ تھی مگر جذبِ محبت میں ہوئی مجنوں
کتابِ عشق میں شیدا رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

غزل سائل

ملے غیروں سے مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن، جفا جو کا ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

شبِ وعدہ وہ آجائیں، نہ آئیں مجھ کو بلوالیں
عنایت یوں بھی ہے اور یوں بھی، کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے لکھا تھا ہم بہرِ عیادت آنے والے ہیں
عدو ہمرہ ہے، اب سمجھا کہ ہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مسجد ہے یہ مے خانہ، تعجب اس پر آتا ہے
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

www.bhatkallys.com

تجھے نواب بھی کہتے ہیں، شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں ترا سائل کھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

جس طرح عام مشاعروں میں بعض شعراء اپنے اشعار میں ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے ہیں اسی طرح اس دیوان خانے کے مشاعروں میں سائل کی اپنے بڑے بھائی تاباں سے نوک جھونک رہتی تھی۔ سبب یہ تھا کہ تاباں حضرت داغ کے کلام کو بازاری کلام کہتے تھے۔ حکیم صاحب کبھی کبھی یہ لطیف مذاق خود تو نہیں لیکن دوسرے دوستوں کے ذریعہ کرایا کرتے تھے۔ محفل میں کسی ایک صاحب کو اشارہ کر دیا۔ انھوں نے حضرت داغ کے کلام کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے۔ تاباں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے سنتے رہتے بالآخر بھڑک اٹھتے اور جو منہ میں آتا بے دھڑک سناتے۔ حاضرین اُن کی ٹھسالی گالیوں اور ٹکسالی فقروں کا لطف اٹھاتے اور پھر گفتگو کا موضوع بدل جاتا۔

حکیم صاحب کا معمول تھا کہ آٹھویں دسویں تفریح کی غرض سے اپنے مخصوص دوستوں کے ہمراہ یا تو خواجہ قطب صاحب مہرولی جاتے یا اوکھلے پہنچتے گویا ایک دو روز کے لئے یہ دیوان خانہ شاہجہان آباد سے پرانی دلی منتقل ہو جاتا۔ ایک دفعہ جب اس دیوان خانے کی محفل اوکھلے میں منعقد تھی تو حسب معمول اور دوستوں کے علاوہ تاباں اور سائل بھی وہاں موجود تھے۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد محفل مشاعرہ گرم ہوئی۔

www.bhatkallys.com

حکیم صاحب نے سائل صاحب کو اشارہ کیا۔ سائل صاحب نے حکیم صاحب کا مطلب سمجھ کر حضرت داغ کی ایک غزل پڑھنی شروع کی۔ اس پر تاباں برہم ہونے شروع ہوئے۔ سائل صاحب نے اُن کے غصّے کو اور ہوا دی کہنے لگے۔ "بھائی صاحب! گستاخی معاف، شعر گوئی کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ حضرتِ داغ کی نازک خیالی، جذبات آفرینی اور قادر الکلامی کا اندازہ تو اس بات سے ہوسکتا ہے کہ وہ ایک گھنٹے میں پچاس شعر قلم برداشتہ لکھا کرتے تھے۔" یہ سُن کر تاباں بے تاب ہوگئے۔ اور غضب ناک ہوکر بولے۔ "ابے اُس کو اور تجھ کو شعر کہنے اور سمجھنے کی کہاں تمیز؟ تیرے نزدیک یہی ایک معیارِ سخن ہے جو کوئی مصرع کہہ۔" سائل صاحب تو جیسے اسی بات پر تُلے بیٹھے تھے جھٹ ایک مصرع پڑھا۔ تاباں نے دوسرے ہی لمحے جواب میں یہ شعر پڑھا:

عدو میرا نہ تو میرا نہ چرخ فتنہ جو میرا
شفق بن کر چڑھا ہے چرخ کے سر پر لہو میرا

اس شعر کا سُننا تھا کہ ساری محفل پھڑک اُٹھی۔ حکیم صاحب نے جوشِ مسرت سے تاباں کو اپنے گلے لگا لیا اور سائل بے چارے بغلیں جھانکنے لگے۔ اُس وقت تاباں نے جس قدر بے نقط اُن کو سُنائیں وہ سب اُن کو سر جھکا کر سُننا پڑیں۔ حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ حکیم صاحب کو ایک اور دلچسپ چھیڑ سوجھی۔ حکیم صاحب

www.bhatkallys.com

کو یہ معلوم تھا کہ سائل اور تاباں دونوں توام پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اِس واقعہ کو ایک طبی سوال کی صورت میں خاموشی کے ساتھ سائل صاحب کو بتا دیا اور فرمایا کہ وہ اُسے تاباں صاحب کے سامنے پیش کریں۔ سوال یہ تھا کہ طبی لحاظ سے دو توام بچوں میں اوّل پیدا ہونے والے بچے کو بڑا سمجھا جائے گا یا اُس کو جو بعد میں پیدا ہوا۔ چنانچہ سائل صاحب نے اُسی دن دوسری نشست میں موقع پا کر تاباں کے سامنے حکیم صاحب سے عرض کیا "حکیم صاحب میں کئی روز سے ایک طبی مسئلے میں اُلجھا ہوا ہوں۔ اگر آپ نے میرے خیال پر صاد کر دیا تو اُس سے نہ صرف یہ کہ ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوگا بلکہ میری زندگی بھی ایک نئے انقلاب سے آشنا ہوگی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ سے اپنے بڑے بھائی صاحب کو باپ کی جگہ سمجھتا ہوں اور اُن کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن یہ حقیقت واضح ہونے کے بعد کہ دو توام بچوں میں جو بعد میں پیدا ہوا عمر کے لحاظ سے وہی بزرگ ہے کیونکہ انعقاد اُسی کا پہلے ہوا تھا۔ لہٰذا آج سے بھائی صاحب کو میرا احترام کرنا ہوگا۔"

تاباں کو اس چھیڑ کا کوئی معقول جواب تو بن نہ پڑا، لام کاف پر اُتر آئے اہلِ محفل اور بالخصوص حکیم صاحب منہ پھیر پھیر کر ہنستے رہے۔ سائل صاحب کی اُس وقت بن آئی تھی۔ تاباں کو بھڑکانے کے لیے اُنھوں نے مزید نمک پاشی کی۔ "دیکھیے بھائی صاحب! اب آپ کو مجھے گالیاں دینے کا کوئی جواز حاصل نہیں رہا۔ ہاں ہٹ دھرمی کی اور بات ہے مگر یہ تو ایک طبی مسئلہ اور معاملے کا سوال ہے۔ آپ کو لازم ہے کہ اب آپ میری طرح میرا

www.bhatkallys.com

احترام کریں"۔ لیکن غریب تابانؔ کو کیا معلوم تھا کہ اس مرتبہ بھی اُن کی قسمت میں شکست ہی لکھی ہے۔ آخر میں جب حکیم صاحب نے اپنا فیصلہ دیا تو وہ تاباںؔ کے حق میں تھا۔

اِن احباب کے علاوہ جو مستقل طور پر حکیم صاحب کے دیوان خانے میں آتے تھے دوسرے وقتاً فوقتاً آنے والوں میں نواب حامد علی خاں والئ رام پور تھے جو دہلی میں حکیم صاحب ہی کے ہاں قیام کرتے تھے۔ حکیم صاحب ہی کی خاطر سے نواب صاحب نے نواب محسن الملک کو علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے پچاس ہزار کا گراں قدر عطیہ دیا۔ مرحوم سر آغا خاں بھی جب اسی غرض سے حکیم صاحب کے پاس دہلی آئے تو اُن کو بھی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

انگریزوں کے مشہور پادری مسٹر سی، ایف اینڈروز نے جو حکیم صاحب کی خدمت حاضر ہوتے رہتے تھے، حکیم صاحب کے مطب کی ایک نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "میری پرورش اینگلو انڈین لوگوں میں ہوئی تھی اور میرے دل ودماغ میں یہ خیال ٹھونس دیا گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان مذہب اور ذات پات کی وجہ سے ایک ایسی بڑی خلیج حائل ہے جو کسی طرح پُر نہیں ہو سکتی لیکن لندن سے دہلی آنے پر جب میں نے حکیم صاحب کے روزانہ مطب کا نقشہ دیکھا تو کیا عرض کروں کہ میرا یہ اعتقاد بالکل پاش پاش ہو گیا۔"

اسی طرح ایک مرتبہ لارڈ ہارڈنگ کے پرائیویٹ سکریٹری کو حکیم صاحب

www.bhatkallys.com

کے مطب میں آنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے بھی جب یہ دلکش منظر دیکھا تو لارڈ ہارڈنگ سے جاکر کہا۔ "حکیم صاحب تو بلا شبہ "میگنٹ آف انڈیا ہیں" اسمٰعیل خاں صاحب سفیر کابل نے بھی اکثر و بیشتر اسی دیوان خانہ میں قیام کیا اور زنانہ شفاخانے کے لئے کئی ہزار روپے عنایت کئے۔ عبد العلی ہروی مجتہد بھی اسی دیوان خانے میں آکر ٹھہرتے اور لکچر دیتے تھے۔ علی برادران ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور قائد اعظم نے بھی ابتدا میں اپنے سیاسی جلسوں اور تقاریر کے لئے اسی دیوان خانے کو منتخب کیا تھا۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ کے بموجب ناگاہ وہ دن اور ساعت بھی آپہنچی جب اُس تاریخی دیوان کی شخصیت نے ۲۵ دسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح کو بمبئی سے دہلی آکر آخری مطب فرمایا۔ اُسی رات رام پور روانہ ہو گئے ۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء کو کہ شب تمام ہو رہی تھی اچانک قلب کا دورہ پڑا۔ ہر چند کافی دوڑ دھوپ ہوئی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد خدمت و حکمت کا یہ آخری چراغ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ میّت دہلی لائی گئی۔ جامع مسجد میں اُن کے بچپن کے رفیق سید احمد امام مرحوم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی تمام افراد نے کندھے دیئے۔ جنازہ حکیم صاحب کے خاندانی قبرستان درگاہ حضرت سید حسن رسول نما پہنچا تو گاندھی کے ایک مرید نے تدفین میں یہ رخنہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔ کہنے لگا کہ "حکیم صاحب کو کھدّر کے کفن میں دفن کرنا چاہیئے" دلّی والے اس سے پہلے مولوی عبد الاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی کی میّت کی

www.bhatkallys.com

رسوائی دیکھ چکے تھے یہ سُن کر پریشان ہوئے اور دِل میں کہنے لگے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے کہ اُسی وقت حکیم صاحب کے ایک قریبی عزیز حکیم فاضل خاں مرحوم انتہائی غیظ کے عالم میں آگے بڑھے اور اُس معترض کو اِن الفاظ سے للکارا۔ "مردُود! ہمارے روبرو تیری اتنی مجال، خیریت چاہتا ہے تو ابھی یہاں سے غارت ہو" یہ کہتے ہوئے اس کے منہ پر ایک ایسا طمانچہ رسید کیا کہ اُس کا منہ پھر گیا۔

سارے ہندوستان نے حکیم صاحب کا ماتم کیا۔ لارڈ ہارڈنگ امیر کابل، شاہ مصر، سلطان مسقط اور متعدد والیانِ ریاست نے ہمدردی کے پیغامات ارسال کئے۔ یہاں تک کہ یورپ، امریکہ اور افریقہ والوں نے بھی اظہارِ تعزیت کیا۔ وقت اور زمانہ بڑے سے بڑے زخم کو مندمل کر دیتا ہے لیکن بعض واقعات ناقابلِ فراموش ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں تدفین کے وقت جو ناگوار واقعہ پیش آیا وہ بہر نوع گزر گیا لیکن ۱۹۴۷ء میں اُسی تربت کی کیا دُرگت بنی۔ حکیم صاحب کا وہ نشانِ قبر کہاں ہے؟ اُس تودۂ خاک کا کیا حشر ہوا؟ یہ بھارت کے اُن آزاد سپوتوں سے پوچھئے جو حکیم صاحب کے صندوقچۂ خاص سے خاکِ شفا لے کر چاٹتے اور زندگی پاتے تھے ؎

تُربتِ کہنہ کے مٹ جانے میں بھی معنی ہیں
خاکِ مرحوم ملی جا کے گُلِ عالم میں

جی چاہتا ہے کہ جس بلند نام سے اس مضمون کا آغاز ہوا اختتام

www.bhatkallys.com

بھی اُسی کے بلند کلام پر ہونا چاہیئے۔ حکیم محمد اجمل خاں شیدا کا یہ شعر پڑھئے اور سر دُھنئے:

آں طبیبے کہ شفا یافت جہاں از سُخنش
حال دردِ شبِ ہجراں کہ رساند زمنش

---

www.bhatkallys.com

دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں

قدرت کی ستم ظریفی کہیے یا زمانے کا انقلاب اور بے ثباتی کہ دلّی ہم سے بچھڑ گئی لیکن اس کی یاد بھلائے نہیں بھولتی۔ اُس کا خیال انگ انگ میں بسا ہوا ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں دلّی سے کالے کوسوں دُور ہوتے ہوئے بھی اکثر شب کی تنہائی میں جب اُس خاکِ پاک کا تصور قائم ہوتا ہے تو دلِ ناصبور تڑپ اُٹھتا ہے، کلیجہ ہے کہ منہ کو آتا ہے اور آنکھوں میں آنسو اُمنڈ پڑتے ہیں اور یوں بیٹھے بیٹھے ہمیں خدا جانے کیا کیا یاد آتا ہے۔

ابھی ابھی حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے کا تذکرہ تھا۔ تذکرہ کہیے یا آج سے پچاس سال قبل کی تہذیب کی ایک لطیف اور دلدوز داستان جسے کہیں کہیں سے بیان کیا گیا تھا۔ حکیم صاحب کی باقیات اور ہماری یادداشت میں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ یار زندہ صحبت باقی کبھی پھر سنیے گا۔ دلّی کا تو ذرّہ ذرّہ ہزار داستان ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی داستان شروع کی جائے اور کسے چھوڑا جائے۔

دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں فیضی بھی حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے کی ایک کڑی ہے۔ تقسیم ہندوستان سے قبل آل انڈیا ریڈیو دہلی کی فرمائش اور میری گزارش پر میرے محترم تایا شمس العلما

www.bhatkallys.com

سید احمد مرحوم، امام جامع مسجد دہلی نے اسے تحریر فرمایا تھا۔ وہ بقول خود اس دیوان خانے کے مشہور نورتنوں میں آخری رتن تھے۔ ہر چند کہ امام صاحب مرحوم نے اسے بہت ہی روا روی میں نہایت مختصر اور تشنہ لکھوایا یوں کہیے کہ انھوں نے اس دیوان خانہ کی ہمیں صرف ایک ہی جھلک دکھائی اور ایک جھلک سے کبھی دل سیر نہیں ہوتا۔ لیکن اس آخری رتن کے مٹی میں مل جانے کے بعد یہ ایک جھلک بھی ہمارے لئے ایک دل کش یادگار ہے۔ اگر امام صاحب کے ہاتھوں اس دیوان خانے کے یہ نقوش محفوظ نہ ہوتے اور مجھ تک نہ پہنچتے تو یہ تھوڑا سا رنگ جو اس وقت راقم اس خاکے میں بھر رہا ہے کہاں سے لاتا۔ اس تبرک کو پیش کرنے سے قبل اجازت دیجئے کہ ان نورتنوں کے متعلق جو یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، اور اب ہم بھی جانے والے ہیں، تھوڑا بہت جو کچھ مجھے معلوم ہے آپ کے سامنے پیش کر دوں اور ان کے اس یادگار خاکے کو ان اوراق میں محفوظ کر دوں۔

سید احمد مرحوم کا سلسلۂ نسب[1] آٹھویں پشت میں سید عبدالغفور شاہ بخاری (اول) مورث اعلیٰ سے ملتا ہے۔ امام موصوف سید جلال الدین عرف سید جلال بخاری کی اولاد سے ہیں جو اپنے وقت کے مشہور اولیا تھے۔

---

[1] اس خاندان کا ایک قلمی شجرہ بخطِ نسخ، خامہ سید حامد بخاری، جو علماء و حکماء اور دیگر اکابر و مشاہیر وقت کے دستخطوں اور مہروں سے مزین ہے، ہمارے نیشنل میوزیم کراچی کے نوادر میں موجود ہے۔ ہم نے اس شجرے کو ضروری اضافے کے ساتھ اس مضمون کے آخر میں درج کر دیا ہے۔

www.bhatkallys.com

۱۶۵۶ء میں جب جامع مسجد، دہلی بن کر تیار ہو گئی تو شاہ جہاں بادشاہ نے سید عبد الغفور شاہ موصوف کے زہد و تقویٰ کا شہرہ سُن کر شاہ بخارا کی معرفت طلب کیا اور منصب امامت جامع مسجد دہلی پر ممتاز فرمایا۔ بادشاہ نے جامع مسجد میں پہلی نماز، دوگانۂ عید الفطر، امام صاحب موصوف ہی کی اقتدا سے ادا کی۔ پھر اپنے دست خاص سے خلعت بیش بہا، خطاب امام السلطان اور جاگیر شاہی عطا فرمائی۔ امام موصوف کو تمام علماء میں تقدم اور تکلم میں خطاب خاص سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ شاہی مخصوص سبز لباس کے ساتھ وزراء اور اُمراء کی طرح باریابی ہوتی تھی۔

عالمگیر بادشاہ نے اپنے عہد میں امام موصوف کے سابقہ اعزاز میں مزید اضافہ کیا کہ اپنی تخت نشینی اور تاج پوشی کی رسم اُنہی کے ذریعے ادا کرائی۔ یہ دستور بہادر شاہ بادشاہ کے وقت تک برابر قائم رہا۔ چنانچہ بہادر شاہ بادشاہ کی رسم تاج پوشی، امام وقت، میر احمد علی (راقم الحروف کے جدّ امجد) کے ہاتھوں ادا ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آزادی کے بعد سید محمد (اوّل) خلف میر احمد علی (سر سید احمد دہلوی کے حقیقی خالہ زاد بھائی) امام ہوئے۔ اُن کی وفات کے بعد سید احمد مرحوم خلف سید محمد (اوّل) کو امامت حاصل ہوئی۔ راقم کے والد ماجد سید حامد بخاری (برادر خورد سید احمد) اُن کی نیابت کرتے تھے۔ منصب امامت کا یہ شرف اس وقت بھی کہ تین سو برس سے زائد گزر چکے ہیں اسی خاندان میں متوارث چلا آتا ہے۔ چنانچہ مولوی سید حمید ولد سید احمد مرحوم

www.bhatkallys.com

امام وقت ہیں اور اُن کے فرزند سید عبداللہ بخاری اُن کی نیابت کرتے ہیں۔
سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد حکومت انگریزی اور برِ صغیر
پاک و ہند کے کئی والیانِ ریاست مثلاً امیر حبیب اللہ خاں، والیِ افغانستان،
نظام حیدر آباد، دکن، نواب بھوپال، نواب رام پور، نواب بہاول پور، نواب
ٹونک، نواب مالیر کوٹلہ اور نواب خیر پور نے حسبِ دستور شاہانِ سلف اس
خاندان کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا۔

جہاں تک اس خاندان کے مندرجہ بالا تاریخی واقعات کا تعلق ہے،
اُن کا یہ مختصر سا اقتباس اِن کتابوں سے ماخوذ ہے:

(۱) آثار الصنادید، مصنفہ سر سید احمد خاں، مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۴۷ء
(۲) حیاتِ جاوید، مصنفہ مولانا الطاف حسین حالیؔ، مطبوعہ رحمانی پریس کانپور، ۱۹۰۲ء
(۳) یادگارِ دہلی، مصنفہ سید احمد ولی اللٰہی نبیرہ مولانا شاہ رفیع الدین رح مطبوعہ ۱۹۰۲ء
(۴) فرہنگ آصفیہ (جلد اول)، مؤلفہ خاں صاحب منشی سید احمد دہلوی مطبوعہ ۱۹۱۸ء
(۵) واقعات دار الحکومت دہلی (جلد دوم) مصنفہ مولوی بشیر الدین احمد خلف
ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی، مطبوعہ شمسی مشین پریس، آگرہ ۱۹۱۹ء
(۶) امپیریل کورونیشن دربار (انگریزی) مطبوعہ ۱۹۱۱ء

سید احمد مرحوم، جامع مسجد دہلی کے صرف امام ہی نہ تھے بلکہ وہ اپنی
زندگی میں اپنے مذہب و ملت کے ایک سچے بہی خواہ اور بے لوث خادم
بھی تھے۔ امامت کے فرائض اور جامع مسجد کے نظم و نسق کے علاوہ قومی
اور ملّی جو خدمات بھی اُن سے بن پڑیں آخر دم تک سرانجام دیتے رہے۔

www.bhatkallys.com

انھوں نے اپنے پس ماندگان کا (جن میں اُن کی صلبی اولاد بھی شامل ہے) ایک خاصا بڑا اثاثہ اپنے بعد چھوڑا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ادبی دنیا میں انھوں نے اپنی کوئی علمی یادگار بشکلِ تالیف و تصنیف نہیں چھوڑی۔ حالانکہ اُن کے والد مرحوم اور اُن کے ذاتی کتب خانے میں مختلف علوم و فنون پر اُردو، فارسی اور عربی کے کئی سو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے، قدیم اخبارات و رسائل، مشاہیر اور اکابر کے خطوط اور دیگر قلمی مخطوطات کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود تھا۔ اپنے زمانۂ حیات میں از راہ شفقت چند چیزیں انھوں نے مجھے عنایت کی تھیں اور باقی مولوی سید حمید صاحب اور سید رشید احمد صاحب بخاری اُن کے فرزندان گرامی کو ملیں۔ رشید احمد صاحب بخاری کو جو چیزیں حاصل ہوئیں وہ ۱۹۴۷ء میں جب اُنھیں اپنی ڈپٹی کلکٹری سے دست کش ہو کر ڈیرہ دون سے پاکستان آنا پڑا اُن کی غیبت میں برباد ہوئیں البتہ سید حمید صاحب کے پاس کچھ چیزیں شاید اب بھی موجود ہیں۔

اس خاندان کے بزرگانِ سلف نے تالیف و تصنیف میں کچھ حصہ لیا یا نہیں اس کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں۔ اگر اُن کی کوئی علمی یادگار ہوتی تو ہم کو اُس کا علم ضرور ہوتا۔ جو کچھ ہمارے ذاتی مشاہدے میں آیا وہ صرف اس قدر ہے کہ زمانۂ قدیم میں جب فنِ طباعت محدود تھا تو جویانِ علم و فن، اساتذۂ قدیم اور علماء وقت کے افکار اُن کے قلمی نسخوں سے یا خوش نویسوں سے نقل کرا لیتے تھے یا خود لکھ لیتے تھے۔ اسی طرح امام صاحب کے والد

www.bhatkallys.com

سید محمد (اوّل) کو بھی یہ شوق تھا، چنانچہ اُن کے قلمِ خاص کے نقل کردہ دو رسالے، "رسالہ وحدت الوجود" مصنفہ حضرت محمد اسمٰعیل شہید دہلوی (تاریخ نقل ۱۸۵۲ء) اور شرح حزب البحر (تاریخ نقل ۱۸۶۶ء) راقم کے پاس اُن کی یادگار موجود ہے۔ اِن رسالوں کا متن عربی اور فارسی زبانوں پر مشتمل ہے۔ مرحوم کے پاس نادر کتابوں کا ذخیرہ ہونا اور مفید و قیمتی نسخوں کو اس طرح نقل کر کے محفوظ کرنا اُن کے مذہبی رجحان اور علمی ذوقِ مطالعہ کی شہادت دیتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اوقاتِ فرصت میں اُن کا محبوب مشغلہ کتب بینی اور کتب نویسی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سید محمد ہی کا فیضانِ علم تھا کہ اُن کے زمانۂ حیات ہی میں اُن کے خلفِ اکبر سید محمود (اوّل) نے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد جب اپنے باپ کے کتب خانے سے استفادہ کیا تو صاحبِ تالیف و تصنیف ہو گئے۔ سید محمود کا تالیف و تصنیف کردہ ایک رسالہ "منتہی العروض اور مثنوی تحفۃ الشعراء" ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس پر مولانا حالی مرحوم نے ایک مختصر تقریظ بھی تحریر فرمائی تھی۔ یہ کتاب علوم السنۂ شرقیہ کے طلبہ کے واسطے پنجاب یونیورسٹی کے کورس میں داخل تھی۔ اس کتاب کا نسخۂ اوّل بھی میرے پاس موجود ہے۔ افسوس اس جوہرِ قابل نے اپنے والد کی زندگی میں حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔

سید محمد مرحوم کی طرح سید احمد مرحوم کے فرزند سید حمید صاحب کی

www.bhatkallys.com

بھی ایک تالیف "فلسفۂ تعلیم الاسلام" ۱۹۳۲ء میں دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ رشید احمد صاحب بخاری نہایت اعلیٰ علمی و ادبی ذوق رکھتے ہیں لیکن تالیف و تصنیف کی طرف رغبت نہیں رکھتے۔ اسی طرح سید محمد کے خلف سوم سید حامد بخاری مرحوم کی اولاد میں راقم الحروف ۱۹۳۰ء سے اس ادبی سودے میں مبتلا ہے۔

راقم نے امام صاحب موصوف کی غیر مطبوعہ تحریروں میں "یورپ کا سفرنامہ" جو انھوں نے دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں اپنے سفر یورپ کی یادگار میں لکھا تھا (یہ بھی تلف ہو گیا) اور اس گھریلو روزنامچے کی مختلف یادداشتوں کو جنھیں وہ آخر وقت تک بالالتزام لکھتے رہے، دیکھا ہے۔ ان مسودات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اُن کو امامت کے پنج وقتہ فرائض اور ملک و ملت کی پیہم خدمات سے ذرا بھی وقت اور فرصت ملتی اور تالیف و تصنیف کی طرف متوجہ ہوتے تو یقیناً صنفِ ادب میں اُن کی کوئی نہ کوئی یادگار ضرور ہوتی۔

امام صاحب کو اُردو اور فارسی کے مشہور شعراء کے اکثر اشعار یاد تھے۔ وہ ادبی مجالس اور خاص خاص مشاعروں میں بھی کبھی کبھی شرکت کیا کرتے تھے۔ وہ میل ملاقات اور علم مجلسی میں اس درجے یگانہ تھے کہ جس بیگانہ سے ایک بار ملاقات ہو جاتی اُسے اپنا بنا لیتے۔ جس محفل میں جا بیٹھتے اپنی شائستہ اور شگفتہ باتوں سے پوری مجلس کو اپنی طرف متوجہ اور گرویدہ کر لیتے۔ مخصوص احباب میں سے جو گھر پر آتا اور موج میں ہوتے تو بڑی دیر تک مختلف دلچسپ موضوعات پر گفتگو کرتے۔ بعض اوقات زندہ و مرحوم اکابر

www.bhatkallys.com

کے تاریخی حالات اور واقعات اس طرح بیان کرتے گویا اُن کے مخاطب کے سامنے تاریخ کا کوئی باب کھلا ہوا ہو۔

الغرض علم و ادب کے بارے میں اُن کا یہ بالائی شوق کبھی شعلۂ جوالہ نہ بن سکا لیکن دل میں چنگاری کی طرح سلگتا اور دہکتا رہا۔ البتہ ملک و ملت کی خدمت کا یہ جذبہ اُن کو اسلامی درس گاہوں، قومی یونیورسٹیوں، ملّی اداروں اور تاریخی دیوان خانوں میں لے گیا جہاں انھوں نے حسبِ مقدور نمایاں خدمات انجام دیں۔ اِن اِداروں اور انجمنوں سے بحیثیت رکن وابستہ رہ کر اور علیٰحدہ طور پر بھی خدمتِ خلق کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں اُنھوں نے مسلمانوں کی وقت بے وقت مدد یا رہنمائی نہ کی ہو۔ امام صاحب کی شخصیت کے متعلق ہم نے یہاں صرف چند اشارات سے کام لیا ہے اِن محدود صفحات میں امام صاحب کے سوانح حیات قلم بند کرنا محال ہے البتہ ہماری "تاریخ جامع مسجد دہلی"، میں جو اس وقت زیر ترتیب ہے آپ اُن کے مفصّل حالات پڑھ سکیں گے۔

اس ہمدردِ قوم، بزرگ شخصیت نے ۹ اور ۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب داعیٔ اجل کو ایسے وقت لبیک کہا جب ۱۸۵۷ء کے بعد دِلّی کو از سر نو خون میں غسل دیا جارہا تھا۔ شب و روز کا مسلسل کرفیو آرڈر کبھی کبھی ایک یا دو گھنٹے کے لئے شاید اس واسطے ملتوی ہوتا تھا کہ دِلّی والے اس قلیل فرصت میں مرحوم دِلّی کی تباہی و بربادی کے وہ دردناک اور روح فرسا مناظر جن کو دِلّی کے بزرگ ستاروں اور سوگواروں نے غدر کے بعد مختلف داستانوں

www.bhatkallys.com

کے روپ میں لکھا تھا، اُن کا ایک جیتا جاگتا نمونہ اب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ دیکھو! کبھی یہاں غنچہ تھا اور یہاں گُل تھا۔ ہائے کیا تھا اور کیا ہو گیا۔

رات کی تاریکی میں امام صاحب کے جسدِ خاکی کو غسل دے کر اور کفن پہنا کر تیار کیا گیا تاکہ دوسرے دن جیسے ہی کرفیو مُلتوی ہو اُسے اوّل منزل کیا جائے۔ نمازِ عصر سے ذرا قبل کچھ دیر کے لئے کرفیو ٹوٹا۔ بقول مولوی نذیر احمد دہلوی:

"اِدھر آفتاب کا جنازہ کفنِ خون آلودہ شفق پہنا کر تیار کر چکے تھے کہ قبرِ مغرب میں اُتاریں" اُدھر امام صاحب کے جنازے کو اُن کے دو تین گھر والے اور گنتی کے وہ چند عزیز اور اہلِ محلہ جو انتقال خبر پا کر کسی نہ کسی طرح جمع ہو گئے تھے اٹھا کر باہر نکلے تاکہ جامع مسجد کے شمال مغربی گوشے میں احاطۂ باغ کے اندر جو اُن کا قدیم اور آبائی قبرستان ہے اُنہی کے بنوائے ہوئے سردابۂ قبر میں اُتاریں۔ "دہلی جیسا شہر، شام کا وقت اور جامع مسجد کا مقام" اگر امن و امان ہوتا تو اس وقت کھوے سے کھوا چھلتا، سیکڑوں کندھا دیتے اور ہزاروں نمازِ جنازہ پڑھتے مگر راقم الحروف اُردو بازار میں "کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا کہ جہاں تک نظر کام کرتی ہے آدم زاد کا پتا نہیں۔" کرفیو ملتوی ہونے کے بعد بلوائیوں کے ڈر سے "لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو بیٹھے تھے" راقم بھی ہکا بکا سناٹے میں کھڑا تھا" کہ کسی عزیز نے آہستہ سے کہا "بھیا! کرفیو کا وقت قریب ہے"، اور

www.bhatkallys.com

شمالی دروازہ ویسے تو کچھ دور نہیں لیکن اس وقت تو بہت ہی دور معلوم ہوتا ہے، جو ہونا تھا سو ہو چکا اور جو تقدیر کا لکھا ہے سو ہو کر رہے گا۔ چلو، آگے بڑھو۔"

چنانچہ چند عزیزوں کی یہ مختصر سی جماعت جنوبی دروازے سے جامع مسجد میں داخل ہوئی جو اُس وقت مظلوم عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں سے پٹی پڑی تھی۔ شاید قدرت کو بھی منظور تھا کہ امام جی کے جنازے کی نماز میں صرف وہی غریب اور مظلوم شریک ہوں جن کی وہ اپنی زندگی میں کبھی خدمت کیا کرتے تھے۔ اُن کے صاحبزادے سید حمید امام نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ نماز کے بعد یہ میت شمالی دروازے کی سیڑھیوں سے اُتر کر مسجد کے زیرِ سایہ باغیچہ قبرستان میں پہنچی۔ وہاں امام صاحب کے دوسرے مرحوم اقربا پھولوں کی آغوش اور درختوں کی گھنی چھاؤں میں سو رہے تھے اور اپنی زبانِ حال سے شاید یہ کہہ رہے تھے "بیٹا! وہ ہماری رہی سہی دلی بھی مٹ گئی اور تمہارا کام بھی اب ختم ہوا۔ آؤ! اب ہمارے پاس آجاؤ اور آرام کرو۔" امام صاحب کو ان کے بزرگوں کی آغوش میں پہنچا دیا گیا۔ اب وہ خوابِ عدم میں مصروف ہیں۔ میرے اللہ! کیسی میٹھی نیند سو رہے ہیں!

ابھی فاتحہ سے پوری طرح فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ کرفیو کی بھیانک آواز گونجنے لگی۔ دل سہم گئے۔ اسی راہ سے لشتم پشتم واپس ہوئے۔ گھر والوں نے زندہ سلامت پا کر عافیت کا سانس لیا۔ (راقم الحروف)

www.bhatkallys.com

۱۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان آیا تو ایک جلسے میں شہید ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا امام صاحب بھی شہید ہو گئے؟" وہ پُر آشوب گھڑی اور غمناک ساعت گزر گئی لیکن اُس کا روح فرسا خیال اور امام صاحب کی یاد ایسی نہیں جو جیتے جی دِل سے محو ہو سکے۔

صاحب دیوان خانہ، نواب فیض احمد خاں، فیضی نواب محمد نجف خاں صاحب رئیس کرنال کے فرزند اور نواب احمد علی خاں رئیس اعظم کرنال کے حقیقی بھانجے تھے۔ نواب محمد نجف خاں نے بمقتضائے وقت سرکار انگریزی کی ملازمت اختیار کی۔ ۳۵ سال تحصیل دار اور ڈپٹی کلکٹر رہے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا ساتھ دیا، جاگیر پائی۔ کچھ مدت ریاست ٹونک میں کونسل کے ممبر اور حاکم اپیل بھی رہے۔ ٹونک سے دِلی آئے۔ چند ماہ بعد ۱۵ جون ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ سید محبوب علی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ یہ سیّد محبوب علیؒ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے نیچے ایک گلی "چھتہ شیخ منگلو" کے نام سے موسوم ہے۔ معلوم نہیں یہ شیخ منگلو کون بزرگ تھے۔ اسی چھتے میں نواب فیض احمد خاں مذکور کا وسیع اور شاندار مکان ہے جس میں دیوان خانے کی محفل آراستہ ہوتی تھی۔ نواب صاحب کے مکان سے ذرا آگے اسی گلی میں سید محبوب علی کی تعمیر کردہ ایک مسجد ابھی تک سلامت ہے۔ اس مسجد میں حافظ محمد سلیمان نجیب آبادی کو قرآن پاک کا درس دیا کرتے تھے۔ راقم نے فارسی ادب میں ابتداء میں اپنی

www.bhatkallys.com

کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔

دِلّی کے قحط الرجال میں نواب صاحب کا دم بڑا غنیمت تھا۔ روئے سارے شہر میں آپ ایک مشہور و معروف شخصیت تھے۔ علمیت، شرافت، امارت، تہذیب و اخلاق، ہمدردی و ایثار ہر اعتبار سے ایک نمونہ روزگار تھے، نواب صاحب کی اصابت رائے کا ہر کس و ناکس قائل تھا۔ اُن کا مشورہ نہایت معقول ہوتا تھا۔ بقول سید احمد امام "حکیم اجمل خاں مرحوم تو اُن کی رائے کے بغیر تنکا نہیں توڑتے تھے"۔ حقیقت یہ ہے کہ شہر کی کوئی انجمن یا ادارہ ایسا نہ تھا جس کے آپ رکن اور معاون نہ رہے ہوں۔ ایک مدت دراز تک آپ منتظمہ کمیٹی جامع مسجد اور مسجد فتح پوری دہلی کے رکن رہے۔ اسی طرح انجمن موید الاسلام کے بھی آپ ممبر تھے۔ جس طرح شریف منزل، حکیم اجمل خاں کا بیک وقت دیوان خانہ اور سیاست گاہ تھی اسی طرح نواب صاحب کی اس رہائش گاہ میں اکثر و بیشتر سیاسی و قومی مشورے ہوتے تھے۔ خدمتِ خلق کے باوجود نواب صاحب کو کبھی لیڈری کا شوق نہیں ہوا۔ دُور اندیش تھے، اس لئے حکام وقت سے ہمیشہ دُور ہی دُور رہے۔ کبھی اُن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکن اپنے اس عمل کو انھوں نے اپنے دوست حکیم اجمل خاں اور سید احمد امام کے حق میں کبھی بہتر نہیں سمجھا۔ نواب صاحب کو حکیم صاحب کی سیاست سے شدید اختلاف تھا لیکن یہ اختلاف اُن کے باہمی تعلقات میں کبھی حارج نہ ہوا بلکہ دیکھا جائے تو حکیم اجمل خاں کو

www.bhatkallys.com

اپنی شریف منزل اور دیوان خانے میں اپنے گوناگوں کثرتِ افکار سے دماغی سکون کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ وہ بھی کام سے چور چور ہو کر نواب صاحب کے دیوان خانے ہی میں آکر دم لیا کرتے تھے۔ خلوتیانِ خاص کے اس جلسے میں ان کو چند گھنٹوں کے لیے خلقت کی یورش سے بھی پناہ مل جاتی تھی۔

نواب صاحب کا مزاج نہایت نازک اور درویشانہ تھا۔ چونکہ طبیعت تصوف کی طرف مائل تھی اس لئے اہل اللہ سے حسنِ ارادت اور عقیدت خاص رکھتے تھے۔ حکیم اجمل خاں نے اپنے عنفوانِ شباب میں حضرت میاں منوّر علی شاہ چشتی نظامی سے بیعت کی تھی۔ نواب صاحب بھی انہی بزرگ کے مرید اور نظر یافتہ تھے۔ یہ بزرگ دہلی اور نواحِ دہلی میں بہت مشہور اور مرجعِ خاص و عام تھے۔ شاہ صاحب کی وفات کے بعد نواب صاحب ہر سال اُن کا عرس اور عام دعوتِ فاتحہ کیا کرتے تھے۔

نواب صاحب کو ہم نے اُن کے عالمِ پیری میں بارہا دیکھا اور کتنی ہی بار اپنے والد سید حامد بخاری کے ہمراہ اُن کے دیوان خانے میں آنے والے بزرگوں کی ہم نشینی کا شرف پایا۔ امام صاحب نے نواب صاحب کے دیوان خانے کی جو تصویر کھینچی ہے اُس میں اُنھوں نے کسی اصحاب کا جو اِس دیوان خانے میں آیا کرتے تھے بہ نظرِ اختصار اور مصلحتِ وقت ذکر نہیں فرمایا مثلاً والد مرحوم روزانہ بلا ناغہ وہاں جاتے تھے۔

www.bhatkallys.com

بعض اوقات میری والدہ ماجدہ اشرف بیگم صاحب جب بیمار اور صاحب فراش ہوتی تھیں تو والد صاحب کی عدم موجودگی پر بڑی کڑھتیں اور ان سے کبیدہ خاطر ہو جاتیں تھیں۔

والد مرحوم کے علاوہ منشی محمد یوسف، مولوی محمد ایوب، بیخود دہلوی، پیرزادہ محمد حسین، نواب ابوالحسن خاں، شیخ عزیز الدین پراچہ اور ہمارے مشہور مقرر مولینا احتشام الحق کے برادر خورد مولوی عزیز الحق صاحب بھی اس مجلس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ منشی محمد یوسف مرحوم تو نواب صاحب سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ معمولی پڑھے لکھے تھے، دیوان خانے میں اُن کا شغل صرف لُطفِ صحبت اُٹھانا یا اخبار بینی تھا۔ حکیم اجمل خاں کے ہندوستانی دواخانے میں ناظرِ خرید تھے۔ دواؤں میں کام آنے والی جڑی بوٹیوں کا خریدنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اس کام کو صرف ایک ماہرِ فن ہی انجام دے سکتا ہے۔ اس باب میں منشی جی کو قدرت نے ایک غیر معمولی نگاہ اور بصیرتِ شناخت عطا کی تھی۔ اُن کے مشاہدے اور تجربے کا یہ عالم تھا کہ انھیں صدہا جڑی بوٹیوں کے نام، رنگ و روپ، بُو، ذائقہ، مقامِ پیدائش اور زمانۂ فصل سب ہی کچھ از بر تھا۔

اسی دواخانہ میں ایک بزرگ، ہمارے عزیز میر جمال الدین مرحوم تھے۔ اُن کا بھی دلّی کے شرفا و سادات میں شمار ہوتا تھا۔ حکیم صاحب کو ان سے ایک خاص تعلقِ خاطر تھا۔ یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے کہ وہ اُس وقت شملہ میں ریلوے بورڈ میں ملازم تھے کہ حکیم صاحب کو دواخانے میں ایک

www.bhatkallys.com

منیجر کی ضرورت لاحق ہوئی۔ میر صاحب چونکہ اس سے قبل عارضی طور پر دواخانے سے منسلک رہ چکے تھے اس لئے انھیں کو بلانا بہتر سمجھا گیا۔ تار بھیج کر دہلی طلب کیا گیا۔ میر صاحب نے دہلی آکر پہلے تو اپنی سرکاری ملازمت کا عذر پیش کیا۔ لیکن بعد میں چند شرائط پر حکیم صاحب کے آگے سپر ڈال دی۔ میر صاحب کا دماغ مشین کی طرح کام کرتا تھا اور فطرتاً مشینری سے شغف اور مہارت بھی رکھتے تھے۔ یہ جو آج کل آپ ہمدرد دواخانے کی مختلف ادویات کو قرصوں کی شکل میں دیدہ زیب پیکنگ کے ساتھ دیکھتے ہیں، ہندوستان میں اس کے بانی میر صاحب ہی تھے۔ انھوں نے پہلے تو اس کی مشینیں ولایت سے منگوائیں۔ بعد ازاں اسی انداز اور پیمانے کی مشینیں ہندوستان میں بنوا کر اس کام کی داغ بیل ڈال دی۔ ساتھ ہی ہندوستانی دواخانے کی شہر در شہر متعدد شہری ایجنسیاں قائم کیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب انھوں نے دواخانے کی خدمات سے سبکدوشی اختیار کی تو اپنے ذاتی سرمائے سے ایک مطبع "جے اینڈ سنز" کے نام سے جاری کیا۔ کچھ مدت طباعت کا کام کیا۔ بعد ازاں اپنے ہی محلے میں دوائیوں اور دیگر قسم کی مشینیں بنانے کی ایک فیکٹری قائم کی جس کو آخر تک چلاتے رہے۔ ان کا انتقال ۱۹۴۴ء یا ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ صاحب جائیداد اور آسودہ حال تھے۔ محلہ چوڑی والان میں جہاں اُن کا مکان تھا وہ پورا کا پورا محلہ انھیں کا تھا۔ انھوں نے اس محلّہ کا نام اپنے باپ دادا کے نام پر "کٹرہ شمس الدین" رکھا تھا۔ اب بھی وہ اسی نام سے موسوم ہے۔ ان کا باقی

www.bhatkallys.com

ذکر آپ دیوان خانے میں پڑھیں گے۔

مولانا محمد ایوب دہلوی بفضل خدا ابھی حیات ہیں۔ آپ مولانا محمد اسحق رام پوری جیسے عالم فاضل استاد کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں جو ساٹھ برس تک لوگوں کو علم معقول و منقول پڑھاتے رہے۔ مولینا محمد ایوب نے آپ سے نہ صرف قرآن، حدیث اور فقہ کا درس لیا بلکہ فلسفہ، منطق اور حکمت میں بھی جو اُن کے اُستاد کے خاص مضامین تھے درجۂ کمال حاصل کیا۔ جس طرح اُن کے اُستاد فلسفہ، منطق اور حکمت سے اسلام کی تائید کا کام لیتے تھے، اسی طرح بلکہ اُن سے کہیں زائد مولانا محمد ایوب کو اس فن میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اُن کی لیاقت و قابلیت علمی اور قوتِ گویائی کا کیا کہنا۔ اہلِ ذوق کا مجمع ہو تو گھنٹوں بولتے ہیں۔ اس وقت ستّر برس کے ہوں گے لیکن تقریر کا وہی عالم ہے۔ دہلی میں اُن کی تقاریر اکثر نواب صاحب کے دیوان خانے ہی میں ہوا کرتی تھیں۔ یہاں کراچی میں یہ مجلس جناب احمد ملتانی مرحوم کے ہاں قائم ہوتی تھی۔ اُن کو دِلّی اور کراچی میں تقریر کرتے ہوئے ۴۵ سال ہو گئے۔ اس مدت میں کچھ نہیں تو انھوں نے تین چار ہزار تقریریں کی ہوں گی۔ دقیق سے دقیق مسائل کو عام فہم زبان میں اس خوبی سے سلجھاتے اور سمجھاتے ہیں کہ ناخواندہ بھی خواندہ بن جاتا ہے۔ بڑے سے بڑا منکرِ اسلام جس کو اپنے علم و عقل پر ناز و گھمنڈ ہو اگر ایک مرتبہ اُن کی مجلس میں آجائے تو بلا مبالغہ اپنے علم اور عقل پر ماتم کرتا جائے گا۔ اس باب میں مولانا محمد ایوب

www.bhatkallys.com

کا علم برہانِ قاطع اور تیغ زبان، قاطع برہان ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اُن کی شمشیرِ قلم بھی بے نیام ہو گئی ہے۔ اب تک اس دولتِ سخن میں صرف سامعین حصّہ دار ہوتے تھے۔ اگر مستقبل قریب یا بعید میں اُن کے چند خطبات شائع ہو گئے، تو پھر ایک دنیا اُن سے مستفیض ہو گی اور آنے والی نسلوں کے لئے یہ ایک قابلِ یادگار سرمایہ ہو گا۔

سینۂ گُل کی طرح مولانا کا گریبان بھی چاک یا کھُلا رہتا ہے۔ ململ کی دو پلڑی ٹوپی، ململ ہی کا کرتا، لٹھے کا شرعی پاجامہ، موسمِ سرما میں کبھی کبھی گرم شیروانی اور ہمیشہ دیسی جوتی، بس اتنا ہی آپ کا پہناوا ہے۔ پان اس درجہ مرغوب ہے کہ جہاں تقریر کرنے جاتے ہیں صاحبِ خانہ پاندان اُن کے آگے رکھ دیتا ہے۔ درمیان میں ایک دو دفعہ چائے کا دَور بھی ہوتا ہے۔ بس اس سے زیادہ مولانا کسی کو کوئی تکلیف نہیں دیتے۔ دہلی میں آپ کا کاروبار پارچہ فروشی تھا۔ یہاں بھی یہی ذریعۂ معاش ہے۔ شیخ عزیز الدین پراچہ مرحوم، آنریری مجسٹریٹ و رئیس دہلی سے شاید آپ کی کچھ قرابت بھی ہے۔

حضرت بے خود دہلوی، حضرت داغ دہلوی کے محبوب شاگرد تھے یا یوں کہیئے کہ داغ کی منہ بولتی تصویر تھے۔ آپ کی دلچسپ باتیں سُن کر کون بے خود نہیں ہوا۔ اُن کی بہت سی باتیں قابلِ ذکر ہیں لیکن کسی وقت پھر سنئے گا۔ نواب ابوالحسن خاں رئیس ابنِ رئیس دہلی ایک مدت تک دلی کے میونسپل کمشنر، آنریری مجسٹریٹ اور ہندوستانی دواخانے کے کاموں

www.bhatkallys.com

میں ہمیشہ حکیم صاحب کے مشیر اور معاون رہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد انھوں نے طبیہ کالج اور دواخانے کے مشترکہ ٹرسٹ میں اور بھی شدومد کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں کو یہ امر سخت شاق گزرا۔ وہ چاہتے تھے کہ حکیم صاحب نے جس طبیہ کالج کا سنگِ بنیاد لارڈ ہارڈنگ سے رکھوایا تھا اور اس کی رسم افتتاح آنجہانی گاندھی کے ہاتھوں ہوئی تھی اُس پر تمام و کمال اُن کا قبضہ ہو جائے اور مسلمانوں کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکیں۔ حکیم صاحب تو اپنی زندگی میں قومی جذبے اور جوش کے تحت طبیہ کالج کا نام "آریو ویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج رکھ بیٹھے تھے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو اور خاص طور پر امام صاحب اور پیرزادہ صاحب کو اس سے اختلاف تھا۔ حکیم صاحب کے بعد طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانے کے نظم ونسق میں خانگی اور بیرونی بہت سے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں پیرزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مصلحتاً قرار یہ پایا کہ طبیہ کالج کے اس خادم کو کالج ہی کے احاطے میں دفن کیا جائے۔ ہندو اس پر سیخ پا ہو گئے۔ عین تدفین کے وقت وہ اس امر کے مانع ہوئے۔ لیکن امام صاحب آگے بڑھے اور کدال سنبھال کر خود قبر کھودنی شروع کر دی۔ اس پر مخالفین بے بس ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں اس طبیہ کالج پر بھی آفت آئی، اور شاید آج بھی یہ ایک متنازعہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔

مولوی عبد الاحد مرحوم (سید احمد امام مرحوم کے خسر دوم) کے تذکرے

www.bhatkallys.com

کے بغیر اس دیوان خانے کا حال نامکمل اور تشنہ رہے گا۔ مطبع نول کشور لکھنؤ کے بعد اگر کسی مطبع نے لازوال شہرت پائی تو وہ واحد مطبع مجتبائی دہلی تھا۔ ابتدا میں یہ مطبع منشی ممتاز علی مرحوم خوش نویس دہلی کا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں جب منشی ممتاز علی نے ہجرت کے ارادے سے بیت اللہ کا قصد کیا تو مولوی عبدالاحد نے یہ مطبع مع نام اُن سے خرید لیا۔ انھوں نے اپنے حُسن انتظام سے اس مطبع کو ایسی خوبی سے چلایا کہ سیکڑوں مذہبی، تاریخی اور بعض ادبی کتابوں کے درجنوں ایڈیشن اور لاکھوں نسخے چھاپ ڈالے۔ ان دونوں بزرگوں کی تنہا یہ ایک خدمت ہی ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ صدیوں اُن کا نام زندہ اور باقی رہے گا۔ یہ انھیں بزرگوں کا صدقۂ جاریہ ہے کہ آج ہمارے کتب خانے مختلف علوم و فنون کی نایاب کتابوں سے معمور نظر آتے ہیں۔ اس یادگار کام کے علاوہ دوسرے قومی کاموں میں بھی مولوی صاحب نے پورے جوش و خروش سے حصّہ لیا۔ چنانچہ علی گڈھ یونیورسٹی، عربک ہائی اسکول، دہلی جامع مسجد، مسجد فتح پوری، انجمن مویدالاسلام اور اسی قسم کے متعدد اداروں میں وہ کہیں ٹرسٹی تھے اور کہیں رکن۔ گویا اُن کی زندگی کا نصب العین صرف مُلک و ملّت کی خدمت تھا۔ ایک مدّت تک دہلی میں آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ سے خان بہادر کا خطاب بھی پایا۔

آپ حضرت امام علی رضاؓ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے اجداد میں جو بزرگ سب سے پہلے ہندوستان آئے اُن کا نام شاہ باقر علی تھا۔

www.bhatkallys.com

مولوی عبد الاحد تک آبائی سلسلہ یوں ملتا ہے۔ مولوی عبد الاحد بن میر غلام محمد بن مولوی ستید غلام رسول بن مولوی سید غلام رضا بن مولوی شاہ باقر علی نقشبندی۔ مولوی عبد الاحد کے والد سید غلام محمدؒ، حضرت شاہ ابو سعید نقشبندی سے بیعت تھے۔

یہ واقعہ ہے کہ مسلمان ایک مُردہ پرست قوم ہے لیکن اس مُردہ پرست قوم کی مُردہ پرستی کا ذرا یہ رنگ بھی ملاحظہ ہو۔ ۱۹۲۰ء میں جب تحریکِ خلافت اپنے شباب پر تھی۔ حکیم اجمل خاں ترکِ موالات کے سلسلے میں اپنا خاندانی خطاب "حاذق الملک" ایسے وقت اور ایسی صورت میں حکومت کو واپس کر چکے تھے جب کہ ہندوؤں میں کوئی ایک متنفس بھی اپنی "رائے صاحبی" اور "رائے بہادری" سے دست بردار نہ ہوا تھا۔ حکیم صاحب کے خطاب واپس کرتے ہی امام صاحب پر یورش ہوئی۔ اُن کی اقتدا میں نماز ترک کی گئی۔ اُن کے برادرِ خورد، راقم کے والد، سید حامد کو ممبرِ مسجد کے روبرو خون میں نہلایا گیا۔ کم و بیش یہی جرم مولوی عبد الاحد مرحوم کا بھی تھا کہ وہ حکام رس تھے، خطاب یافتہ تھے۔ لہٰذا ۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو جب مولوی عبد الاحد نے اپنا سفرِ آخرت اختیار کیا تو اس مخدومِ ملت کے متعلق زبانی اور پوسٹر چسپاں کر کے اعلان کیا گیا کہ مرحوم انگریز پرست تھا۔ خطاب یافتہ تھا۔ ٹوڈی تھا۔ کافر تھا۔ مسلمان اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں۔ اس کی میت بھی دفن نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ابھی جنازہ قبرستان کی راہ ہی میں تھا کہ اُسے روک دیا

www.bhatkallys.com

گیا۔ مجبوراً جنازہ مکان پر واپس آیا، بلوۂ عام کا اندیشہ اتنا غالب تھا کہ حکومت کو فی الفور مداخلت کرنی پڑی۔ اِدھر پولیس اور فوج نے محلہ چوڑی والان کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر کے مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دیا اُدھر مولوی عبداللطیف مرحوم خلف مولوی عبدالاحد نے اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر تقریر کی۔ مولوی صاحب کی خدمات کو یاد دلایا۔ شکوک اور الزامات کی صفائی پیش کی۔ یوں خدا خدا کر کے غلط فہمی کا ازالہ ہوا۔ پھر نعش کی توہین کرنے والے لوگوں ہی نے عوام کے ساتھ جامع مسجد میں اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی اور بعد مغرب قبرستان مہندیاں (مدفن شاہ عبدالعزیزؒ) میں سپردِ خاک کیا۔ یہ تھا وہ صلہ جو اس مُردہ پرست قوم نے اپنے اِس سربرآوردہ خیر خواہِ قوم و ملت مولوی عبدالاحد کو اُن کے مرنے کے بعد دیا تھا۔

نعش کی توہین کے علم بردار کون کون اشخاص تھے، اُن میں سے کس کس نے (جب خود حکومت نے مدعی بن کر اُن پر مقدمہ قائم کیا) اپنے کیے کی سزا پائی؟ چونکہ اب وہ سب مرحومین کی صف میں شامل ہو چکے ہیں میں اس وقت اُن کا نام لینے کے بجائے اُن کے حق میں دُعائے مغفرت کرتا ہوں اور صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اُن بر خود غلط لوگوں نے اس واقعہ کے بعد بھی بارہا جب ذاتی منفعت یا کسی قومی کام کی خاطر سفارش اور مدد کی ضرورت محسوس کی تو اُسی مرحوم کی چوکھٹ کو چوما اور اُسی خطاب یافتہ امام کا دامن پکڑا۔ لطیفہ ملاحظہ ہو کہ پہلے خطاب پانے والی

www.bhatkallys.com

کرایا۔ پھر واپس دلوایا۔ مرتے دم تک یہی اکھاڑ پچھاڑ اور ریشہ بازی ہوتی رہی۔ دشمنِ جان اور دین و ایمان بنے رہے لیکن حق یوں ہے کہ جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے؟

نواب صاحب کے متعلق دو چار باتیں اور قابلِ ذکر ہیں وہ بھی سُن لیجئے۔

وہ دلّی کی قدیم وضع داری کی ایک زندہ تصویر تھے۔ کم از کم دس بارہ سال تک ہمارے مشاہدے میں ایک چھوٹی سی بات تو یہ آئی کہ ہم نے اُن کے اس کمرۂ خاص میں جو اصل دیوان خانہ تھا، سامانِ آرائش کی جس چیز کو جس مقام پر جس طرح روزِ اوّل دیکھا تھا ہمیشہ اس کو اسی جگہ اُسی حالت میں پایا۔ نواب صاحب اپنے لیل و نہار ایک مخصوص نظام کے تحت بسر کیا کرتے تھے۔ روزانہ بلا ناغہ عصر و مغرب کے درمیان گھر سے برآمد ہوتے۔ خراماں خراماں شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مزار پر فاتحہ پڑھتے۔ مغرب کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتے۔ ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک دیوان خانے کی محلس قائم ہوتی۔ اُن کا خط نہایت پختہ اور پاکیزہ تھا لیکن ہم نے اُن کو کبھی کچھ لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کام کے لئے ایک پیش کار و خوش نویس مقرر تھا جو زیادہ تر خط و کتابت کے فرائض انجام دیتا۔ جس کو جو جواب لکھنا مقصود ہوتا وہ اس کو بولتے جاتے۔ تحریر مکمل ہونے پر اپنے دستخط کر دیتے۔ کیوں نہ ہو آخر نواب ابن نواب تھے۔

شعرا متقدمین و حال میں اُن کو خواجہ میر درد، جامی، حافظ، امام رازی، میر، غالب اور حالی کا کلام بہت محبوب تھا۔ اوقات

www.bhatkallys.com

فرصت میں زیادہ تر انھیں شاعروں کے دیوان پڑھتے تھے۔ چائے اور آم کے بے حد شوقین تھے۔ آموں کے بیسیوں نام اُن کو یاد تھے۔ زیادہ تر گھر ہی میں رہتے۔ عمر کے آخر ایام میں جب بواسیر اور درد نقرس لاحق ہوا تو باہر کی آمد و رفت بالکل منقطع ہو گئی لیکن اس حالت میں بھی صوم و صلوٰۃ کے پابند رہے۔ آخر ۱۶ جون ۱۹۴۱ء کو خدا کو پیارے ہوئے۔ جدید قبرستان کوٹلہ فیروز شاہ میں جگہ پائی۔

ان کی رحلت سے ۲۲ سال قبل، ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو اُن کی اہلیہ، پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑ کر اُن سے رخصت ہو چکی تھیں۔ نواب صاحب چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے دور اندیشی سے کام لیا اور نکاح ثانی کے عوض اولاد کی تعلیم و تربیت کو زیادہ ضروری سمجھا۔ چنانچہ اُن کی بڑی لڑکی عالیہ بیگم کی شادی محمد سمیع تحصیلدار سے ہوئی۔ دوسری بیٹی محمودی بیگم کے شوہر ڈپٹی امیر علی کے لڑکے سید دبیر علی تھے۔ تیسری صاحبزادی آمنہ بیگم کا نکاح خان بہادر عبدالقادر کلکٹر سے ہوا۔ ان تینوں لڑکیوں کی اولاد کا ہمیں کوئی علم نہیں بجز اس کے کہ وہ تینوں اللہ کو پیاری ہو چکیں۔ چوتھی دختر عائشہ بیگم اور ان کے شوہر سید عزیز شفیع جو اس وقت دہلی میں مجسٹریٹ ہیں ابھی حیات ہیں۔ پانچویں لڑکی جہاں تک ہمیں علم ہے ناکتخدا رہ گئیں۔ معلوم نہیں وہ حیات ہیں یا اپنے بہنوں سے جا ملیں۔ اولاد نرینہ میں نواب صاحب کی زندہ یادگار نواب عزیز احمد خاں ہیں۔ یہ بھی قیام پاکستان سے قبل دلّی میں آنریری مجسٹریٹ اور

www.bhatkallys.com

سب رجسٹرار صوبہ دہلی تھے۔ مرحوم باپ کے نقش قدم پر یہ بھی قومی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ منتظمہ کمیٹی جامع مسجد اور مسجد فتح پوری میں بحیثیت رکن سالہا سال تک وہاں کے نظم و نسق میں خدمات سر انجام دیں۔ اُن کی شادی قدسیہ بیگم دختر نواب حمید الدین صاحب سے ہوئی۔ بیگم عزیز احمد کی عمر نے وفا نہ کی۔ مدت ہوئی اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔ نواب عزیز احمد کے صاحب زادے آفتاب احمد خاں ہیں۔

نواب صاحب کی ایک اور نشانی اُن کی ہمشیرہ مرحومہ سلطان جہاں بیگم تھیں۔ اُن کا عقد سید مصطفےٰ علی سے ہوا تھا۔ اُن کے بطن سے میر مرتضیٰ علی، میر منشی کمانڈر انچیف آف انڈیا، نہایت متین باوضع پابند صوم وصلوٰۃ اور علم و ادب میں نہایت ہی صاحب ذوق شخصیت تھے ان کے دو بھائی مجتبیٰ علی اور ارتضیٰ علی اور ایک بہن قمر جہاں تھی۔ تینوں بھائیوں میں سے ایک بھی باقی نہ رہا۔ بہن کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں

نواب عزیز احمد خاں نہایت خوب رُو، خوش وضع، خوش قطع اور شگفتہ مزاج آدمی ہیں۔ لیکن بعض اوقات نہ معلوم کیوں اپنے دوستوں سے بے نیاز سے ہو جاتے ہیں۔ ہم اس کو اُن کی طبیعت کے تساہل اور تغافل ہی پر محمول کر سکتے ہیں۔ بہت دن ہوئے راقم اُن سے اُن کے والد مرحوم کے حالات اور تصویر کا طالب ہوا تھا لیکن اُن کی اسی شانِ بے نیازی کی بدولت محروم رہا۔ تاہم اُن کی یہ کج ادائی تلخ تو بہت گزری لیکن

ع۔ اُن پہ قابو نہیں دل پہ تو ہے قابو اپنا۔ اُن کو اختیار ہے وہ چاہیں تو ہمیں فراموش کریں

www.bhatkallys.com

لیکن اُن پُرخلوص تعلقات و مراسم کی یادجو ہمارے اور اُن کے بزرگوں کے درمیان قائم تھے اور ہماری ذاتی عقیدت اس دل سے کیونکر محو ہوسکتی ہے۔ حکیم اجمل خاں کا دیوان خانہ ہو یا نواب فیض احمد خاں کا دونوں قومی اور تاریخی دیوان خانے بن گئے تھے جس کا خاکہ امام صاحب مرحوم کے موئے قلم نے کھینچا۔ اس میں کچھ رنگ ہم نے بھی بھر دیا۔ اب امام صاحب کی زبانی دیوان خانے کی کہانی سُنیئے :

"انسان قدرتی طور پر مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس لئے ایک دوسرے سے ملنا جلنا اور ایک جگہ اُٹھنا بیٹھنا اُسے حد درجہ مرغوب ہے، یہی وجہ ہے کہ کاروبار کی مصروفیتوں اور الجھنوں سے فراغت پاکر چند ہم خیال ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی اپنی دن بھر کی سرگزشت ایک دوسرے سے بیان کرکے غم غلط کرلیتے ہیں اس یکجائی نشست یا باہمی صحبت اختلاط کو دیوان خانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ اصول تمدن نوع انسانی کے ہر طبقے میں پایا جاتا ہے، بادشاہ اور امراء سے لیکر پیشہ ور مزدور اور تنگ حال کسان تک اپنی اپنی حیثیت و مذاق کے اعتبار سے اس سلسلے میں منسلک ہیں۔ بادشاہ اپنے ارکین کے ساتھ گرم صحبت ہوکر تفنن طبع حاصل کرتے ہیں، پیشہ ور اور متوسط الحال اپنے اپنے محلے کے چوک میں اپنی طرح طرح کی چہ میگوئیوں اور خیال آفرینیوں سے دل کو بہلاتے ہیں۔ بھنگڑوں اور چرسیوں کی بھی منڈلیاں ہوتی ہیں جہاں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔

www.bhatkallys.com

غرض یہ کہ انسانی برادری کا کوئی گروہ ایسا نہیں جو اس اجتماع باہمی کی کیفیات سے بہرہ ور نہ ہو۔ اور یہی اجتماع عرفاً و معناً اس کا دیوان خانہ ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے دہلی میں امراء و شاہ زادگان کے بہت سے دیوان خانے تھے، ہر دیوان خانہ وہاں کے بیٹھنے والوں کے کیریکٹر کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ ہمارے زمانے میں انحطاطِ قوم کے باعث محض چند دیوان خانے رہ گئے تھے۔ ان میں ایک دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں خلف نواب نجف خاں کا تھا جو آج بھی موجود ہے۔ یہ دیوان خانہ زیرِ جامع مسجد چھتہ شیخ منگلو میں واقع ہے اور ان کو وراثتاً اپنے نانا میر احمد حسین مرحوم سے پہنچا ہے۔ شہر کے معززین رات کے گیارہ بجے تک اس دیوان خانے میں جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو مذہبی اور مفید باتوں سے مستفید کیا کرتے تھے۔ اور ضرورت کے وقت باہمی ہمدردی و امداد سے پیش آتے تھے۔ جب وہ مبارک سبھا اُٹھ گئی تو اس کی جانشینی کا شرف نواب فیض احمد خاں کو حاصل ہوا۔ اس دیوان خانے میں زمانے کی ضرورت نے ایسے لوگ جمع کر دئیے تھے جو قومی خدمات کو تفریح اور دل لگی سے مقدم سمجھتے تھے، اِس سے یہ مراد نہیں کہ تفریح اور دل لگی کے مشاغل سے یکسر گریز ہو گیا تھا بلکہ جاڑے کے موسم میں شکار ہوتا تھا۔ گرمی کے ایام میں سیرِ دریا کا خاطر خواہ لطف اُٹھایا جاتا تھا اور برسات کے دنوں میں قطب صاحب اور مختلف باغات میں جا کر اپنی خوشی ہوتی تھی مگر فلاحِ قوم کی تڑپ ہر دل میں ہمہ وقت موجود رہتی تھی یعنی "دل بیار

www.bhatkallys.com

دست بکار'' کا مصداق رہتا تھا۔

دیوان خانے میں اکثر علمی و فکری مسائل پر بحث و تمحیص ہو جایا کرتی تھی، اگر شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو گیا تو غالبؔ و ذوقؔ اور مومنؔ کے ادق اشعار پیش ہوتے اور ہر شخص اُن کے معانی و مفہوم پر سیر حاصل بحث کرتا۔ اگر شریعت و تصوف کے مسائل پر گفتگو شروع ہو جاتی تو امام غزالی رح۔ شاہ ولی اللہ رح اور شاہ عبدالحق رح کی تصانیف پر تبصرے چھڑ جاتے۔ اگر کسی نے اخباری خبروں کا تذکرہ کر دیا تو سیاسی بحث کا آغاز ہو جاتا اور رات کی نشست اسی پر ختم ہو جاتی۔ اگر کچھ حضرات کوئی شئے تحفۃً پکوا کر لے آتے تو عمدہ اور لذیذ کھانوں کا ذکر شروع ہو جاتا اور ایک دوسرے سے فرمائش ہوتی کہ آپ کیا پکوا کر لائیں گے اور وہ کیا، اور یہ سلسلہ کئی روز تک برابر جاری رہتا۔

سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں جب ترکی اور یونان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو اس دیوان خانے کی جانب سے انگریزی اخبار پائنیر سے روزانہ خبروں کا ترجمہ کرا کے اُردو کا دو ورقہ نکالا جاتا تھا اور عام مسلمانوں کو ترکی کی فتوحات سے رُوشناس کیا جاتا تھا۔ قحط اور خشک سالی کے دوران میں ریلیف یعنی امداد کا کام شہر اور دیہات میں جاری کیا گیا۔ انفلوئنزا کی بیماری میں دیوان خانے کی طرف سے بیماروں کے گھروں پر جا جا کر مفت دوائیاں تقسیم کی گئیں۔

انجمن مؤید الاسلام اور اس کا یتیم خانہ اسی دیوان خانے کی کوششوں

www.bhatkallys.com

کا نتیجہ ہے غرضکہ یہ دیوان خانہ قوم و ملت کے لئے ہر موقعہ پر اپنی خدمات پیش کرتا تھا اور کسی خدمت سے گریز نہ کرتا تھا۔

یوں تو دیوان خانے میں بے شمار لوگ اپنی اپنی غرض کے حصول کے لئے آتے تھے مگر اس کی رونق اور شہرت کا انحصار محض ان حضرات کے دم پر تھا جو اکثر و بیشتر دیوان خانے میں آیا کرتے تھے۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی اور ان کے اوصاف کی اجمالی تفصیل حسب ذیل ہے:

سب سے پہلے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کا حال سنئے۔ حکیم صاحب ابتدا سے سلیم الطبع، سنجیدہ، متقی اور پرہیزگار واقع ہوئے تھے۔ ان کے والد حکیم محمود خاں صاحب انھیں لڑکپن میں "ملّا نما" کہا کرتے تھے۔ یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ذہین اور ذکی طبیعتیں محنتی نہیں ہوا کرتیں، مگر حکیم صاحب ذہین و طباع ہونے کے باوصف حد درجہ محنتی و جفاکش تھے۔ مثال کے طور پر جب ابتدا میں قرآن شریف پڑھنے لگے تو حفظ کر کے چھوڑا۔ اور کئی سال تک محراب سنائی۔ پھر خط کی طرف توجہ ہوئی تو اعلیٰ درجہ کے خوش نویس ہو گئے۔ اسی زمانے میں اکمل الاخبار کو جو اُن کے خاندان سے متعلق تھا سنبھال لیا۔ اور اُس میں مضامین لکھنے لگے۔ حتیٰ کہ بوقت ضرورت اُس کی کتابت اور سنگ سازی وغیرہ بھی خود کر لیتے۔ ورزش و کسرت کا خیال آیا تو اس وقت کے مشہور فن پہلوان اسمٰعیل اور الف بیگ سے داؤ پیچ سیکھنے شروع کئے اور ایسا ریاض بڑھایا کہ تقریباً اُن کی جوڑ کے ہو گئے۔ نواب

www.bhatkallys.com

شجاع الدین تاباں اور نواب سراج الدین سائل وغیرہم احباب کی بدولت نظم کی جانب متوجہ ہوئے تو فارسی اور اردو میں بے نظیر غزلیں لکھنے لگے۔ افسوس کہ ان کی غزلیات کا نسخہ ریل میں گم ہو گیا۔ اگر یہ ذخیرہ اس طرح گم نہ ہوتا اور طبع ہو کر منظرِ عام پر آجاتا تو حکیم صاحب کا کلام شعرائے دہلی میں سب سے ممتاز تسلیم کیا جاتا۔

حکامِ وقت بھی حکیم صاحب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ "حاذق الملک" کا خطاب اُن کے بڑے بھائی حکیم عبد المجید خاں کے بعد حکیم صاحب کو عنایت ہوا۔ حکیم صاحب کی مخلصانہ کوششوں اور حکام کی مہربانی سے طبیہ کالج کے لئے اراضی حاصل کی گئی۔ اور لارڈ ہارڈنگ سے طبیہ کالج دہلی کا سنگِ بنیاد جو آج ایک عالی شان عمارت کی شکل میں موجود ہے رکھوایا گیا۔ حکیم صاحب کی خوبیاں اور کارنامے کہاں تک بیان کئے جائیں۔ فی الحقیقت مرحوم کی ذات نرالے کمالات اور انوکھے اوصاف سے آراستہ و پیراستہ تھی۔

دوسرے غلام محمد حسن خاں بی اے خلف الرشید مولوی عنایت الرحمٰن مرحوم تھے۔ راست گوئی اور قومی ہمدردی گویا اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ پکے دین دار اور مذہبی رنگ میں پورے رنگے ہوئے تھے۔ اپنی ذاتی قابلیت سے میونسپل کمشنری۔ آنریری مجسٹریٹی اور خان بہادری حاصل کی اور اس طرح اپنی قوم کو خاطر خواہ فائدہ پہنچایا۔

تیسرے خان بہادر عبد الاحد مطبع مجتبائی کے مالک تھے اُن کی جفاکشی

www.bhatkallys.com

اور مصروفیتوں کا اندازہ لگانا امر محال ہے۔ معمولی سرمایے سے یکہ و تنہا کام شروع کیا اور لاکھوں روپیہ پیدا کیا مگر اس کے باوجود انکسار، سادہ مزاجی اور نکا گز کی چال رہی۔ البتہ قوم کے کاموں اور تعلیمی اداروں میں انھوں نے بڑی فراخ دلی سے چندے دئے۔ علی گڈھ کالج، عربک کالج دہلی اور انجمن مویدالاسلام کے بے حد دل دادہ تھے اور ہمیشہ اُن کی مالی امداد کرتے رہے۔ حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج میں جو شاندار خدمات اُن سے سرانجام پائیں حکیم صاحب اُن کا عمر بھر اعتراف کرتے رہے۔

چوتھے خواجہ تصدق حسین جو حالی مرحوم کے حقیقی بھانجے تھے۔ آخر ملازمت میں دہلی کے ڈسٹرکٹ جج ہو گئے تھے۔ انھیں بے تعصبی کا مجسمہ کہا جائے تو بجا ہے۔ تکلف کو پاس نہ آنے دیتے تھے۔ ہر سیر و شکار میں سب کو بے تکلفانہ ساتھ لے جاتے اور برابرانہ انداز میں خود بھی شریک ہوتے۔

پانچویں سید محمد الملقب بہ سید جو ابتدا میں بالکل ان پڑھ تھے، مگر دیوان خانے نے انھیں اُردو پڑھنا سکھا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسا لحن داؤدی مرحمت فرمایا تھا کہ جہاں انھوں نے کوئی غزل یا نعت مترنم لہجے میں پڑھنی شروع کی تمام محفل پر سکوت طاری ہو جاتا اور سرور و کیفیات کے چشمے اُبل پڑتے۔ دیوان خانے کی رونق بہت کچھ ان کے دم سے وابستہ تھی۔ ایثار و خدمت کا یہ حال تھا کہ جس نے جس وقت کوئی فرمائش کی اُسی وقت اُسے پورا کرنے کے لئے مستعد ہو جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شخص اُن پر فدا تھا اور دل و جان سے محبت کرتا تھا۔

www.bhatkallys.com

چھوٹے محمد یعقوب جو منشا تخلص کیا کرتے تھے، بول چال کے وقت جو منشا کہہ کر مخاطب ہوتا اس سے بے حد خوش اور متاثر ہوتے۔ چنانچہ دیوان خانے والوں نے نام کے بجائے انھیں ہمیشہ منشا کہہ کر ہی پکارا۔ جب اُن کے اشعار کی ضرورت سے زائد تعریف کی جاتی تو اس ہجو ملیح کو تاڑ لینے کے باوجود بُرا نہ مانتے تھے طبیعت کے نہایت مسکین تھے۔ دوستوں کے سچے دوست اور حاضر و غائب سب کے یکساں خیرخواہ تھے۔

ساتویں میر جمال الدین جنھیں جگت دوست کہا جائے تو مضائقہ نہیں۔ نہ معلوم اُن کے کتنے ہزار دوست ہوں گے اور خوبی یہ کہ بڑے چھوٹے امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں سلوک و محبت اور وہی بے تکلفانہ برتاؤ ہر شخص کے کام میں بے دریغ شریک ہو جاتے اور اس کام کو اس کفایت اور سلیقہ سے انجام دیتے کہ واہ واہ۔

آٹھویں نواب فیض احمد خاں ہیں، جنھیں روحِ دیوان خانہ سمجھنا چاہیئے۔ اوّل درجے کے خوددار، فہیم اور عاقبت اندیش اور خداداد صفات سے متصف۔ کچھ ارکانِ دیوان خانہ پر ہی منحصر نہیں دہلی کے عام باشندے انھیں بلا استثنا زیرک و اہلِ تدبیر تسلیم کرتے ہیں اور ان کے مشوروں کو اپنے لئے ہر طرح مفید سمجھتے ہیں۔ حکیم اجمل خاں مرحوم تو اُن کی رائے بغیر ٹکرا نہ توڑتے تھے۔

نویں یہ خادمِ قوم جو آپ سے مخاطب ہو رہا ہے۔

یہ دیوان خانہ مذکورہ بالا نورتن سے مرتب تھا اور انھیں حضرات

www.bhatkallys.com

کے دم سے اس کی شہرت اور دھوم دُور دُور تک تھی۔ ان نورتنوں کے علاوہ شہر کے دیگر رؤسا و معززین مثلاً نواب صاحب لوہارو، جسٹس محمد رفیق اور دیگر حکام وقت وقتاً فوقتاً دیوان خانے میں تشریف لایا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ نورتنوں میں سے شروع کے چھ رتن تو واصل بحق ہو چکے ہیں، اور مابقی ا ہم تین پابرکاب ہیں۔ دیوان خانے کی پہلی رونق اور شہرت و عظمت کو یاد کرکے مرثیہ خوانی کرتے رہتے ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس"۔

سید احمد امام جامع مسجد دہلی

www.bhatkallys.com

شجرہ

سید عبدالغفور شاہ بخاری

سید عبدالشکور بخاری

سید عبدالغفور شاہ بخاری (ثانی)

سید عبدالرحمٰن بخاری

سید عبدالکریم بخاری

میر جیون

سید احمد علی بخاری

سید محمد بخاری

سید محمود بخاری — سید احمد بخاری — سید حامد بخاری

سید حمید بخاری (از زوجۂ اول) — سید رشید احمد بخاری — کلثوم عرف ملکہ بیگم — سید بشیر احمد بخاری — سید عزیز احمد بخاری

سید یوسف بخاری — سید محمد بخاری (ثانی) — سید محمود بخاری (ثانی)

ولادت	رحلت	مدفن
[1] شوال ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء	ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء	خواجہ باقی باللہؒ دہلی
[2] ۱۲۴۴ھ " ۱۸۲۸ء	۳ر ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ " ۱۸۹۹ء	مہندیاں، مدفن شاہ عبدالعزیز (رح) دہلی
[3] ۱۴ر شوال ۱۲۷۵ھ " ۱۸۵۹ء	۱۲ر ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ " ۱۸۹۳ء	مکہ معظمہ
[4] یکم شعبان ۱۲۸۲ھ " ۱۸۶۵ء	۳ر ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ " ۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء	باغیچہ زیر دروازہ شمالی جامع مسجد دہلی
[5] ۲۷ر شعبان ۱۲۸۶ھ " ۱۸۶۹ء	۲۵ر جمادی الاول ۱۳۵۵ھ " ۱۴ر اگست ۱۹۳۶ء	زیر دفتر جدید قبرستان کوٹلہ فیروز شاہ دہلی
[6] ۱۲ر ربیع الاول ۱۳۱۰ھ " ۵ر اکتوبر ۱۸۹۲ء		
[7] ۱۴ر صفر ۱۳۲۱ھ " ۳ر مئی ۱۹۰۳ء		
[8] ۲۲ر ربیع الاول ۱۳۲۵ھ " ۶ر مئی ۱۹۰۷ء		
[9] ۲۶ر رجب ۱۳۲۸ھ " ۳ر اگست ۱۹۱۰ء		
[10] ۱۸ر محرم ۱۳۳۳ھ " ۷ر دسمبر ۱۹۱۴ء		
[11] ۲۲ر شعبان ۱۳۲۵ھ " یکم اکتوبر ۱۹۰۷ء		
[12] ۲۴ر ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ " ۱۶ر دسمبر ۱۹۱۱ء		
[13] ۱۳۴۲ھ ۸ر جولائی ۱۹۲۳ء		

www.bhatkallys.com

www.bhatkallys.com

دِلّی کا مکتب

قدیم اسلامی نظامِ تعلیم، موجودہ طریقِ تعلیم سے بہت مختلف تھا۔ اِس مضمون میں آغازِ تعلیم، ابتدائی اور اعلیٰ مکتبوں کی کیفیت، شاگردوں کی حالت، اُستادوں کی وضع قطع اور طریقِ تعلیم پر ایک دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے ۱۲۔

www.bhatkallys.com

نواب سلطان احمد خاں اور اُن کی بیوی قمر جہاں اپنے بچّوں کی تعلیم کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں:

"کیوں بی اس شوکت کی کیا عمر ہو گی؟"

"میرا شوکت ماشاء اللہ پورے سات برس کا ہو گیا اور جہاں آرا، خدا رکھے ابھی مہینے چار بھر کے پانچویں میں لگی ہے۔"

"کچھ ان بچّوں کی پڑھائی کا بھی تمہیں خیال ہے یا اپنے لاڈ و پیار میں اُن کو ایسا ہی بھوٹ اور بدتمیز رکھو گی؟"

"خدا نہ کرے بدتمیز کیوں ہوتے شوکت نے تو قرآن شریف ختم کر لیا ہے۔ جہاں آرا ابھی بچّی ہے جب اس کا وقت آئے گا تو وہ بھی لکھ پڑھ لے گی۔"

"کیا خوب ختم کر لیا۔ کئی دن ہوئے میں نے دو چار جگہ سے سُنا تھا پوری ایک سطر بھی نہ پڑھ سکا۔ اُسے کھیلنے اور لڑنے بھڑنے ہی سے فرصت نہیں۔"

"آخر دونوں بچے ہی تو ہیں اور بچے شرارت کیا ہی کرتے ہیں۔"

"جی نہیں تم ہر وقت اُن کی حمایت لیتی ہو اور میں شوکت کو ہمیشہ یا تو کنکوے بازی میں مصروف پاتا ہوں یا گُم دم لڑانے اور کبوتر اُڑانے میں بس جب دیکھو ایک دوسرے سے لڑنا بھڑنا رات دن سارے محلّے میں

www.bhatkallys.com

بہ جنم دعا اڑ مچی رہتی ہے۔"

"اچھا! اور جہاں آرا کیا کرتی ہے؟"

"جہاں آرا کون سی نیک ہے سارے دن مکان میں کُد کڑے مارتی پھرتی ہے۔ کپڑے کونے کے جالے بنتی ہے۔ کیا مقدور جو اُسے کبھی نچلا بیٹھے دیکھ لو۔ اور پھر ضدی تو اتنی ہے کہ جس بات کی ضد چڑھے پہروں پڑی ایڑیاں رگڑے، وہ دھینگا مچائے کہ سارا گھر سر پر اُٹھا لے۔"

"توبہ! الٰہی توبہ!! تم نے تو بچوں کی شرارت کا ایک پُل باندھ دیا۔ اسے خوش ہونے سے تو رہے کہ خدا نے یہ دن دکھایا۔ مجھے تو اس گھڑی کے لالے پڑتے ہیں۔"

"پتھر پڑیں تمھاری اس عقل پر۔ آگے چل کر کیا اُن کے یہی باتیں کام آئیں گی؟"

(ماتھا پیٹ کر) "میں کہتی ہوں کہ میرے سر کیوں ہو رہے ہو۔ میں تو بُری ہوں، تم باپ ہو، لکھاؤ پڑھاؤ جو چاہو سو کرو، تمھاری اولاد ہے۔"

"خدا تمھارا بھلا کرے دیکھو تو یہی یہ بات کہی ہے تم نے، ایک ذرا حمایت نہ لو۔ پھر دیکھو وہ کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔"

"ہاں ہاں کہہ تو رہی ہوں کہ میں آج سے بیچ میں نہ بولوں گی۔"

"چلو پھر ہنسی خوشی بچوں کی شادی رچاؤ، جہاں آرا کی بسم اللہ کرو، قرآن شریف پڑھنے پر لگاؤ۔ شوکت کا قرآن شریف ختم ہونے کی خوشی مناؤ اور پابندی سے مکتب بھیجا کرو۔"

www.bhatkallys.com

سہ پہر کا وقت ہے۔ پانچ بج رہے ہیں۔ شوکت اور جہاں آرا دونوں ریشمی پوشاک پہنے مسند پر بیٹھے ہیں۔ گلے میں پھولوں کا گہنا ہے۔ عزیز و اقارب جمع ہیں۔ سامنے خوانوں میں پستے بادام، تل اور خشخاش کے لڈو رکھے ہوئے ہیں۔ ایک کشتی میں مولوی صاحب کا خلعت، انعام کے روپے، اطلسی مصلیٰ اور کمخوابی جزدان کا قرآن شریف ہے۔ اسی میں، ایک چاندی کی تختی رکھی ہوئی ہے جس پر "اقرا باسم ربک الذی خلق" لکھی ہوئی ہے۔ مولوی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ آگے آگے خود ہیں پیچھے مکتب کے تمام لڑکے ہیں۔

مولوی صاحب نے آتے ہی مصلیٰ بچھا کر پہلے شوکت کو نماز پڑھوائی۔ اب جہاں آرا کو بسم اللہ پڑھوا رہے ہیں۔

"لو بیٹی! بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تو کہو، پھر ہم تم کو مٹھائی دیں گے، ہاں! اور یہ ڈھیر سارے چاندی کے روپے بھی۔ بس ایک دفعہ کہہ لو پھر سب مٹھائی اور روپے لے لینا۔"

"بسم اللہ"

"نہیں بھئی! پوری کہو اور اقرا باسم ربک الذی خلق بھی تو کہو"

"بسم ــــ اللہ ــــ الرحمٰن ــــ الرحیم ــــ اِق ــــ را ــــ باسم ــــ رب ــــ کل ــــ لذی ــــ خلق ...."

www.bhatkallys.com

"شاباش شاباش، واہ واہ واہ واہ - عمر دراز - خدا تم کو بہت سا علم اور دولت عطا فرمائے - خوش نصیب ہو"

"آمین آمین"

"بچو! اب تم سب قطار میں کھڑے ہو جاؤ - شوکت! آؤ بیٹا تم بھی ہاتھ باندھ کر میرے پاس کھڑے رہو - میں آمین پڑھتا ہوں، بچو! تم سب ایک ساتھ آمین کہنا"

آمین

اعوذ باللہ من الشیطانی - بسم اللہ الرحمانی آمین

فرزند نیک نے اوی نامش بکو نہادی - این دم بکن تو شادی سبحان من یرانی - آمین

ختم قرآن نمودہ علم زمان ربودہ - فرحت بجاں رسیدہ " " " "

اے مادر رخجستہ بکشائے قفل بستہ - تشریف دہ دو دستہ " " " "

کچھ کھانڈ کچھ چھوارے آگے رکھو ہمارے - شاگرد کھاویں سارے " " " "

آمین تمام کردم انعام خواجہ بردم - حلوہ و شہد خوردم " " " "

لو بیٹے! اب ہاتھ کھول دو - خدا تمھاری عمر دراز کرے خوب لکھو اور پڑھو اور ہمیشہ اپنے ماں باپ اور استاد کا ادب کرو - آمین"

"آمین - آمین - آمین"

اب مولوی صاحب روزانہ جہاں آرا کو گھر پر قرآن شریف پڑھانے

www.bhatkallys.com

آتے ہیں اور شوکت ہر روز علی الصبح ملازم کے ہمراہ مدرسے جاتا ہے۔ اس مدرسے سے ملحق ایک مسجد بھی ہے۔ مسجد میں حوض، دالان، حجرے سب ہی کچھ ہیں۔ مولانا جلالی جمعہ کے جمعہ وعظ اور ہر روز دن کے بارہ بجے تک طلبہ کو درس دیتے ہیں۔ دوسرے اُستاد حافظ کمالی ہیں۔ یہ دونوں وقت بچوں کو صرف قاعدہ اور قرآن شریف، خالق باری، کریما، گلستاں اور بوستاں وغیرہ پڑھاتے ہیں۔

صبح کا وقت ہے، مدرسہ کھل چکا ہے۔ لڑکے باتیں چیتیں کرتے آگے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ آکر ٹاٹ کے فرش پر بیٹھتے ہیں۔ ٹاٹ میلا کچیلا ہے کہیں کہیں، ردی کاغذ کے ٹکڑے اور کہیں چنوں کے چھلکے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک کونے میں کسی کا بستہ پڑا ہے، دوسری طرف کسی کی رحل پڑی ہے۔ ایک شاگرد نے آتے ہی اُستاد کی مسند کو جھاڑ کر گدی کو بچھایا۔ گدی کے قریب بیٹھ کر اپنے سبق کا ورد کر رہا ہے۔

دو تین لڑکے لڑ رہے ہیں اور آپس میں خوب گڈ بڈ گڈ بڈ ہو رہے ہیں ایک دوسرے کو ڈانٹتے بھی جاتے ہیں۔

"چھوڑتا ہے یا نہیں؟ دیکھ مارتا ہوں، سچ کہتا ہوں پٹخ دوں گا۔"

"او مختار لیجو ذرا اس کے چٹکی"

"دیکھو میاں تم نہ بولنا نہیں تو کاٹ کھاؤں گا"

"ابے چل تو ہی سہی"

کوئی چیخ رہا ہے، کوئی تالیاں بجا رہا ہے۔ اتنے ہی میں حافظ کمالی

www.bhatkallys.com

تشریف لاتے ہیں، دُور ہی سے للکارتے ہیں:

"کیوں بے لڑ رہے ہو، اچھا بتاتا ہوں تم کو۔ حرام خور کہیں کے، چلو کھڑے ہو خالق باری کا ورد شروع کرو"

دونوں طرف لڑکے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ درمیان میں حافظ کمالی صاحب ٹہل رہے ہیں۔

"بولو پہلے کون شروع کرے گا؟"

"حافظ جی! میں"

"اچھا تو ہی پڑھ"

"خالق باری سرجن ہار
واحد، ایک، بدا کرتار
رسول، پیغمبر جان بسیٹھ
یار، دوست بولی جا ایٹھ
اسم اللہ، خدا، کا ناؤں
گرما دھوپ سایہ ہے چھاؤں"

"ممتاز! تو "بیا آدر نشیں بیٹھ" سے شروع کر"

"بیا آدر نشیں، بیٹھ بروُ جا!
ببیں، دیکھ، بدہ دے، بخور کھا
بسا بیس، بکش کھینچ، بچش، چاکھ
بزن مار، بدر پھاڑ، بنہ راکھ

www.bhatkallys.com

"پھر جھوٹ بولا"

"نہیں جی! سچ کہتا ہوں"

"اچھا، اچھا۔ گھر میں تو ہو گا، جا گھر جا، کہیو اُستاد جی اور مانگ رہے ہیں"

"بہت اچھا۔ حافظ جی آج عیدیاں بھی تو بٹیں گی کل شب برات ہے نا؟"

"ارے ہاں ہاں تُو جا تو سہی"

او مختار! تُو کیا کر رہا ہے۔ اِدھر آ اپنا سبق سُنا"

"حافظ جی! ذرا یاد کر لوں"

"درے آ درے میں یاد کراؤں۔ شیطان کہیں کا صبح آتے ہی لڑ رہا تھا، سُنا جلدی سُنا"

"ا پیش او۔ ب پیش بو۔ ت پیش تُو۔

"(مارتے ہوئے) یہ تو کا تُو کہاں سے بن گیا"

"(روتے اور چیخیتے ہوئے) اچھی حافظ جی! اچھی حافظ جی! اچھی، اچھی، اچھی"

"کہہ پھر کہہ ت پیش تو"

"ت پیش تُو"

"پھر وہی تُو تُو کیوں بے پھر وہی تُو تُو۔ ہاتھ ہٹا، میں کہتا ہوں، منہ پر سے ہاتھ نہیں ہٹاتا، اچھا تو اب لکڑی سے پٹ"

www.bhatkallys.com

گلو، حلق، دہن، منہ، سخن، بول
شکم، پیٹ، نظر، ڈیٹھ، دہل، ڈھول

"حافظ جی اب میں پڑھتا ہوں"

"کہاں سے پڑھے گا"

"اس کے بعد سے"

"نہیں نہیں تو آخر سے پڑھ"

"ہکہک، ہچکی، فاژہ، جماہی
خمیازہ، ہے انگڑائی
عطسہ، چھینک، آروغ ڈکار
محک، کسوٹی، جان عیار
آخر، انجام، ہے نیز تمام
اَنْتُ بات ہے ختم کلام
مولوی صاحب شُرَن پناہ
گدا، بھکاری، خسرو شاہ"

"اچھا بیٹھو۔ اب اپنا اپنا سبق سناؤ عابد! آ، پہلے تو سنا"

"بہت اچھا حافظ جی"

"ہوں ہوں شاباش شاباش ہوں ہوں

شاباش، کیوں رے تو آج دودھ نہیں لایا"

"حافظ جی! لایا تو تھا، راستے میں گر گیا"

www.bhatkallys.com

"حافظ جی! حافظ جی اَب کے ضرور یاد کر لوں گا۔ اَب کے یاد کر لوں گا۔ اَب کے یاد کر لوں گا۔"

"جا دفع ہو، کان پکڑ وہاں جا کر، اور ابھی یاد کر کے سُنا۔"

"السلام علیکم جناب حافظ صاحب!"

"وعلیکم السلام، آئیے آئیے شیخ صاحب! کہیئے کیسے آنا ہوا؟"

"حضرت! میں اِن برخوردار کو آپ کی خدمت میں بٹھانے لایا ہوں"

"اچھا یہ تمھارا بچہ ہے۔ آؤ صاحبزادے آؤ! کیا نام ہے میاں تمھارا؟"

"صادق"

"کیوں بیٹے تم نے اب تک کیا کیا پڑھا ہے۔"

"جی خالق باری۔ حمد باری۔ کریما۔ آمد نامہ۔ دستور صبیاں۔"

"خوب! اچھا کریما تو سناؤ۔"

"کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا
نداریم غیر از تو فریاد رس
توئی عاصیاں را خطا بخش و بس
نگہ دار ما را ز راہِ خطا!
خطا در گذار و صوابم نما"

"کچھ حمد باری بھی یاد ہے!"

"جی ہاں"

www.bhatkallys.com

"بتاؤ آسمانی چیزیں کون کون سی ہیں"

آسماں ہے چرخِ گردوں اور فلک
تارا اختر ہے، فرشتہ ہے مَلک
تارے جو پھرتے ہیں خود سیّارہ ہیں
اور ثوابت باقی اے مہ پارہ ہیں
جان سورج شمس، خورشید آفتاب
چاند ہے بدر و قمر، مہ، ماہتاب
جو ستارہ ٹوٹے جان اُس کو شہاب
برق بجلی اور بدلی ہے سحاب
غیث و باراں جان مینہ کیچڑ خلاب
ہے گرج رعد، اوس شبنم، پانی آب

"اچھا۔ اب چند انسانی اعضاء کے نام بیان کرو"

"روح جی ہے جسم تن کا نام ہے۔
ہے زباں جیب اور تالو کام ہے
چشم آنکھ، ابرو ہے بھوں رخسار گال
کھوپڑی ہے جمجمہ اور موئے بال
راس سر، ماتھا جبیں ہے کان گوش
منھ دہن ٹھوڑی ذقن کندھا ہے دوش"

"شاباش شاباش۔ بس بھئی اب تم کل سے گلستان شروع کردو"

www.bhatkallys.com

"جی ہاں" جب آپ توجہ فرمائیں گے تو کیوں نہ پڑھے گا اور اگر نہ پڑھے تو اس کا سارا گوشت و پوست آپ کا ہے اور صرف ہڈیاں میری ہیں۔"

"نہیں نہیں بھئی! تم بے فکر رہو انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"حافظ جی! مجھے اِس فقرے کی ترکیب تو بتا دیجئے؟"

"جملہ پڑھو"

"ضَرَبَ زَیدٌ عَمرًا"

"یہ بھی کچھ مشکل ہے۔ ارے اس میں زید فاعل ہے اور عمر مفعول۔"

"اے جی یہ تو مجھے بھی معلوم ہے"

"پھر کیا پوچھتا ہے؟"

"سوال یہ ہے کہ زید نے عمر کو کیوں مارا؟"

"بے وقوف! تو اتنی بات بھی نہیں سمجھتا، عبارت کی ترکیب بتانے کے لئے یہ جملہ بطور مثال پیش کیا گیا ہے، درحقیقت مارنے کا فعل واقع نہیں ہوا۔"

"حافظ جی کتاب میں تو یہی لکھا ہے"

"تو بھی کاٹ کا اُلو ہی ہے۔ ارے کم بخت زید اور عمر دونوں فرضی نام ہیں۔ زید نے عمر کو نہیں مارا نہ عمر کبھی زید سے پٹا۔"

"اے جی میں تو اب بھی نہیں سمجھا، آپ زید اور عمر کو بلا کر کیوں نہیں پوچھ لیتے۔"

www.bhatkallys.com

"جا جا تو پوچھتا پھر، جہنم میں جا میری طرف سے، خبطی کہیں کا۔"
"حافظ جی وہ عابد آگیا عابد۔"
"کیوں رے عیدی لینے کی تو اس قدر جلدی تھی اور دودھ اتنی دیر میں لایا ہے۔"
"حافظ جی پٹاخے چھوڑ رہا ہوگا پٹاخے، دیکھ لیجئے دو تین لڑیاں تو اب بھی اس کی جیب میں ہوں گی۔"
بھلا رے تو آتش بازی چھوڑتا ہے، دکھا تو اپنی جیب۔ یہ دیکھ نکلی نا۔ یہ لڑی، اور ایک یہ چھچھوندر بھی ہے، اچھی بات ہے تیری عیدی ضبط۔"
"ارے جی یہ تو سب میرے چھوٹے بھائی کی ہے۔"
"اچھا! لا پیسے دے عیدی کے اور خبردار جو تو نے آتش بازی چھوڑی اور تم سب بھی سن لو، اگر کسی نے ذرا بھی آتش بازی چھوڑی تو اچھا نہ ہوگا۔ جانتے بھی ہو، یہ سخت گناہ ہے۔ لو آؤ اپنی اپنی عیدیاں لو۔ لے بھئی عابد یہ اپنی عیدی لے۔"
"حافظ جی میں تو سُرخ رنگ کی لوں گا۔"
"بے وقوف سبز کیا بُری ہوتی ہے، لکھی ہوئی تو دونوں ریشمی کاغذ پر ہیں اور دیکھو اس کی بے ادبی نہ کرنا، اللہ کا نام لکھا ہے اس میں۔"
"ارے جی یہ عیدی ہے یا اللہ کا نام۔"
"ارے بے وقوف! یہ تمام قرآن شریف کے حروف ہیں، سلو

www.bhatkallys.com

میں پڑھ کر سُناتا ہوں:

عیش لیلیٰ و نہار دیکھو تم
زندگی کی بہار دیکھو تم
شب برات ہو عید ہو کہ بقر عید
ایسی خوشیاں ہزار دیکھو تم

لڑکے عیدیاں لے کر خوشی خوشی اپنے گھر جارہے ہیں" مولانا جلالی، بڑے مولوی صاحب مسجد کے دوسرے دالان میں ابھی پڑھا رہے ہیں۔ شاگرد ایک حلقے کی صورت میں بیٹھے، لکڑی کی تپائیوں پر کتابیں کھولے کہنیاں ٹکائے گردن جھکائے کتاب کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ کان اُستاد کی آواز پر لگے ہوئے ہیں۔ مولانا اپنی مسند پر بیٹھے ہیں۔ سر پر صافہ، بدن پر شیروانی نما نیچا کرتا، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ، لمبی سیاہ و سفید ڈاڑھی، اُلجھی ہوئی زلفیں، پیشانی پر نماز کے سجدوں کے نشان، مسند پر ایک طرف تسبیح اور رومال اور دوسری طرف چاندی کی سفید شام دار لکڑی، ہاتھ میں کتاب ہے، پڑھانے میں مشغول ہیں۔ بیچ میں ایک انگیٹھی رکھی ہے۔ کوئلے سُلگ رہے ہیں، کبھی کبھی کوئی اپنے ہاتھ سینک لیتا ہے

"خالد! اب تم دوسرا شعر پڑھو"

"تا مرا عشق تو تعلیم سخن گفتن کرد خلق را وردِ زباں مدحت و تحسین من است"

"حافظ شیرازی فرماتے ہیں کہ مجھے پہلے بات تک کرنی نہ آتی تھی لیکن تیرے عشق نے مجھ کو سخن گو بنادیا اور اب مقبولیت کا یہ عالم ہے

www.bhatkallys.com

کہ ہر کس و ناکس میری تعریف کرتا ہے۔"

"تو حضرت حافظ کا معلّم عشق ہوا۔"

"ہاں عاشقوں کا راہِ عشق میں عشق ہی معلّم ہوا کرتا ہے۔ ہاشم تم سُنتے ہو یا اُونگھ رہے ہو۔"

"نہیں تو حضرت! میں تو لفظِ معلّم پر غور کر رہا ہوں۔"

"معلّم کا مصدر علم ہے۔ معلّم اس کا اسم فاعل ہے، معنی علم سکھانے والا۔ اخوند۔ اُستاد۔ ادیب۔ گرو۔ پاٹک۔ پنڈت۔ پانڈا۔ مُلّا۔ مُنشی۔ مدرّس۔ اتالیق وغیرہ۔

"بہت خوب حضرت! بہت خوب!!"

"کیوں جعفر کیا بات ہے تم آج بالکل چُپ ہو۔"

"میں چُپ ہی اچھا ہوں جی۔ سکندر نامے میں بھی یہی لکھا ہے۔ کل ہی تو پڑھا تھا کہ

"سخن تا نہ پُرسند لب بستہ دار
گہر نشکنی تیشہ آہستہ دار
نہ پرسیدہ ہر کو سخن یاد کرد
ہمہ گفتہ خویش برباد کرد۔"

"بدتمیز! تجھے گفتگو کا بھی سلیقہ نہیں پھر عربی فارسی پڑھنے سے کیا فائدہ؟"

"تو اور کیا کروں جی؟"

www.bhatkallys.com

"نالائق! تجھ کو یوں کہنا چاہیئے تھا۔ سُن! حضور والا! عرض یہ ہے کہ کل سکندر نامے کے سبق میں میں نے یہ اشعار پڑھے تھے۔ اس سے فدوی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان جو کچھ عقل و شعور کی باتیں سیکھتا ہے اُس کا ذریعہ کان ہیں لیکن لبوں سے جو سخن نکلتا ہے اُس سے دوسرے مستفید ہوتے ہیں۔ یاد رکھو الفاظ ہمیشہ فصیح و بلیغ ہونے چاہئیں۔ خالد! اچھا بھئی پڑھو، ہاں! تم کیا پڑھ رہے تھے؟"

"جناب والا! کل اسی سکندر نامے کے سبق میں وہ "ذوالقرنین" کی تشریح رہ گئی تھی۔ اس وقت مناسب سمجھیں تو اُسے بھی واضح فرمادیں۔"

"ہاں سُنو۔ ذوالقرنین اصل میں سکندر بادشاہ ہی کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت سکندر بادشاہ پیدا ہوا تو مریخ اور مشتری یہ دونوں ستارے ایک ہی مقام پر تھے اور نجومیوں کے نزدیک ان دونوں ستاروں کا پاس پاس ہونا قرن السعدین ہے۔ یعنی اُس وقت جو پیدا ہوگا وہ بڑا ہو کر بادشاہ ہوگا۔ چنانچہ سکندر بادشاہ ہوا۔ اچھا! اب سنو قرن کے معنی سینگ کے ہیں اور ذو صیغہ تثنیہ ہے یعنی دو سینگ۔ چونکہ سکندر بادشاہ کے تاج میں دو کلغیاں تھیں اس لئے عام لوگوں نے اس سے یہ حکایت وضع کر دی کہ سکندر کے سر پر دو سینگ تھے اور وہ دو سینگوں والا بادشاہ تھا۔ کیوں ہاشم کچھ سُنا تم نے؟"

"پیرو مرشد! میں بھی کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور پوچھو۔"

www.bhatkallys.com

"جناب مجھے حضرت سعدی علیہ رحمۃ کے اس شعر کی صحت میں کچھ شک ہے۔"

"اچھا! وہ کون سا شعر ہے؟"

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

'حالِ ما' کے ساتھ "ہستم" قواعد کے لحاظ سے کچھ غلط معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ کیا گستاخی ہے، تو اپنے آپ کو اُستاد سمجھتا ہے؟"

اوبے تمیز تو نے سنا نہیں 'خطائے بزرگاں گرفتن خطا است'

در شعر سہ تن پیمبر انند
ہر چند کہ لانبی بعدی
اوصاف و قصیدہ و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

خبردار جو آیندہ استاد کے کلام میں کوئی غلطی نکالی۔"

"مکرم، مکرم، معظم، معظم"

"کیوں کیوں جعفر! خیر تو ہے!"

"مکرم، معظم، محترم، حضرت قبلہ و کعبہ جناب اُستاد صاحب عرض پرداز ہوں کہ ایک اخگر ناہنجار، مجمرِ آتش بار سے ناگہاں پرواز کرکے حضور پُر نور فیض گنجور کی دستار فضیلت آثار کے ایک گوشے میں مخفی ہو کر

www.bhatkallys.com

اُسے جلانے اور خاکستر بنانے میں معروف ہے۔"

"اُف اُف لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ کم بخت صرف اتنا کہہ دیتا کہ دستار جل رہی ہے۔"

"واہ حضرت واہ! آپ ہی نے تو فرمایا تھا کہ آدمی کم بولے اور جب بولے تو بات معقول اور الفاظ فصیح و بلیغ ہونے چاہئیں۔"

"(تمام طلبا، ر) حضرت دستار اُتار ڈالیے، اسے پھینک دیجیے۔"

"ہاں ہاں! اسے پھینک دیجیے۔"

"آپ کا سر تو نہیں جلا، خیریت ہے!"

"نہیں نہیں! اسے ہاتھ سے نہ بجھائیے لائیے میں حوض میں ڈبو لاؤں۔"

"ارے وہ مُلّا جی بدھنی میں پانی لا رہے ہیں، لاؤ لاؤ جلدی لاؤ۔"

"لیجیے لیجیے یہ پانی لیجیے۔"

"افسوس! (بہ ادنیٰ التصرف)

"گر ہمیں مکتب و ہمیں طلبہ

کارِ مُلّا تمام خواہد شد"

www.bhatkallys.com

دِلّی کی عید

چاند رات ہے، شہر دہلی میں جامع مسجد سے نمازی مغرب کی نماز پڑھ پڑھ کے کچھ اوپر برج پر اور بہت سے دروازے کے باہر سیڑھیوں پر کھڑے ہیں۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ سب کی نگاہیں آسمان کی طرف ہیں۔ ہر ایک کو چاند کی جستجو ہے۔ اے لو! وہ چاند دکھائی دیا۔ دیکھنا کیسا شور ہو رہا ہے:

"چاند ہو گیا، چاند ہو گیا"

"کہاں ہے بھئی، کہاں؟ ذرا ہمیں بھی تو دکھاؤ"

"وہ ہے وہ اُس مکان کے بائیں طرف کبوتروں کی چھتری کے اوپر دیکھو"

"ہاں، ہاں نظر آیا۔ اُفوہ، بھئی بڑا باریک ہے، اُنتیس کا ہے نا"

"مبارک ہو، مبارک ہو"

"آپ کو بھی مبارک ہو"

بچّے بھی خوشی سے بے تحاشا چیخ رہے ہیں:

"اہاہا! چاند ہو گیا، اہاہا چاند ہو گیا، کل عید ہے"

www.bhatkallys.com

ابھی تک نقارے کی آواز سُنائی نہیں دی۔ تو ہیں، ابھی نہیں چلیں۔ شاید بادشاہ سلامت نے ابھی تک چاند نہیں دیکھا۔ ادھر دیکھئے لال قلعے میں جہاں پناہ دیوانِ عام کی چھت پر تشریف فرما ہیں۔ اُستاد ذوقؔ اور چند خاص مصاحب بھی خدمت میں حاضر ہیں اور چاند دیکھنے میں محو ہیں۔ اُمرا ابھی بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں بلکہ استاد ذوقؔ نے تو شاید دیکھ بھی لیا ہے، لیکن جب تک بادشاہ سلامت چاند نہ دیکھ لیں، شاہی ادب کے سبب وہ کیونکر یہ کہیں کہ چاند ہو گیا۔ لیجیے! وہ بادشاہ سلامت نے بھی چاند دیکھ لیا۔ ایک دفعہ ہی جوشِ مسرت کے ساتھ فرمایا۔

"وہ دیکھو اُس اونچے درخت کی چوٹی پر چاند نظر آتا ہے۔"

سب اُس طرف متوجہ ہیں اور گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں یکایک اُستاد ذوقؔ اُچھل کر کہتے ہیں:

"ہاں حضور دیکھ لیا، وہ ہے سامنے، ظلِّ سُبحانی کی نظرِ مبارک کے پرتو سے فدوی نے بھی دیکھ لیا۔"

یہ کہہ کر چند قدم پیچھے ہٹتے ہیں اور جھک کر سات سلام بادشاہ کو عید کی تہنیت میں ادا کرتے ہیں۔ پھر رومال میں نذر رکھ کر مودبانہ پیش کرتے ہیں۔ مصاحبین موقع پا کر اُستاد ذوقؔ پر چوٹ کرنا چاہتے ہیں:

"کیوں اُستاد! یہ نذر کا کون سا وقت ہے؟"

www.bhatkallys.com

"ہاں ہاں کل عید کے دربار ہی میں پیش کرنا۔"

"نہیں حضور، یہ تو ابھی قبول ہو جائے ہماری عید تو جہاں پناہ کے دم سے ہے، چاند ہو یا نہ ہو جب اپنے آقا اور ولی نعمت کو دیکھ لیا تو چاند بھی ہو گیا اور عید بھی۔"

"بہت خوب! اچھا اچھا قبول!!"

"مصاحبین اپنا سا منھ لے کر رہ جاتے ہیں۔ اتنے میں ایک سانڈنی سوار ہانپتا کانپتا خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ قدم بوسی کے بعد دست بستہ عرض کرتا ہے:

"خداوند نعمت کو عید مبارک ہو، یہ غلام چاند کی نوید لایا ہے۔"

"شاباش! تم سب سے پہلے چاند کی خوش خبری لائے ہو۔ اچھا اپنا انعام لے لو اور بھی انعام واکرام تقسیم ہو جائیں اور ہاں ہماری رعیت کو بھی عید کی خبر ہوئی یا نہیں"

"کیوں نہیں جہاں پناہ! نوبت خانے سے نفیری کی آواز بلند ہو رہی ہے، وہ دیکھئے توپیں بھی تو چل رہی ہیں۔"

جہاں پناہ محل میں تشریف لائے ہیں۔ شہزادیاں اور بہو رانیاں چاند کا آداب بجا لا رہی ہیں۔ فوجدار خاں فیل خانے کا داروغہ حاضر خدمت ہوتا ہے۔ "مولا بخش" ہاتھی کو رنگنے کا حکم صادر فرماتے ہیں۔ تنبو ڈیرے۔ فرش، فروش عید گاہ بھیجا جا رہا ہے۔

شہر میں نقارے کی آواز اور توپوں کی دھوں دھاں نے گھر گھر

www.bhatkallys.com

چاند کا اعلان کر دیا ہے۔ ہر گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ کیا چھوٹا اور کیا بڑا ہر ایک عید کی تیاری میں مصروف ہے۔ خرید و فروخت کا بازار گرم ہے۔ بھیڑ اس قدر ہے کہ راستہ چلنا اور سودا خریدنا دشوار ہے۔ یہ کلاہ فروش کی دوکان ہے۔ خریداروں کا ہجوم ہے۔ کوئی دوپلڑی، کوئی چوگوشی اور کوئی مغلئی ٹوپی خرید رہا ہے۔ کوئی مندیل پسند کرتا ہے تو کوئی بنارسی دوپٹہ اور کوئی گوٹے دار پگڑی۔ گندھی کی بکری بھی خوب ہو رہی ہے۔ لوگ دھڑا دھڑ عطر، تیل، مسّی اور مہندی خرید خرید کر لے جا رہے ہیں۔ گندھی کی دکان کے نیچے سڑک کے کنارے دو پھول والے پھولوں کا چھبہ لگائے پھول پھیلائے کنٹھے بنانے میں مصروف ہیں۔ پھولوں کی خوشبو سے سارا بازار مہک رہا ہے۔ ان کے چاروں طرف پھولوں کے عاشق اور کنٹھوں کے شوقین کھڑے ہیں کہ کب کنٹھا تیار ہو اور ہم خریدیں۔ دونوں پھول والے کنٹھے بناتے اور باری باری لہک لہک کر آواز بھی لگاتے جاتے ہیں:

"لو کٹورے موتیا، میاں لو کٹورے موتیا، کیا لپٹیں آ رہی ہیں

چنبیلی میں، کیا بہار ہے زرد چنبیلی میں"

منہیار کی دکان بھی عطر والے کی دکان سے تھوڑی ہی دور آگے ہے، طرح طرح کے رنگین اور جڑاؤ چوڑیوں کے گچھے اور لاکھ کے جوڑے چراغ کی روشنی میں پڑے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور لوگ جلدی جلدی اس طرح خرید رہے ہیں گویا وہ ہیرے اور یاقوت کی نگیں

www.bhatkallys.com

ہیں کہ پھر کبھی نہ ملیں گی۔ جوتے والے کی دکان پر یوں تو ہر قسم کے گھٹیا اور بڑھیا جوتوں کے جوڑے موجود ہیں لیکن لمبے پنجے کی کام دار سلیم شاہی جوتی کے مقابلے میں گول پنجے کی جوتی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ جسے دیکھو وہ سلیم شاہی خرید رہا ہے۔ درزیوں کی دکانوں اور دھوبیوں کے گھروں پر بھی لوگ گھڑی گھڑی آجا رہے ہیں ایک سے ایک بڑھ کر کڑا تقاضا کر رہا ہے اور وہ ہیں کہ نرمی اور خوشامد سے باتیں ملا کر ٹھٹا کر رہے ہیں:

"سرکار گھبرایئے نہیں برس دن پیچھے تو آپ کو ستانے اور انعام لینے کا موقعہ ملا ہے"۔

"حضور! ذرا دم لیجئے، استری کر رہا ہوں ساتھ ہی لیتے جایئے گا"۔

"میر صاحب! آپ بے فکر رہیں، آپ کی شیروانی میں صرف بٹن لگانے باقی ہیں۔ بچوں کی اچکنیں رات کو سی کر اٹھوں گا۔ خدا نے چاہا تو صبح نماز سے پہلے یہ سب کپڑے آپ کے گھر پر ہوں گے۔ لیکن حضور میری عیدی نہ بھولیے گا آپ کے دم سے بچے عید منا لیتے ہیں۔ خدا حضور کو سلامت رکھے"۔

لوگ عید کا ضروری سامان لے کر اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے ہیں۔ تکیوں میں ہٹے کٹے موٹے مسٹنڈے بے نوا آزاد خمرے، رسول شاہی چار ابرو کی صفائی کیے اپنی اپنی صدا لگانے میں مصروف ہیں:

www.bhatkallys.com

"یا در ب کی اور خیر سب کی، یہاں دے اور وہاں لے۔ تیرے آگے کی بھی خیر، تیرے پیچھے کی بھی خیر"

"مائی آج دے کل لے، سائیں بابا کا سوال پورا کر دے۔ مولا کے شیر میری ہانڈی بھر دے۔ اللہ کے شیر میری ہانڈی بھر دے"

وہ دیکھیے ایک صاحب اپنے بال بچوں کو لئے گلی میں داخل ہوئے فقیر نے صورت دیکھتے ہی پیسے مانگنے کے لئے دعائیں دینی شروع کیں۔

"الٰہی نواب صاحب کی خیر ہو، حویلیاں آباد رہیں دعائیں دیں گے سائیں بابا"

"خدا نواب صاحب کو ہر سال عید منانی نصیب کرے، لا بابا کچھ راہِ خدا دے جا، بھلا کر بھلا ہو گا"

گھر میں عید کی جو خوشی بچوں کو ہے اتنی کسی کو بھی نہیں، ایک ایک کو اپنی ٹوپیاں اور جوتیاں دکھاتے اور بغل میں لئے اچھلتے پھرتے ہیں۔ آتے دیکھیے، وہ اپنی جوتی سرہانے ہی رکھے سو رہا ہے۔ لڑکیاں اپنے گوٹے کناری کے کپڑے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔ کھانا پینا سب بھولی ہوئی ہیں۔ بچیاں مہندی کی رکابی لئے بڑی بہن کے سر پر سوار ہیں، مہندی لگانے کا تقاضا ہو رہا ہے:

"اچھی آپا! مہندی لگا دو"

"تم اتنے کھانا تو کھا آؤ، میں یہ ستارے ذرا اپنے دوپٹے میں ٹانک لوں پھر تمہارے مہندی لگا دوں گی، جاؤ شاباش شاباش!

www.bhatkallys.com

میری ننھّی"

"نہیں نہیں۔ ... مہندی باجی جان پہلے ہمارے مہندی لگادو۔"

ماں نے جوں توں کر کے بچوں کے کام سے فراغت پائی ہے۔ اب میاں کے کام کاج کی فکر ہے۔ سوئیاں اور رکھا نڈ نکال کر ایک طرف رکھی ہے۔ دودھ میں چھوارے بھگو رہی ہے تاکہ صبح تک شیر خرما تیار ہو جائے۔

لیجئے وہ پو پھٹی۔ صبح کے چار بج گئے۔ اے لو وہ توپ بھی چل گئی۔ تمام خلقت جاگ اٹھی۔ کیا امیر اور کیا غریب، کیا بڑا اور کیا چھوٹا ہر ایک نہلانے دھونے میں مصروف ہے۔ خدا نے جس کو جتنا دیا ہے اور جو بڑھیا گھٹیا لباس جسے میسر ہے، وہ اسی کو ہنسی خوشی پہن رہا ہے۔ بچے اپنے ریشمی جوڑے پہنے دولہا دلہن بنے الگ اکڑے اکڑے پھر رہے ہیں۔ عورتیں صدقۂ فطر تقسیم کرنے میں مشغول ہیں۔ شیر خرما اور سوئیوں کی چکھا چکھی ہو رہی ہے۔

قلعے میں عالم پناہ بھی بیدار ہیں۔ اوّل حمام فرمایا۔ پوشاک بدلی۔ پھر جواہر خانے میں تشریف لائے۔ فرقِ مبارک پر تاج شاہی رکھا۔ گلے میں موتیوں کا ہار پہنا۔ خاصہ برداروں نے دسترخوان پر سوئیاں، دودھ اولے، بتاشے، چھوارے، خشکہ اور کھڑی مسور کی دال لگائی۔ بادشاہ سلامت نے پہلے نیاز دی۔ اس کے بعد تھوڑا سا منھ میٹھا کیا۔ پھر پان نوش فرما کر باہر برآمد ہوئے۔ جسولینی نے خبرداری اور امان پکاری:

www.bhatkallys.com

"اللہ رسول خبردار۔ بادشاہ سلامت جہاں پناہ!"

چوب دار عصا سنبھال کر دست بستہ آگے چل رہا ہے۔ ہر قدم پر آواز لگاتا ہے:

"ادب ہشیار! ادب ہشیار، باادب باملاحظہ ہشیار"

نمبچی نفیری بجا رہے ہیں۔

سواری کا حکم ہو رہا ہے۔ جلوس قاعدے سے کھڑا ہے۔ فوج دام خاں ہاتھی لگا رہے ہیں۔ کہاروں نے ہوادار پیش کیا۔ جہاں پناہ ہوادار میں بیٹھ کر دیوان عام میں تشریف لائے۔ وہاں سے ہاتھی پر سوار ہوئے۔ اکیس توپیں سلامی کی چھوٹیں۔ پھر قلعے کے دروازے پر فوج نے سلامی دی۔ اب آگے پیچھے فوج ہے، بیچ میں جہاں پناہ کی سواری ہے۔ پالکی میں ولی عہد بہادر اور گھوڑوں پر اُمرا سوار ہیں۔ باجا بج رہا ہے۔ پیش خواص آواز لگا رہا ہے:

"اقبال زیادہ، بڑھو آگے بڑھو"

نقیب اور چوب دار چیخ رہے ہیں:

"قدم ہشیار، نگاہ رُوبرو، بادشاہ سلامت جہاں پناہ"

جلوس اس وقت چاندنی چوک میں ہے۔ سڑک کے دونوں طرف کی تمام چھتیں شہر کی بہو بیٹیوں سے بھری ہیں۔ کہیں چلمنیں پڑی ہیں۔ کہیں چادریں تنی ہیں۔ شاہی سواری دیکھی جا رہی ہے۔ لوگ جھک جھک کر آداب اور مجرے بجا لا رہے ہیں۔ بادشاہ آنکھوں اور گردن کے

www.bhatkallys.com

اشارے سے سب کا مجرا لیتے جاتے ہیں ۔ کڑکیت کڑکا کہتے اور چوب دار للکارتے چلتے ہیں :

"ملاحظہ ادب سے کرو ، مجرا جہاں پناہ ! بادشاہ سلامت !"

رعیت بھی بادشاہ کے ساتھ ساتھ خوشی خوشی عیدگاہ جا رہی ہے ۔ بعض گھوڑوں پر سوار ہیں ۔ بعض کہار بردوش پالکی میں چلے آتے ہیں ۔ کوئی رتھ میں بیٹھا ہے تو کوئی بہلی اور منجھولی میں ۔ کسی کے پاس ہوادار ہے اور کسی کے پاس شکرم ۔ بہت سے غریب بندگان خدا پیدل ہی جا رہے ہیں ۔ بعض کثیر الاولاد مامتا کے مارے اپنے بچوں کو کندھوں پر لادے ، گودیوں میں چڑھائے ہانپتے کانپتے چلے جا رہے ہیں ۔ لو ! وہ سواری عیدگاہ کے دروازے پر پہنچی ۔ بادشاہ کی آمد آمد کی توپیں چھوٹ رہی ہیں ۔ جلوس اس وقت دو طرفہ کھڑا ہے ۔ جہاں پناہ شاہی ہاتھی سے نیچے اترتے ہیں عیدگاہ میں داخل ہو کر شاہی خیمے میں تشریف لاتے ہیں ۔ امام کے پیچھے بادشاہ کا مصلیٰ ہے ۔ بائیں طرف ولی عہد کا ، دائیں طرف اور شہزادوں کے ۔ دوسری صف میں امراء و مصاحبوں کے ہیں ، سب اپنے اپنے مصلّوں پر کھڑے ہیں ۔ نمازی اپنی اپنی صفیں درست کر رہے ہیں :

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

امام جی کے ساتھ سب نے نیت باندھی ۔ کہیں کہیں کسی صف میں بیمار نمازی کھانس رہے ہیں ۔ بے خبر معصوم بچے بلک بلک کر رو دیتے

www.bhatkallys.com

ہیں۔ نماز ختم ہوئی۔ بادشاہ ولی عہد اور شاہزادے اپنے اپنے مصلّوں پر بدستور بیٹھے ہیں۔ امام جی کو خطبے کا حکم ہوا۔ خطبے کی توپ چلی توشہ خانے کا داروغہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ امام جی کے گلے میں کلابتونی پرتلا اور تلوار ڈالی امام جی ممبر پر گئے۔ تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ خطبے میں بادشاہ سلامت کا نام آتے ہی توشہ خانے کے داروغہ نے امام جی کو خلعت پہنایا۔ بنارسی دوپٹہ کمر سے باندھا، پانچ سو روپے نقد عیدی کے عطا ہوئے۔ حاضرین نے بادشاہ سلامت کے نام پر آمین آمین کہا۔ خطبہ ختم ہوتے ہی امام جی کے ساتھ مل کر بادشاہ اور تمام نمازیوں نے دُعا مانگی۔ نماز ختم ہونے کی توپیں چلیں۔ عزیز، دوست اور اقربا آپس میں گلے ملے۔ ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دی۔

اب دھوپ چڑھ چلی ہے۔ بادشاہ کا جلوس جس شان و شوکت سے عیدگاہ آیا تھا اسی دھوم دھام کے ساتھ قلعہ معلّٰی کو واپس ہو رہا ہے رعیت بھی اپنے گھر لوٹ رہی ہے۔ چلتے ہوئے کوئی اپنے بچوں کو کھلونے دلوا رہا ہے۔ کوئی حلوائی سے مٹھائی خرید رہا ہے۔ کوئی پھل والے کی دکان پر کھڑا پھل خریدنے میں مصروف ہے۔ گھر میں گھر والی کپڑے اور زیور پہنے بیگم بنی گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہے۔ ہاتھ میں سروتا ہے۔ آہستہ آہستہ چھالیہ کتر رہی ہے۔ شوہر اور بچوں کا انتظار ہے۔ لیجیے وہ سامنے سے گھر والے بھی چلے آتے ہیں۔ میاں کے دونوں ہاتھوں میں مٹھائی کی ٹوکریاں اور پھل ہیں اور بچوں کے ہاتھوں میں طرح طرح کے کھلونے

www.bhatkallys.com

غرض سب لدے پھندے کھیلتے کھلاتے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر والی میاں کو جھک کر عید کا آداب بجالائی اور مبارک باد پیش کی۔ بچوں نے اپنی ماں اور بڑی بہن کو سلام کیا۔ گلے لگ کر عید ملی۔ کھانے کا دسترخوان بچھا۔ ہنستے بولتے سب نے مل کر پہلے کچھ کھانا کھایا پھر جی بھر کر مٹھائی اور پھل۔ کھانے پینے سے فراغت پاکر عیدیوں کا لین دین شروع ہوا۔ عزیز، دوست اور رشتے دار ایک دوسرے کے گھر عید ملنے کے لئے آجا رہے ہیں۔ نوعمر لڑکے دو منزلہ اور سہ منزلہ مکانوں کی اونچی نیچی چھتوں پر پتنگ بازی میں مصروف ہیں۔ بگلا۔ گل چڑا۔ دو پلکا۔ دو پنا۔ گل دُمہ۔ کانڑا۔ گل سری گل دُمی۔ کلیجہ جلی۔ دو باز۔ پریوں دار۔ آلفی۔ تکلیں۔ ایک بلّی۔ دو بلّی۔ بتلّی۔ چو بلّی۔ ڈور پر بڑھ رہی ہیں۔ بچے بالے۔ پیپل، ڈھیلچیل، دم چیل کنکوے معمولی ڈور پر مانجھا سوت کر اُڑا رہے ہیں۔ دبا دب پیچ پر پیچ ہو رہے ہیں۔ کسی کا پتنگ چکرا رہا ہے تو کسی کا کنّی کھا رہا ہے۔ کسی کی ڈال چھتو ہو گئی ہے۔ کوئی ڈھیل دے رہا ہے۔ کوئی ٹھمکیاں لگا رہا ہے۔ کوئی کھچائی میں مصروف ہے۔ کسی کا کھٹکی لگ جانے سے ہتے پر سے اُکھڑ گیا ہے۔ کوئی اچم کر کے زبردستی گرانا چاہتا ہے اور جس غریب کا کٹ گیا، اُس کی "وہ کاٹا وہ کاٹا بے وہ کاٹا، پیری ہے بے پیری کہہ کر" ہیٹی کی جا رہی ہے۔

لیجئے وہ بادشاہ سلامت کی سواری قلعہ معلیٰ میں داخل ہوئی جہاں پناہ دیوانِ خاص میں تختِ شاہی پر دربار فرما رہے ہیں۔ ولی عہد، شہزادگان

www.bhatkallys.com

اور تمام امراء، وزراء، علماء، مشائخ اور شعراء دربار میں حاضر ہیں۔ سب سے پہلے ولی عہد نذر کے لیے آگے بڑھے۔ نقیب پکارا:

"جہاں پناہ، بادشاہ سلامت! عالم پناہ بادشاہ سلامت! جہاں ظل بادشاہ سلامت!" اب باری باری شہزادگان، امراء و وزراء اپنے اپنے رتبے کے مطابق نذریں دے رہے ہیں۔ بادشاہ سلامت خلعت، پھولوں کے طرّے اور ہار مرحمت فرما رہے ہیں۔ بارہ بجے کی توپ چلتے ہی حضور اٹھ کھڑے ہوئے۔ محل تشریف لے جا رہے ہیں جسو لینی آواز لگا رہی ہے:

"خبردار۔ پیر و مرشد، حضور عالی، بادشاہ سلامت! عمر دراز" تمام بیگمات تعظیم کے لئے سروقد کھڑی ہیں۔ بادشاہ اندر تشریف لا کر تخت شاہی پر بیٹھے۔ تخت کے برابر ملکہ معظمہ کی مسند ہے۔ خواجہ سرا مورچھل کر رہے ہیں۔ تمام بیگمات اور شہزادیاں اپنے اپنے رتبے کے مطابق بادشاہ اور ملکہ کو نذریں دے رہی ہیں۔ بادشاہ اور ملکہ سب کو درجہ بدرجہ خلعت عطا فرما رہے ہیں۔

زنانہ دربار ختم ہوا۔ کھانا تناول کرنے کا وقت ہے۔ خاصے والیوں نے پہلے ایک سات گز لمبا، تین گز چوڑا چمڑا بچھایا۔ چمڑے پر ایک سفید دسترخوان۔ اس دسترخوان کے بالکل بیچ میں دو گز لمبی ڈیڑھ گز چکلی چھ گرہ اونچی چوکی رکھی۔ پھر چوکی پر از سر نو ایک اور چمڑا اور سفید دسترخوان بچھا کر طرح طرح کے بے شمار کھانوں کو جو بھر گئے ہوئے

www.bhatkallys.com

خوانوں میں رکھے ہوئے بھتے دستر خوان پر چُنے - کھانوں پر سونے چاندی کے ورق چمک رہے ہیں - مُشک، زعفران، عنبر، گلاب اور کیوڑہ چھڑکا جا رہا ہے - جہاں پناہ نے بسم اللہ فرما کر لقمہ اُٹھایا - اِدہر لقمہ اٹھایا اُدہر چوب دار پکارا - "خاصہ مبارک"

چوب دار کی آواز محل کے باہر نقارچی نے سن کر فوراً نقارے پر چوٹ ماری، دیگوں کے منھ کھل گئے - بھوکی رعیت عید کے کھانوں پر ٹوٹ پڑی، لیکن کھلانے والوں نے بھی اس طرح کھلایا کہ کھانے والوں کے جی بھر گئے - خوب سیر ہو کر اُٹھے اور بادشاہ کی جان و مال کو دُعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئے جہاں پناہ بھی کھانا نوش فرما کر آرام گاہ تشریف لے گئے -

آج قلعے کے باغ میں مینا بازار لگا ہے - ملکۂ عالم شہزادیوں، بیگموں اور شاہی خاندان کی بیویوں کے ہمراہ مینا بازار کی سیر میں مصروف ہیں - باری باری ہر ایک کی دُکان پر جاتی ہیں - جو چیز پسند آتی ہے اصل قیمت کی بجائے سیکڑوں اور ہزاروں میں خرید لی جاتی ہے - بیچنے والی نہال اور اس کا سارا خاندان ایک مدت کے لئے فارغ البال ہو جاتا ہے -

رات کا منظر اور خوشیاں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں - قلعہ اپنی آرائش و زیبائش میں جوبھتی کی دُلہن بنا ہوا ہے - ہر طرف نور ہی نور برس رہا ہے - رات پر دن کا شبہ ہوتا ہے - شہزادے اور

www.bhatkallys.com

شہزادیوں کے زربفت اور کمخواب کے لباس قندیلوں اور قمقموں کی روشنی میں جھلملا رہے ہیں۔ ڈومنیوں کا ایک طائفہ ولایت توران سے آیا ہوا ہے۔ دوسرا طائفہ دِلّی کے مشہور تان رس خاں کی چوکی کا ہے۔ دونوں طائفے محل میں حاضر ہیں۔ پہلے تورانی طائفے کو اشارہ مرحمت ہوا۔ سازندوں نے پسِ پردہ اپنے ارغنون اور چنگ و رباب کو چھیڑا۔ ڈومنی نے کھڑے ہو کر حضرت خسرو علیہ رحمۃ کی یہ رباعی پڑھی:

عید گارہ ماغریباں کوئے تو　　انبساطِ عید دیدن روئے تو

صد ہزاراں ماہ قربانت کنم　　اے ہلالِ عید بر ابروئے تو

اس کے بعد تان رس خاں کی چوکی کو حکم ملا۔ سازندے جو قنات کے پیچھے تیار کھڑے تھے فوراً طبلے سارنگی اور تال کی جوڑی کو بجانے لگے۔ رقاصہ ایک دل فریب انداز سے اٹھی اور آداب و مجرا بجا لاتی ہوئی ملکہ کے روبرو کھڑے ہو کر عمر خیام کی اس رباعی کو پہلے گا کر سنایا۔

جانا بہ کدام دست برخاستہ　　کز طلعتِ خویش ماہ را کاستہ

خوبانِ جہاں بعید رُو آرایند　　تو عید بروئے خویش آراستہ

پھر نرت کے ذریعہ اس حسن و خوبی سے ادا کیا کہ کمالاتِ نرت کے سامنے تمام ساز پھیکا پڑ گیا۔ ملکۂ عالم دونوں طائفوں کو زر و جواہر دے کر مالا مال کر رہی ہیں۔

دوسری طرف جہاں پناہ کی خدمت میں اُستاد ذوق، حضرت غالب اور چند دوسرے شعرا حاضر ہیں۔ مشاعرے کی محفل گرم ہے۔ شعرا

www.bhatkallys.com

اپنا اپنا کلام سُنا کر دادِ سخن حاصل کر رہے ہیں۔ لیجئے وہ غالبؔ نے اپنا قصیدہ پڑھنا شروع کیا:

قصیدہ

ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام — جس کو جھُک کے تو کر رہا ہے سلام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن — نامِ شاہنشاہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دِل بہادر شاہ — مظہرِ ذوالجلال والاکرام
کاتبِ حُکم نے بموجبِ حکم — اِس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز — ہو ابد تک رسائیِ انجام

جہاں پناہ مسکرا رہے ہیں۔ ذوقؔ کی طرف دیکھ کر فرماتے ہیں "اُستاد کچھ آپ بھی۔"

ذوقؔ دست بستہ کہتے ہیں۔ "پیر و مرشد! درست، عرض کرتا ہوں۔"

قصیدہ

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی — برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ہلال ابروئے پُرخم سے اشارہ — ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتیِ طلائی
شاہا ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق — عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی
دیتا ہے دُعا ذوقؔ کہ مضمونِ ثنا میں — ہے ذہنِ رسا کو یہ کہاں اس کے رسائی

ہر سال شہا ہو وے مبارک یہ تجھے عید
تو مسندِ شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

www.bhatkallys.com

دِلّی کی شادی

نِسبت

زماں خاں۔ شاید ثریا کے لیے اتنے پیام تمھارے پاس نہ آئے ہوں گے، جتنے تقاضے تم اُس کی شادی کے متعلق مجھ سے کرچکی ہو۔ آخر ایسی جلدی کیا ہے؟ پندرہ برس کی تو ہے۔ تم کو ابھی سے بھاری معلوم ہونے لگی۔

اشرف بیگم۔ تو کیا وہ عمر بھر کنواری بالی ہی رہے گی۔ خدا رکھے ہے تو پندرہ ہی برس کی لیکن اُس کا اُٹھان ماشاء اللہ ایسا ہے کہ وہ اس وقت پوری عورت معلوم ہوتی ہے۔

زماں خاں۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے اور مجھے اس کی شادی کرنے سے بھی کوئی انکار نہیں، میرا مطلب تو یہ تھا کہ پنشن میں اب صرف ایک سال باقی ہے۔ میں ملازمت سے فارغ ہو کر گھر آجاؤں تو اطمینان سے شادی کی فکر کروں۔

اشرف بیگم۔ اونہہ! اطمینان اور سکون تو انسان کو مرتے دم تک حاصل

www.bhatkallys.com

نہیں ہوتا، رہی پنشن وہ ہوتی رہے گی۔

زماں خاں۔ تو کیا چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کرنے کا ارادہ ہے؟

اشرف بیگم۔ ہاں، اچھے لڑکے کنوارے نہیں بیٹھے رہتے۔

زماں خاں۔ تو کیا لڑکی بیٹھی رہتی ہے؟

اشرف بیگم۔ تم تو اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کل جو رقیہ مغلانی لائی ہے وہ مرزا ہمایوں کے بیٹے اختر کا ہے میرے خیال میں بات اچھی ہے۔ اگر اس کو منظور نہ کیا تو ممکن ہے پھر ایک سال بعد ایسا پیام نہ ملے۔

زماں خاں۔ تو اس بات میں خوبی کیا ہے؟

اشرف بیگم۔ یہی کہ مرزا ہمایوں کا خاندان مشہور و معروف ہے۔ لڑکا تعلیم یافتہ اور صاحب روزگار ہے۔ مزاج کے متعلق بھی سُنا ہے اچھا ہے۔ اب کرو نہ کرو، تمھیں اختیار ہے۔ میری سمجھ میں جو آیا وہ کہہ دیا۔

زماں خاں۔ ہوں! تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ مرزا ہمایوں کی بیوی ممتاز بیگم کیسی بدمزاج عورت ہے۔

اشرف بیگم۔ ہولنے دو، نباہ تو لڑکے سے ہوگا، وہ اپنی ذات سے اچھا ہے اور پھر میری بیٹی یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ شوہر کے حقوق کیا ہیں اور ساس نندوں سے کس طرح ملنا چاہیئے۔

زماں خاں۔ بے شک لڑکی تو میری نیک اور سمجھ دار ہے اور دودھی

www.bhatkallys.com

کرے گی جو تم کہہ رہی ہو۔ اچھا تمہاری خوشی ہے تو بہتر منظور کر لو۔ مغلانی سے کہلا بھیجو کہ وہ پرسوں شام آکر نشان چڑھا جائیں اور شادی کا دن مقرر کر لیں۔

منگنی

مغلانی۔ لو بیگم صاحب، مبارک ہو! آج تو ہماری بنو ثریا کی منگنی ہے۔ جُگ جُگ شادیاں ہیں۔ خدا رکھے آج اس گھر میں کیسی رونق ہے۔

اشرف بیگم۔ ہاں بوا، تمھیں بھی سلامت رہو۔ یہ سب کچھ تمھارا ہی کیا دھرا تو ہے۔

مغلانی۔ واری، کیوں گنہگار کرتی ہو۔ تمھارے آگے ہماری کیا اوقات؟ ہزار ہم بوڑھے ہی سہی لیکن نمک خوار تمھارے ہی ہیں۔ بلا کتی پھرے گاؤں گاؤں جس کا کھتی اُس کا نام۔ تمھارا نام اور اقبال ہی تو تھا جو ایسی اچھی بات اتنی جلدی مل گئی۔ ورنہ مغلانی تو شاید عمر بھر ہی ٹٹولتی رہتی۔

اشرف بیگم۔ بوا، یہ تمھاری شرافت ہے جو تم ایسا کہتی ہو۔ اب جس اللہ نے یہ جوڑی ملائی ہے اُس سے دعا ہے کہ سہرے کے پھول بھی ایسے کھلائے جو دولہا دلہن کے جیتے جی ہمیشہ کھلے رہیں۔

مغلانی۔ آمین الٰہی آمین۔ اللہ تمھاری بیٹی کی مانگ بھرے، تمھارا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ الٰہی تم رہتی دنیا تک جیئو، بوڑھ سہاگن ہو ہمیشہ

www.bhatkallys.com

مُکھڑا ہی مُکھڑا دیکھو۔ ثریا بیٹی تو پلک اُٹھا کر راج کرے۔

کہار۔ سواری اُترو الو۔ سواری اُترو الو۔

مغلانی۔ اے لو وہ سمدھنیں بھی آنے لگیں۔ اری او گلشن۔ جلدی سے پھولوں کی چنگیر لا۔ نشان اور مٹھائی کے خوان پیچھے رکھوا دیجیو۔

گلشن۔ آئی مغلانی بی آئی۔

سمدھنیں ڈولیوں میں سے اُتر اُتر کر اندر مکان میں داخل ہو رہی ہیں۔ پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے ہیں۔ سمدھنیں ہار پہن کر شکریہ ادا کر رہی ہیں۔

"شکریہ، شکریہ!"

"اچھی اِس کی کیا ضرورت تھی"

"بہت تکلّف فرمایا آپ نے"

"آداب! آداب!!"

سامنے بڑے کمرے میں دُلہن سر سے پاؤں تک سُرخ ریشمی جوڑا پہنے، سر جھکائے، گھونگھٹ لٹکائے گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہے۔ دولہا کی اماں گھونگھٹ اُٹھا کر دلہن کا مُنھ دیکھ رہی ہیں۔ دلہن کے حُسن کی تعریف کرتی جاتی ہیں اور پھولوں کے گہنے پہناتی جاتی ہیں۔

ممتاز بیگم۔ سبحان اللہ! کیا چاند سا مکھڑا ہے۔ قربان ہو گئی تھی اِس پیاری صورت کے۔ آ میری بنو میں تیری بلائیں تو لے لوں۔

www.bhatkallys.com

رضیہ۔ جی ہاں! میری بھابھی چاند سی نہ ہوں گی تو اور کون ہوگا؟ بھابھی! لو یہ انگوٹھی اور چھلا تو پہنو۔ آئیے آئیے خالہ جان۔ اے بی اچھی تم بھی تو آؤ۔ لیجئے یہ مصری کی ڈلیاں کھلائیے۔ اچھی ممانی جان آپ بھی، دیکھو بھابھی جان ساتوں ڈلیاں کھانی پڑیں گی کبھی منھ سے نکال کر چپکے چپکے رومال میں رکھتی جاؤ۔

ممتاز بیگم۔ لو بوا اب کھلا چکیں۔ میں یہ نشان کے روپے اور اشرفیاں تو دلہن کو دے دوں لو دلہن بی بی لو، خدا تمھارا سہاگ قائم رکھے۔

مغلانی۔ دولہا دلہن کی اماں اور بہنوں کو مبارک ہو اور دونوں میاں صاحب کو بھی سلامت ہو الٰہی آمین!

مائینوں

کہار۔ سواری اُتروالو۔ سواری اُتروالو چھوٹی بیگم کے ہاں سے سرکار آئی ہیں۔

اشرف بیگم۔ آؤ بوا آؤ بہت جلدی آئیں کیا ٹھیک ہے؟ ماں سے زیادہ بیٹی کا پائنچہ بھاری ہے۔

نجمہ۔ کیا کہوں خالہ جان بچوں کو بناتے سنوارتے دیر ہو گئی۔

اشرف بیگم۔ دیر کی بھی کوئی حد ہے۔ تمھارے انتظار میں ابھی تک ثریا کو مائینوں بھی تو نہیں بٹھایا۔ لو آؤ ان سے بھی ملو یہ بھی تمھاری

www.bhatkallys.com

بہن ہوتی ہیں۔

نجمہ۔ بہن آپ کا نام!

سلطانہ۔ مجھے سلطانہ کہتے ہیں۔ (قہقہہ)

اشرف بیگم۔ بوا! یہ بڑی چپتی ہے بغیر ہنسی نوالہ بھی نہیں توڑتی۔ چلو اب دیر ہوتی ہے ثریا کو مائیوں بٹھائیں۔

سلطانہ۔ اے بی الوزری، وحیدن، ستارہ تم کیوں چپ ہو؟ بیٹھی بکر بکر پان تو چبا رہی ہو، سہاگ گھوڑیاں کیوں نہیں گاتیں؟

ڈومنیاں۔ حضور آج آپ کا نہ کھائیں گے تو اور کس کا کھائیں گے؟ لیجئے سنئے۔

سہاگ گھوڑی

"ناجوری، ناجو گھونگھٹ کھول، گھونگھٹ میں تیرے چندر لسبت ہے، لال لگے انمول، ناجوری ناجو گھونگھٹ کھول"

نجمہ۔ لو بہن تم یہ مینڈھی کا ٹکڑا تو کھاؤ۔

سلطانہ۔ یہ میری طرف سے بھی۔

نجمہ۔ یہ میری طرف سے ایک اور۔

سلطانہ۔ بس بوا بس کیا ساتوں دفعہ تم ہی کھلاؤ گی آخر اور بھی تو رشتے کنبے کی بہنیں ہیں۔

نجمہ۔ ہاں ہاں خدا رکھے بہت سی ہیں لو وہ بھی کھلا رہی ہیں۔

www.bhatkallys.com

ڈومنیاں۔ "کھائے نہ جانے مینڈیاں لاڈو میری
سیانی ہونے دو
باندھے نہ جانے بند
باوا نے کس دیا ڈولا آماں بیوی جانے نہ دے "
چچا نے " چچی " " "
بھائی نے " بھابھو " " "

سلطانہ۔ خالہ جان آپ کیا دیکھ رہی ہیں آیئے نا! یہ پان دلہن کے ہاتھ پر رکھ کر مینڈیاں رکھئے روپے دیجئے۔

اشرف بیگم۔ یہ لو بیٹی! اب ہم تمہارے فرض سے ادا ہوئے اب جھم جھم اندر جاؤ کوئی نمکین چیز نہ کھا لینا ہاں میری بیٹی شاباش!

مینڈیاں کھلا کر اب لڑکیاں بالیاں دلہن کو اندر لے جا رہی ہیں۔ دلہن کے اُبٹنا ملا جا رہا ہے۔ اُبٹنا ملتے ملتے آپس میں اُبٹنا کھیلنے بھی لگیں۔ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہا جا رہا ہے۔ اچھی خاصی گتھم گتھا ہو رہی ہے۔

"نہیں بوا نہیں مجھے معاف رکھو اچھی خدا کے لئے مجھے مت ستاؤ۔"

"نہیں بوا رکیا۔ یہ دیکھو، اہاہا! اہاہا!!"

"دیکھو یہ چھچھلاپن کسی اور سے کرنا۔ اگر تم نے میرے ملا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔"

"دیکھو تو نے مجھے بالکل لتھیڑ دیا ہائے اللہ مجھے تو زکام بھی

www.bhatkallys.com

رہو رہا ہے "۔

"کیا خوب اور ہم جو سُنیں گے کہ یہ ایسی اچھوتی کا ٹیکا ہیں کہ کوئی اِن کو ہاتھ بھی نہ لگائے "۔

" اچھا ٹھہر تو سلطانہ کی بچی دیکھ تو میں بھی تیری کیسی خبر لیتی ہوں آؤ آؤ ہم سب مل کر اس کی خبر لیں "۔

ساچق

مغلانی۔ بیگم اچھی بیگم! میں قربان جاؤں ذرا اوپر چل کر دیکھو تو ساچق کا جلوس کس شان سے آرہا ہے۔

اشرف بیگم۔ بس بوا رہنے دو، بوڑھے مُنہ مہاسے لوگ چلے تماشے میں جا کر کیا کروں گی؟ سلطانہ اور نجمہ عمر کی لڑکیاں دیکھیں تو بات بھی ہے۔

نجمہ۔ اے خالہ جان دیکھ بھی لو۔

اشرف بیگم۔ نہیں بیٹی پھر سمدھنوں کی پیشوائی کون کرے گا؟

سلطانہ۔ آؤ نجمہ آؤ۔ دیکھو وہ آگے آگے نشان کا ہاتھی کیسا جھومتا جھامتا آرہا ہے۔

نجمہ۔ اور تمھاری تڑک بھڑک اور چٹک مٹک کیا اس سے کچھ کم ہے؟

سلطانہ۔ اچھا تم کو بھی ہوا لگی۔

www.bhatkallys.com

عورتیں ساچق کا جلوس دیکھنے میں مصروف ہیں۔ آگے آگے نشان کا ہاتھی ہے۔ اُس کے پیچھے پھولوں کی ٹینٹوں میں نقار خانہ ہے۔ نوبت بج رہی ہے۔ بلّیوں پر بانسوں کی ٹھاٹر بندھی ہے۔ ان پر تمامی منڈھی ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے ابرک کے روشن کنول ہاتھوں میں لیے ناچتے ہوئے آرہے ہیں۔ چماریوں کے سروں پر کھاچیاں ہیں۔ اِن میں مٹی کی ٹھلیاں ہیں۔ ٹھلیوں میں دودھ اور شربت ہے۔ ان کے بعد کہاریوں کی قطار ہے۔ ان کے سر پر بری کے خوان ہیں۔ سب سے آخر میں پالکیوں، رتھوں اور ڈولیوں میں سمدھنیں سوار ہیں، خواص، خاص بردار اور چوب دار "ہٹو بڑھو" کہتے ہوئے آرہے ہیں۔

جلوس گلی میں داخل ہو گیا۔ آرائش لٹنے لگی۔ کسی کے ہاتھ میں کنول ہے تو کوئی بانس لیے ہوئے بھاگ رہا ہے۔ اسی گڑبڑ میں دو ٹھلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔

سمدھنیں گھر میں داخل ہو رہی ہیں۔ دلہن والیاں سمدھنوں کی مانگ میں صندل بھر رہی ہیں اور پھولوں کے ہار پہنا رہی ہیں۔ مغلانی کہاریوں اور چماریوں پر اپنا حکم چلانے اور تعمیل کرانے میں مصروف ہے۔

"ارمی او چھمی دیکھ یہ مہندی، نُقل، مصری اور میوے کے خوان اِدھر رکھ۔ او گنگا دیئی تو اپنی کشتی الگ

www.bhatkallys.com

رکھیئے۔ ایسا نہ ہو تیل اور عطر بکھر جائے۔ دیکھو کنگھیاں
بھی اسی میں رکھی ہیں۔ جتنا تو کب تک وہاں کھڑی
رہے گی۔ جتنے پہننے کے جوڑے ہیں اُن سب کے خوان
کیوں نہیں اتروائی۔"

سمدھین گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی ہیں۔ ہر ایک کو پان سپاری
تقسیم ہو رہی ہے۔ لیجئے وہ دُلہن کی بہن اور بھاوج نے دُلہن کا گھونگھٹ
اُٹھایا۔ پھولوں کا گہنا پہنا کر مصری کی ڈلیاں ایسی جلدی جلدی کھلا رہی
ہیں کہ غریب دُلہن نہ تو کھا سکتی ہے اور نہ ہی مُنھ سے نکال کر رومال میں
چھپا سکتی ہے۔ مصری کی ڈلیاں کھانے کے بعد اب دُلہن کو پان
کھلایا جا رہا ہے۔ دولہا کی اماں نے دلہن کو نشان میں روپے دئے۔
چڑھاوے کا زیور پہنایا۔ اور قریبی رشتے کی عورتیں بھی زیور دے رہی
ہیں۔ دولہا کی اماں بتاتی جاتی ہیں کہ یہ زیور کس کی طرف سے دیا
جا رہا ہے۔

"یہ جھومر بہن کی طرف سے ہے۔"

"یہ مالا دولہا کی خالہ دے رہی ہیں۔"

"یہ جھلنیاں بھتیجی کی ہیں۔"

ڈومنیاں شادیانے گانے میں مصروف ہیں۔ محفل کی رونق دوبالا
ہو رہی ہے۔

www.bhatkallys.com

شادیانہ

ہریالی بنّو ہووے مبارک شادی
بنّے کی بنّو ہووے مبارک شادی
جُم جُم رنت رنت ہووے آبادی
بنّے بنّو ہووے مبارک شادی

نجمہ۔ دیکھنا اس شادیانے کے ایک ایک لفظ سے کیسی خوشی اور شادی ٹپک رہی ہے۔

سُلطانہ۔ اے شاید تم نے وہ شادیانہ نہیں سُنا جو پہلے قلعے میں گایا جاتا تھا وہ سُنو تو بس رہ ہی جاؤ۔ اری انوری ستارہ یاد ہو تو سُناؤ نا۔

ڈومنیاں۔ قربان جاؤں کیوں نہ سُنائیں گے۔

شادیانہ

نوشہ پیارے بنے کی راج دُلاری بنڑی
موتیوں مانگ بھری کُنبے پیاری بنڑی
سمدھنیں آئی ہیں ساچق کا چڑھاوا لے کے
دیئے جاتی ہیں انگوٹھی وہ نکھاری بنڑی
بنا آیا ہے بنی سارے براتی لے کے
اپنے گھونگھٹ میں ذرا منہ تو نواری بنڑی

www.bhatkallys.com

دیکھ آرسی مصحف کو جو نو بات بجُھنی
بنا پاؤں پہ گرا کہہ کے ہماری بنڑی

لیجیے، شربت پلائی کا وقت آیا۔ مغلانی کشتی میں شربت کا شیشہ اور گلاس لے کر کھڑی ہے۔ نجمہ اور سلطانہ شربت پلانے اور سمدھنوں کا منہ پونچھنے میں مصروف ہیں۔

"لیجیے، شوق فرمائیے"

"شکریہ"

"خالی شکریہ نہیں، یہ تھوڑا سا اور"

"نہیں نہیں بس یہی کافی ہے"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بس یہ دو گھونٹ اور"

"بس ہوا بس۔ میں پی چکی اب ان کو پلاؤ"

"لائیے میں آپ کا منہ تو صاف کر دوں"

"ائے کمبخت! یہ منہ پونچھتی ہو یا کبھی کا بیر نکالتی ہو"

"ہوا میرا منہ بھی اسی طرح پونچھا کہ میرا منہ چھوڑ میری باچھیں تک چھل گئیں"

"شاباش ہوا شاباش دیکھنے کی تو تم کامنی سی ہو مگر ہاتھ لوہے کی میخیں ہیں"

"جی ہاں! ہماری سمدھن بنا تھوڑی سی ہے۔ منہ پُچھوانے میں ہوا گئیں۔ جب ڈومنیوں کی گالیاں کھاؤ گی تو اس وقت معلوم

www.bhatkallys.com

ہوگا کہ کے بسنتی کا ساکھ ہوتا ہے ۔"

ڈومنیاں۔ ہاں حضور آپ نے سچ فرمایا۔ بغیر گالیوں اور سیٹھنیوں کے ہمیں کون انعام دیتا ہے۔ لائیے ہماری بیل ہنہیں، تو سُنیئے۔

گالی یا سیٹھنی

سمدھی میرے گھر آیا، ڈالوں وا کے گلے موتیوں کا ہروا
سات سکھیوں میں ایسا لاگے جیسے بسنت کا گڑوا
جیسے ہولی کا بھڑوا ....

سمدھنیں۔ خدا کی مار ہو تم پر ان گالیوں کو ختم کرو۔ لو یہ اپنی بیل۔

مغلانی۔ چلو۔ بیویو! سوار ہو۔ مرد تیج رہے ہیں۔

برات

برات کی دھوم اور خلقت کا ہجوم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سب سے آگے نوبت نفیری باجے ہے۔ اس کے پیچھے دولہا زربفت کی شیروانی اور پھولوں کا زیور پہنے سفید آراستہ گھوڑے پر سوار ہے۔ انداز تو دیکھئے ایک ہاتھ میں لگام ہے دوسرے میں رومال جسے منہ پر رکھ چھوڑا ہے۔ براتی پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ لیجئے وہ برات گلی میں داخل ہوئی۔ دونوں طرف چھتوں پر عورتیں کھڑی ہیں۔ برات دیکھ رہی ہیں۔ گلی کے لڑکے بالے غل مچا رہے ہیں۔

www.bhatkallys.com

"دولہا چکّی چولہا، دولہا چکّی چولہا"

لیجئے دولہا کا گھوڑا دُلہن کے دروازے پر رُکا۔ دولہا دُلہن کے بھائی دونوں طرف کھڑے اپنے موقع کی تاک میں ہیں کہ اِدھر دولہا اُترے اور اُدھر ہم سوار ہوں۔ دیکھنا دولہا کا بھائی سوار ہو گیا۔ اب اپنا نیگ لئے بغیر وہ گھوڑے سے نہ اُترے گا۔

آیئے اب مردانے میں چلیں۔ دولہا دُلہن کے رشتے داروں عزیزوں اور دوستوں سے محفل بھری ہوئی ہے۔ قاضی جی نکاح نامہ لکھ رہے ہیں۔ لیجئے وہ انھوں نے خطبۂ نکاح پڑھنا شروع کیا۔ اب دُلہن کے وکیل اور گواہوں کی معرفت ایجاب قبول ہو رہا ہے۔

"آپ نے مسماۃ ثریا بانو بنت زماں خاں کو بالعوض مبلغ دس ہزار روپے مہر نصف موجّل و نصف معجّل مرزا اختر ولد مرزا ہمایوں کے نکاح اور اس کی زن و زوجیت میں دیا۔"

"ہاں دیا"

"آپ دونوں گواہوں نے سُنا"

"سُنا"

"آپ نے مسماۃ ثریا بانو بنت زماں خاں کو بالعوض مبلغ دس ہزار روپے مہر نصف موجّل و نصف غیر موجّل اپنی زن و زوجیت میں چاہا، قبول کیا اور اپنے نکاح میں لائے؟"

"ہاں قبول کیا اور اپنے نکاح میں لایا"

www.bhatkallys.com

نکاح ختم ہوا، دولہا اور حاضرین مجلس دعا مانگ رہے ہیں۔

چھوارے لُٹنے لگے۔ شہدے مبارک باد دے رہے ہیں۔

"الٰہی سازگاری ہو محمدؐ کا صدقہ"

"الٰہی دولہا ست پُوتا ہو"

"دولہا کے باوا کو پوتے پڑوتے کھلانے نصیب ہوں" اللہ کرے"

"دولہا والوں کی طرف سے مٹھائی اور دُلہن والوں کی طرف سے ٹن سپاری کی طشتریاں مہمانوں کو تقسیم ہو رہی ہیں۔ دولہا کے بھائی اور دوست اپنے اپنے سہرے باری باری پڑھ کر انھیں مہمانوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ جو سنتا اور پڑھتا ہے داد سخن دیتا ہے۔ شہدے علیحدہ اپنا نیگ لینے کے لیے بُری طرح لڑ رہے ہیں۔

"سرکار یہ مٹھائی تو بٹتی رہے گی۔ پہلے ہمارا انعام اور دوشالہ دلوائیے"

"جی ہاں! بڑی مدّت میں خدا نے یہ دن دکھایا ہے"

"یہ کیا دے رہے ہو میاں؟ رکھوا سے پچیس سے کم نہیں لیں گے۔ یہ ڈپٹی صاحب بیٹھے ہیں، پوچھ لو ان سے دو سو روپے اور دوشالہ تو انھوں نے اپنے بیٹے کے وقت دیا تھا"

"برسوں سے جامع مسجد کی سیڑھیاں چاٹ چاٹ کر دُعا کرتے ہیں، خدا خوش رکھے ہمیشہ خوشی کا شادیانہ گاتے ہیں"

www.bhatkallys.com

شادیانہ

دُھوم شادی کی دھواں دھار مبارک ہووے
پیاری دلہن کو یہ دِل دار مبارک ہووے
طوطیاں گا ویں چہک کر تیری محفل میں بنے
سہرا پھولوں کا زری دار مبارک ہووے

بمشکل تمام سمدھ سے اپنا انعام واکرام لے کر چلتے ہوئے۔ اب دولہا میاں سہرا لٹکائے گردن جھکائے منہ پر رومال ڈالے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اندر زنان خانے میں جارہے ہیں۔ یہاں رہیت رسم ادا ہوگی۔ دولہا کی بہنیں، بھائی کے سر پر آنچل ڈالے ہوئے دُلہن کے پاس لے جارہی ہیں۔ ڈومنیاں گانے میں مصروف ہیں۔

بنا بنڑی کے لیے سُبھ گھڑی آیاری بنا
نت گھڑی آیاری بنا
بچھیں مخمل کی بچھیں تکیے مشجر کے لگے
نور کے تمبو تلے لا کے بٹھایاری بنا
چل کے دیکھوری سکھی سب میں سوایاری بنا

رہیت رسم

دولہا دُلہن، پاس پاس بیٹھے ہیں۔ دُلہن کی بہن، دُلہن کے ہاتھ پر

www.bhatkallys.com

جی اور کھانڈ رکھ کر دولہا میاں کو چھوا رہی ہیں جب دولہا جھک کر کھانے کا ارادہ کرتا ہے تو دُلہن کی بہن فوراً دولہن کا ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔ اور "اے نوج یہ دولہا کیسا بھوکا ہے؟" کہہ کر دولہا کا مذاق اُڑاتی ہے۔ ڈومنیاں خوب چہک چہک کر "ٹوٹکے" گا رہی ہیں۔

ٹونا

ہشیار رہیو بنے ٹونا میں ہی کروں گی، سونا مکھی باندھوں، بنے کی دونوں آنکھیں باندھوں، بنے کا بالاجی۔
اری اے اری مکھی بنا گر ڈھبلی، آرسی بنا ٹونا میں ہی کروں گی۔

لیجیے اب آرسی مصحف کا وقت آیا، دولہا دلہن سر سے سر ملا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ دونوں کے سروں پر بہنوں نے دوشالہ ڈال رکھا ہے۔ دولہا دُلہن کے درمیان تکیہ ہے۔ تکیے پر قرآن اور آئینہ رکھا ہوا ہے۔ دولہا سورۂ اخلاص پڑھ کر دلہن پر دم کر رہے ہیں ڈومنیاں غلام کہنے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔

"دولہا میاں دلہن سے کہیے بیوی میں تمھارا غلام، تمھاری اماں کا غلام۔ تمھارے ابا کا غلام۔ تمھارے سارے کنبے کا غلام آنکھیں کھولو"

"واہ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے"

"اے اللہ کی امان کہہ دو"

www.bhatkallys.com

"دُلہن آنکھیں کھولو میں تمھارا گلاب ہوں"

"نہیں نہیں سرکار، یہ گلاب ولاب سے کام نہیں چلے گا۔"

"بیوی آنکھیں کھولو میں تمھارا غلام ہوں"

"کھولو بیوی آنکھیں کھولو۔"

سُلطانہ۔ لو بھئی لو آنکھیں کھول دیں۔ دونوں نے منہ دیکھ لیا۔

مغلانی۔ مبارک ہو مبارک ہو۔ لو بیو یو! اب دلہن کو ہنسی خوشی رُخصت کرو۔

ڈومنیاں۔ الٰہی آپس میں سلوک اور اتفاق ہو۔ دولہا دُلہن دودھوں نہائیں پُوتوں پھلیں۔ اری او ستارہ منڈھا شروع کر۔

منڈھا

کاہے کو دینی بدیس رے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سُن بابل موے

بھیتوں کو دے محل دو محلے مجھ کو دیا پردیس رے ‏ ‏ ‏ "

ہم تو رے بابل کھونٹے کی گئیاں جدھر ہانکو ہنک جائیں رے ‏ ‏ ‏ "

ہم تو رے بابل بیلے کی کلیاں گھر گھر مانگی جائیں رے ‏ ‏ ‏ "

ہم تو رے بابل چھالے کی چڑیاں رین بسیں اُڑ جائیں رے ‏ ‏ ‏ "

کوٹھے تلے سے پالکیا جو نکلی بیرن نے کھائی پچھاڑ رے ‏ ‏ ‏ "

طاق بھری میں نے گڑیاں جو چھوڑیں چھوڑا سہیلا ساتھ رے ‏ ‏ ‏ "

لے بابل گھر اپنا ہم چلے پیا کے دیس رے ‏ ‏ ‏ "

www.bhatkallys.com

یہ بھی کس قدر مجبوری اور لاچاری کا وقت ہے کہ ساری عمر پالا
پوسا، اور ایک دو بولوں کے بعد اپنا کچھ زور اور دعویٰ نہ رہا۔
دُلہن اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن سے بچھڑنے کی وجہ سے زار و قطار
رو رہی ہے۔ اُدھر ماں، باپ، بھائی، بہن اور قریبی رشتے کنبے داروں
کی آنکھیں دلہن کی جُدائی پر آنسوؤں سے نم ہیں۔ بیچ وہ دولہا نے
روتی ہوئی دلہن کو گود میں اُٹھایا اور پالکی میں لاکر بٹھا دیا۔

برات روانہ ہونے والی ہے۔ سقّے نے صراحی، ماما نے
پاندان، بھنگن نے طشت چوکی، شہدوں نے چھپر کھٹ، کہاروں نے
ڈولیوں میں بہوڑے کا کھانا، چماریوں نے کھاجیوں میں جہیز کے برتن،
مزدوروں نے جوڑوں کے صندوق اور ٹرنک، کرسیاں، میزیں،
الماریاں غرض سب اپنی اپنی چیزیں سنبھال کر ایک دوسرے کے
پیچھے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ دلہن کی پالکی پر دولہا کی بہن نے اپنا
ریشمی دوپٹہ ڈلوایا۔ خود پالکی میں دلہن کے پاس آکر بیٹھی۔ بہت کی دیکھا
دیکھی دو چار اور لڑکیاں بھی بیٹھ گئیں۔ آٹھ کہاروں نے مل کر دلہن
کی پالکی اُٹھائی۔ چوب داروں نے "دوست شاد، دشمن برباد، اللہ
رسول کی امان" پکاری۔ برات روانہ ہوئی۔ دولہا دُلہن پر سے
پیسوں کی بجائے چاندی کے پھول روپے اور دونیاں، چونیاں
نچھاور ہو رہی ہیں۔ لٹیرے لوٹنے کے لئے ٹپکے کے آموں کی طرح
گدبد گدبد کر کے گر رہے ہیں۔

www.bhatkallys.com

بڑی دیر کے بعد برات دولہا کے گھر پہنچی۔ مرد جہیز کا سامان سنبھال سنبھال کر رکھ رہے ہیں۔ جن عورتوں کو فوراً جانا ہے وہ کھانا کھا کر اپنے گھر جا رہی ہیں، جو گھر میں رہیں گی وہ سونے کی فکر میں ہیں۔ لیکن آج کی رات سونا کہاں؟

یہ تو تخت کی رات ہے۔ دو تین بجے تک نہ کوئی سوتا ہے اور نہ کسی کو سونے دیتا ہے۔ عورتیں مل جل کر خود گاتی ہیں یا ڈومنیوں سے گواتی ہیں۔ اُدھر دیکھیے انوری وحیدن اور ستارہ پر گھر والیوں کی جھاڑ پڑ رہی ہے۔

"اری کم بختو! کھانا ٹھونس کر کہاں اُجڑ گئیں تخت کی رات ہے کیا یوں ہی چُپ نہ ہو گی؟"

"اُجڑتے کہاں سرکار، خدمت میں موجود ہیں، ذرا سا زردہ کھا رہے تھے"

"سہاگ گیت بھی تو گا، زردہ تو رات بھر کھاتی رہنا"

"اے لو حضور، ہمیں کیا انکار ہے۔ لیجیے سنیے"

سہاگ گیت

بنے مکھڑو دیکھ تیری بنو ہے سہاگ بھری

تاروں بھینی رات رہے مہو جیسے چندر کی کرن کھری

بنے مکھڑو دیکھ تیری بنو ہے سہاگ بھری

www.bhatkallys.com

پھولوں سی بنو سوئے رنگ بھینی بنڑی رنگ بھینا بنڑا

عطر باسی بنو سوئے " " " "

گلے لاگی بنو سوئے " " " "

پھولوں باسی بنو سوئے " " "

مکان کی ساری فضا خوشیوں سے معمور ہے، دولہا دلہن محوِ خواب ہیں۔ شاید اس وقت دلہن ماں باپ کی جدائی کا غم قطعی بھول گئی ہے۔ اور آیندہ پیش آنے والی نئی ذمہ داریوں اور افکار سے بھی بالکل بے خبر ہے۔

---

www.bhatkallys.com

دِلّی کے شہدے

دِلّی میں شادی کی وہ کون سی محفل ہے جہاں دِلّی کے پُرانے شہدے میاں حاجی بُتو[1] اور بجو رسے نہ پہنچتے ہوں اور نکاح ختم ہوتے ہی اُن کے یہ بول آپ کو نہ سُنائی دیتے ہوں :

"الٰہی سازگاری ہو اور محمدؐ کا صدقہ"

"الٰہی دولہا ست پُوتا ہو"

"اور دولہا کے باوا کو پوتے پڑوتے کھلانے نصیب ہوں اللہ کرے"

---

[1] خیر سے ابھی زندہ ہیں۔ پہلے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کو چاٹ چاٹ کر دُعا دیتے تھے اب کراچی میں ہوا بندر کی ہَوا پھانکتے ہیں اور دُعا کے طالب ہیں۔ اُن کی ٹکڑی کے ہم نوا اُن سے بچھڑ گئے۔ اس تنہائی اور بے چارگی میں اُن کا دم خم بھی رخصت ہوا۔ البتہ آواز میں وہ کڑاکا موجود ہے۔ شادی کی محفلوں میں شاذ و نادر ہی کہیں گونجتے سُنائی دیتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے نقارخانے میں اب اِس طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ اس تحریر کے بعد اطلاع ملی کہ وہ تو اللہ کو پیارے ہو چکے۔

www.bhatkallys.com

"آمین"

"دلوا دیجے حضور سید۔ مجھے ہاتھ سے پچیس روپے اور دو شالہ ہم شہدوں کو"

اور درمیان میں اُن کے ہم نوا، اللہ بخش راے اور مخدوم راے بھاٹ اپنی پاٹ دار آوازوں کے ساتھ اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوں۔

"دیجیے، ہم شہدوں اور بھاٹوں کا انعام، خدا حضور کو سلامت رکھے"

"اور وہ دن ہو کہ فرزند سے گود بھرے دولہا میاں کی اللہ کرے"

"خدا کا دیدار ہو، محمدؐ کی شفاعت، سازگاری ہو برخورداری"۔

اور اس کے بعد فوراً ہی جب قوالوں کے تیمور لنگ میاں عبدالرحمٰن قوال اپنے ساتھی شرف الدین کے ساتھ سہرے کے یہ بول:

"گوندھ لا رہی مالن پھولوں کا سہرا
آج بنا بنی کو مبارک
آج بنی جی نے سہرا بندھایا
حوروں نے مل مل منگل گایا
گوندھ لا رہی مالن پھولوں کا سہرا"

ہارمونیم اور ڈھول کے بغیر الاپتے ہیں تو اُس وقت واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ سچ مچ شادی کی محفل ہے اور سہرے کے پھول دولہا دلہن پر نچھاور ہو رہے ہیں اور سارے جہاں کی خوشیاں قربان ہو رہی ہیں۔

www.bhatkallys.com

عین اُسی وقت دولہا کی مسند سے دولہا کے بھائی اور دوستوں کا شہر دل اور قوالوں کو حکم نافذ ہوتا ہے کہ یہ جھینا اور گانا بند کرو۔ وہ خود سہرا پڑھیں گے۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ حضرات کچھ فرمانا شروع کریں یہ قوال صاحب اپنے دو بول اور سنا چکتے ہیں:

"ہریالے بنے ہو وے مبارک شادی
جھم جھم ننت ننت ہو وے شادی
پھول رنگ بنے یہ دعا دی
ہریالے بنے ہو وے مبارک شادی

بالآخر دولہا کے بھائی اور دوسرے عزیز اقربا اپنے اپنے سہرے سناکر دادِ سخن حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے خاموش ہوتے ہی میاں عبدالرحمٰن ایک مرتبہ پھر جھوم کر اس طرح بیٹھتے ہیں کہ اُن کی کمر اور گردن بے ساختہ ایک طرف جھک جاتی ہے۔ اُن کا دایاں ہاتھ اُن کے سیدھے کان پر پہنچ جاتا ہے اور وہ لہک لہک کر یہ سہرا شروع کرتے ہیں۔

"چشمِ عالم میں رہے پتلیاں بن کر سہرا
کم نہیں آنکھ کے تارے سے یہ دلبر سہرا
شوقِ دیدار میں تاروں کی لگا کر عینک
آسماں دیکھ رہا ہے ترا جھک کر سہرا
اور بھی ہو گئی ماں باپ کو دونی اُلفت
دل میں گھر کر گیا نظروں میں سما کر سہرا

www.bhatkallys.com

تیرے اولاد ہو، اولاد کے اولادیں ہی

سلسلے وار ہمیشہ رہے بندھ کر سہرا

ہنسنے میں پھول جو جھڑتے ہیں قرآن کے منہ سے

اچھی مالن انہی پھولوں کا بنا لا سہرا"

گویا وہ کوئی میر شاعرہ ہیں کہ آخر میں اپنا تبرک پیش کر رہے ہیں آپ سنیں یا نہ سنیں وہ آپ کو سنائے جائیں گے۔ پھر کیا مجال ہے کہ آپ اُن کو ٹال جائیں یا انعام دینے میں کچھ عذر کریں۔ آپ ہنسی خوشی نہ دیں گے تو وہ آپ سے چیخ پکار کر لیں گے۔ لڑ جھگڑ کر لیں گے۔ زبردستی لیں گے لے کر بھی آپ کا پیچھا چھوڑ دیں تو غنیمت جانیے۔ آپ نے انعام دینے میں جہاں ذرا سی ہچر مچر کی یا اُن کی منشا اور توقع کے خلاف کچھ کم دیا پھر دیکھئے اُن کا چیخنا اور چلانا اور سنئے اُن کی پھبتے واریاں، زمین اور آسمان کے قلابے ایک کر دیں گے۔

"سرکار یہ مٹھائی اور چھوارے تو بٹتے رہیں گے پہلے ہمارا انعام اور دوشالہ دلوائیے"

"مل جائے گا۔ مل جائے گا۔ اتنا غل کیوں مچاتے ہو"

"واہ غل کیوں نہ مچائیں۔ برسوں سے جامع مسجد کی سیڑھیاں چاٹ چاٹ کے دعا کرتے ہیں۔ خدا خوش رکھے ہمیشہ خوشی کا شادیانہ گاتے ہیں"

"ارے سن تو لیا بھائی، سن تو لیا۔ لو یہ لو۔ بس اب نہ چیخنا۔

www.bhatkallys.com

کہہ دیا ہے میں نے۔"

"واہ واہ۔ یہ کیا دے رہے ہو میاں! رکھو اسے پچیس سے کم نہیں لیں گے۔ یہ ڈپٹی صاحب بیٹھے ہیں، پوچھ لو ان سے، دو سو روپے اور دو شالہ تو انھوں نے اپنے بیٹے کے وقت دیا تھا۔"

"بس بس اب اور زیادہ نہیں ملے گا۔ مچائے جاؤ غل کوئی بات کیسی ہے۔"

"بات کیوں نہیں ہے ہم کوئی روز روز آتے ہیں، روز روز مانگتے ہیں۔ عمر بھر میں یہ ایک ہی دن تو آتا ہے ہمارے مانگنے کا۔ نہیں نہیں میاں ہم یہ نہیں لیں گے۔"

"اچھا لو یہ اور، لو تو سہی، اماں دیکھو تو سہی یہ کیا ہے؟ ارے بھئی اب تو پورے ڈھائی ہو گئے۔"

"جی ہاں پورے ڈھائی ہو گئے۔ ڈھائی روپے کا تو میں تانگا کر کے آیا ہوں۔ بڑی مدّت میں تو خدا نے یہ دن دکھایا ہے آج، اور تم یہ ڈھائی ڈوبلی دے رہے ہو۔"

"آپ دلواتے نہیں ڈپٹی صاحب! بیٹھے دیکھ رہے ہو۔ خدا تمھیں رہتی دُنیا تک سلامت رکھے۔ ذرا کہو نا ان سے۔ بلوائیے دولہا میاں کے بھائی اور چچا کو، اُن سے لیں گے ہم تو، ہاں خدا رکھے اُن کے دموں کو۔"

"آخر کچھ لینا بھی ہے یا یوں ہی جھک جھک کرتے رہو گے، بتاؤ

www.bhatkallys.com

کیا ہو گے، بولو، ارے بھئی بول چکو، جلدی بولو، جلدی، ابھی تو اور بھی کام کرنے ہیں"

"تو بس پھر دس روپے دلوا دو چپکے سے بس، اب اس سے کم نہیں لوں گا اس وقت، ہاں کبھی اور چھوڑ دو، دو گھنٹے ہو گئے ہیں گلا پھاڑتے پھاڑتے اور دُعائیں مانگتے مانگتے، میاں یہ ساری عمر اسی طرح گزار گئی ہے"

"اچھا اچھا۔ یہ لو کسی طرح پیچھا تو چھوڑو، ٹلو تو سہی یہاں سے"

"جیتے رہو میاں جیتے رہو، خدا کرے ایسی گھڑیاں تمھیں ہر سال نصیب ہوں اور روز روز ایسی خوشیاں منایا کرو۔ الٰہی دولہا دلہن کے جان و مال کی سلامتی ہو آمین محمدؐ کا صدقہ"

سچ پوچھو تو یہ سہرے حقیقت میں منگلا مکھی ہیں۔ ان کی صورتیں صرف خوشی یا شادی کے موقعے پر ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ نہ ہوں تو ساری محفل سونی نظر آتی ہے اور جو شادی اور خوشی ان کی ٹولی کے قوالوں کے سہروں سے ٹپکتی ہے وہ ہرگز ہمارے سہروں سے ظاہر نہیں ہوتی۔ اتفاق سے اگر کسی محفل میں یہ نہ پہنچیں تو آپ لوگوں کو خود بخود اور بے ساختہ یہ کہتے ہوئے سُنیں گے۔

"ارے آج سہرے نہیں آئے اُن کو اور شادی کی خبر نہ ہو ضرور کسی بڑی جگہ ہاتھ مار رہا ہوگا"

تھوڑی دیر بعد یہ پھر نازل ہوں گے لیکن چیختے اور چلّاتے ہوئے

www.bhatkallys.com

نہیں بالکل چپ چاپ اور خاموش۔ دولہا والوں سے پوچھیں گے "کہیئے جہیز کے لئے کے سو کھاٹیاں منگواؤں، وہ دلہن کا پلنگ کہاں رکھا ہے۔ پہلے اس کو باہر نکلوا دو، ہم اتنے اُسے سجائیں تم اتنے اپنا برتن بھانڈا، کپڑا، لتّا اور زیور سنبھالو۔"

دلّی میں قدیم سے یہ رسم چلی آتی ہے کہ دُلہن کا پلنگ صرف شہدے اُٹھاتے ہیں، اُن کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں اُٹھا سکتا۔ چونکہ عورتیں شادی کی پہلی رات کو تخت کی رات کہتی ہیں۔ اِن شہدوں نے بھی اِسی مناسبت سے اِس پلنگ کو اپنی اصطلاح میں ڈھائی گھڑی کا تخت کہنا شروع کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ شادی کی تقریب میں دو تین دن تک دولہا دلہن اپنے گھر والوں اور عزیزوں کے دلوں پر بادشاہت ہی کرتے ہیں جسے دیکھو دولہا دُلہن کی خاطر اور محبّت میں بچھا جا رہا ہے۔ یہ شہدے اصل میں ہیں کون، کیوں کر اِن کا یہ نام پڑا اور آئے کہاں سے اور یہ پلنگ اٹھانے کی رسم اِن کے ساتھ کیوں کر مخصوص ہوئی؟ اس کے متعلق منشی سید احمد دہلوی اپنی مشہور تالیف "فرہنگِ آصفیہ" یوں لکھتے ہیں:

"ایک فرقہ ہے جو اکثر ننگے پاؤں اور ننگے سر رہتا اور شادیوں میں دُلہن کا پلنگ اُٹھاتا ہے۔ جب کسی مُردے کو دُور لے جاتے ہیں تو وہ بھی انہی کے سپرد ہوتا ہے۔ جیسا یہ فرقہ گالی گلوج میں مشہور ہے ویسا ہی دیانت دار

www.bhatkallys.com

بھی ہے۔ اوّل درجے کے شہدے وہ ہیں جو دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی کھانے کمانے میں شریک اور گالی گفتار میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ شہدہ اُن کا نام دو وجہ سے مشہور ہوا۔ اوّل تو یہ کہ ان لوگوں کو بات بات پر بی بی جی وغیرہ کی قسم کھانے کی عادت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاید جھوٹی گواہی دینے سے بھی انکار نہیں ہوتا۔"

لکھنؤ میں ایک مدت سے یہ دستور چلا آتا ہے اگرچہ اب بہت کم ہو گیا ہے کہ شیعہ حضرات کی میتوں کی تجہیز و تکفین، جنازے کو قبرستان تک لے جانا اور دفن کرنا یہ تمام کام شہدے انجام دیتے ہیں۔ جان صاحب کے دیوان مرتبہ نظامی بدایونی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۰ء میں ایک قطعہ بند اُن کی دیوالی والی خمسی میں شہدوں کی اسی خدمت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

کنگلے تھے مال والی ملی مجھ سی نیک ذات
سمجھو نہ کیوں یہ دل میں لگی خوب جُر دہا تھ
ایسی نہ دوں گی شہ جو کرو تم بدی کی بات
درگور آپ نے کیا، شہدوں کو بھی ہے مات
میرا محل نہ پیر بخارا بنائیے

خود شہدوں کا یہ کہنا ہے کہ تیمور بادشاہ جب کربلائے معلیٰ

www.bhatkallys.com

گیا تو دیگر تبرکات کے علاوہ اُسے وہ پلنگ مبارک بھی حاصل ہوا جو خاتونِ جنت حضرت بی بی فاطمہ رض کا تھا۔ تیمور نے یہ پلنگ ایسے لوگوں کے سپرد کیا جو سادات میں سے تھے اور شہدے کہلاتے تھے یا بعد میں کہلانے لگے۔ وہ شہدے اُس پلنگ مبارک کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ اپنے سروں پر رکھ کر تیمور کے ہمراہ ہندوستان لائے۔ یہاں آکر جب یہ خدمت پوری ہو گئی تو تیمور نے حکم دیا کہ اب تم ڈھائی گھڑی کا تخت اُٹھایا کرو چنانچہ آج تک اُسے شہدے ہی اُٹھاتے ہیں۔

خاتونِ جنت کا پلنگ لانے اور بعد ازاں ڈھائی گھڑی کا تخت اُٹھانے کی یہ حکایت محض دُلہنوں کا پلنگ اُٹھانے کی رسم کو صرف اپنے سے منسوب کرنے کے لئے گھڑی گئی ہے اور بالکل فرضی اور جھوٹ ہے۔ البتہ اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرقہ اُس وقت کربلائے معلیٰ میں تھا ضرور، اور وہیں سے ہندوستان آیا۔ اور کچھ عجب نہیں کہ تیمور ہی ان کو اپنے ساتھ لایا ہو۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے انہی شہدوں کے بارے میں مجھے عربی کا ایک شعر سنایا تھا جس سے یہ پتا چلتا تھا کہ بغداد میں بھی شہدوں کا وجود تھا۔ افسوس کہ وہ شعر اس وقت مجھے یاد نہیں۔

اصل میں تیمور شہدائے کربلا کے کچھ تبرکات ہندوستان لایا تھا جن کو وہ ہمیشہ اپنے لشکر کے آگے کجاوں میں رکھتا تھا اور جب

www.bhatkallys.com

کربلا کے ہوش رُبا واقعات سُنتا تو ان کجاوں کو بہ نظرِ احترام اپنے سامنے تختوں پر رکھوا لیتا۔ چنانچہ اسی وجہ سے تمام تعزیے بھی عموماً کجاوں کی صورت کے بنائے جاتے ہیں۔ تعزیے اصل میں حضرت امام حسن رضؓ اور حضرت امام حسین رضؓ کی تربتوں کی نقل ہے۔ جو بانس کے ڈنڈوں پر رنگین کپڑا یا کاغذ منڈھ کر بنائے جاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تیمور نے ان کجاوں کو اٹھانے اور رکھنے کی خدمت ان شہدوں کے سپرد کی کی ہو جس کو انھوں نے بعد میں اپنی زبردستی سے ڈھائی گھڑی کا تخت اٹھانے کی خدمت سے مشہور کر دیا۔ بظاہر پلنگ اٹھانے کی صرف یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ پہلے زمانے میں چونکہ سفر کٹھن اور پُرخطر تھا اور راہ میں لوٹ مار کی وارداتیں آئے دن اور کھلم کھلا ہوتی رہتی تھیں، اس لئے ایسے تمام نازک موقعوں پر شاید ان شہدوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہوں گی۔

بہر حال اس فرقے کے قدیم اور شاہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ سید وزیر حسن صاحب دہلوی مصنف "آخری دیدار" لکھتے ہیں:

> "قلعہ میں جونہی سواری صدر دروازے کے نزدیک آتی، امیر اُمرا، پایہ چھوڑ الگ ہو جاتے۔ توپیں دغتیں، زنبوریں چھوٹتیں، وردیاں بجتیں، ساری فوج فرا سلامی اُتارتی، شہدوں میں سے ایک آواز لگاتا "الٰہی یہ پال

www.bhatkallys.com

ایک ہزار اور نصیب ہوں" باقی اس زور سے "آمین"
کہتے کہ خاصے کے گھوڑے بھی چمک اٹھتے۔ بادشاہ
سلامت بھر بھر مٹھیاں روپے، دونیاں چونیاں پھینکتے
سواری رساں رساں آگے بڑھ جاتی"

پھول والوں کی سیر کا وقعہ آتا تو بادشاہ سلامت کی سونے کی نقرئی پلنگڑی شہدوں کے حوالے کی جاتی۔ وہ اُسے لے کر مہرولی پہنچتے اور سیر کے بعد خود ہی واپس لاتے اور اپنا انعام پاتے۔ سرکار برطانیہ کی جانب سے بھی پلنگڑی کا یہ انعام ایک مدت تک شہدوں کو ملتا رہا۔ اب صرف اُن پھول والوں کو ملتا ہے جو مہرولی جا کر پھولوں کے پنکھے چڑھاتے ہیں۔

قطب صاحب میں اولیاء مسجد کے قریب ایک شکستہ عمارت "مقبرہ چہل تن چہل من" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ زیارت گاہ خواص وعوام ہے۔ اس کے احاطے میں چالیس قبروں کے سوا کچھ نہیں۔ حاجی شہدے نے ان قبروں کے بارے میں کہا کہ یہ سب ہمارے ہی بزرگوں کی قبریں ہیں۔ چنانچہ اس گنبد میں اب بھی چند شہدے رہتے ہیں جو مجاوری کرتے ہیں۔

لیکن مصنف واقعات دارالحکومت[۱] دہلی اسی عمارت کے متعلق لکھتے ہیں:

---

[۱] جلد سوم ص ۳۱۱

www.bhatkallys.com

"چہل تن چہل من - سڑک کی بائیں جانب ٹیلے پر ایک بارہ
مربع فٹ گنبد بنا ہوا ہے جس کا فرش ریتیل سٹون (بن
گھڑے پتھر) کا ہے - اس میں کوئی قبر نہیں ہے - گنبد کے
سامنے ایک پختہ فرش کا احاطہ ۶۲ × ۵۳ مربع فٹ کا ہے
جس میں برابر برابر چالیس قبریں ہیں - اِن بزرگوں کے
حالات کچھ معلوم نہیں - کہتے ہیں کہ چالیس اُبدال کی قبریں
ہیں جو سیّد احمد کبیرؒ کی اولاد سے ہیں اور اسی میں
سیّد صاحب موصوف کی قبر بھی ہے"

دِلّی میں شہدوں کی اس وقت تین ٹکڑیاں ہیں - پہلی ٹکڑی
شہدوں کی ہے جس میں حاجی ببّو اور کھجورے ہیں - دوسری بھاٹوں
کی ہے اور تیسری قوالوں کی - لیکن اِن شہدوں کے بغیر نہ تو غریب
بھاٹوں کی کہیں دال گلتی ہے اور نہ ہی قوالوں کی کہیں پُرسش ہوتی
ہے - اس لحاظ سے حاجی شہدے سب کے مُنڈ ہوئے - حاجی شہدہ
کا اصل نام حبیب الرحمٰن ہے - حاجی ہونے کے سبب حاجی شہدہ مشہور
ہے - باپ کا نام وزیر شہدہ تھا اور دادا چمن جمعدار تھے - لال قلعے سے
شہدوں کی جمعداری کا خلعت ملتا تھا اور تنخواہ بھی مقرر تھی - کچھ عجب
نہیں کہ مقرر ہو، اس لئے کہ یہ شہدے شادی بیاہ کی تقاریب کے
علاوہ بھی اکثر موقعوں پر رئیسوں کو ہی مونڈتے اور کھاتے تھے -
مثلاً مہرولی میں پھول والوں کی سیر کے موقعے پر مینا بازار میں رئیسوں

www.bhatkallys.com

سکے کو کتوں کے نیچے ٹکڑے ہو کر کھینچے" چلّاتے اور انعام اینٹھتے تھے۔ عید اور بقرعید کے تہواروں پر جا کر ستاتے۔ قلعے کے امراء وزراء اور شہر کے نوابوں اور رئیسوں سے ماہوار تنخواہ وصول کرتے تھے اور جب اُن کی عزت و آبرو یا جان و مال کو کوئی خطرہ پیش آتا تو یہ صحیح معنوں میں اُن کے سچے حمایتی اور مددگار ثابت ہوتے اور ان کی خاطر اپنی جان تک لڑا دیتے تھے۔

آمدنی کی اس کثرت اور فراوانی نے ایک طرف تو ان شہدوں اور ان کی عورتوں کو فکرِ معاش سے اس درجہ بے نیاز کیا کہ شہدوں کے بقول کہ وہ صبح سے شام تک صرف جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے رہیں اور سیڑھیاں چاٹ چاٹ کر اپنے آقاؤں اور ولی نعمتوں کے حق میں دُعائے ترقیٔ عمر و دولت و اقبال کرتے رہیں۔ دوسری طرف اُن بگڑے ہوئے رئیسوں اور اُن کے آزاد و آوارہ مزاج لڑکوں کو یہ موقع دیا کہ وہ آمدنی کی خاطر ان شہدوں میں آ کر شامل ہوں۔ اُن کے تمام رنگ ڈھنگ اختیار کر کے اُن کے شریکِ کار بنیں اور دن رات اپنی زندگی مزے سے گزاریں۔

مشتاق عاشقی میں بے کیف ہے تقدس
جو عشق کے مزے ہیں، ہیں سالے شہد پن میں

پھر بعد غدر جب افرادِ شاہی میں سے بعض بدقسمت شہزادوں نے اپنے ہی نمک خواروں کے ہاں ڈیوڑھی پر رہ کر ایک مدت تک اُن کی

www.bhatkallys.com

چاہیں بگڑی ہوں اور شہزادیوں نے گھروں میں ماماگیری کی ہو تو نوابوں اور رئیسوں کا شہدہ بن جانا کون سی دشوار بات تھی۔ لہٰذا شہدوں کا یہ کہنا اور بعض لوگوں کا یہ گمان غلط نہیں کہ ان شہدوں میں بہت سے نواب اور رئیسوں کے لڑکے بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ کون کون بد قسمت تھے یا ہیں، خدا اُن کا یہ راز یوں ہی قائم رکھے تو بہتر ہے۔

دوسری ٹکڑی دلّی کے بھاٹوں کی ہے۔ جیسے گویّوں کے جگت استاد تان سین ہوئے ہیں، اسی طرح ان بھاٹوں کے بزرگ بقول الٰہ بخش رائے بھاٹ دہلوی، ایک گنگ رائے بھاٹ تھا جو اکبر بادشاہ کے دربار میں ملازم تھا۔ اُسے اکبر بادشاہ نے اس کی کسی خطا پر قتل کرا دیا تھا۔ موجودہ بھاٹوں میں الٰہ بخش رائے اور اُن کے ساتھیوں میں مخدوم رائے اور شرف رائے، بھاٹ ہیں۔ الٰہ بخش رائے کے باپ قلندر بخش رائے، دادا محمد رار رائے، پردادا نظام رائے اور سکڑ دادا لنگروا رائے تھے۔ جو بقول الٰہ بخش رائے عرب سے ہندوستان آئے۔ پھر شیخ کلیم اللہ جہان آبادی علیہ رحمۃ اپنے ہمراہ دہلی لے آئے۔ شیخ صاحب موصوف ہی نے ان کو قلعے میں پہنچایا اور تنخواہ مقرر کرائی۔ غدر سے پہلے خانم کے بازار میں رہا کرتے تھے پھر قدم شریف چلے گئے اور اب تک وہیں رہتے ہیں۔ اِن کے متعلق مصنف فرہنگ آصفیہ فرماتے ہیں:

"بھاٹ اصل میں ہندوستان کی ایک قوم کا لقب ہے"

www.bhatkallys.com

جو اکثر نسب یاد رکھتی ہے، اس لئے گاؤں اور دیہات میں اس کی بڑی عزت و وقعت ہوتی ہے۔ بھاٹ کے لغوی معنی ہیں ہجو کرنے والا، عیب جو، رسوا کن، خوشامدی کبیشیر جو کبت اور اشلوک بنائے یا دوسروں کو سنائے۔"

چنانچہ مثل مشہور ہے کہ "کبت بھاٹ کو اور کھیتی جاٹ کو" کبت کہنے کی وجہ سے کوئی ہوئے شاہی لقب 'رائے' تھا اس لئے کوئی رائے یعنی شاعروں کے بادشاہ بن بیٹھے، بقول حضرت حالی:

جو کہے تجھ کو بنا دیں اسے امیر
ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ

شہدوں کا لباس تو آپ نے اکثر دیکھا ہوگا، کبھی شرعی پاجامہ اور کبھی تہبند، لمبا ڈھیلا ڈھالا جیب دار کرتا، کرتے پر بند گلے اور بے آستینوں کی صدری، کندھے پر گز بھر کا رومال، سر پر کام دار عرق چین ٹوپی، پاؤں میں ہندوستانی سادی جوتی۔ اب ذرا الٰہ بخش رائے بھاٹ کا حلیہ بھی ملاحظہ ہو:

لمبا قد، دوہرا ڈیل ڈول، چوڑا چکلا چہرہ، گندمی رنگ، بھروال مٹھی بھر ڈاڑھی، لٹھے کا شرعی پاجامہ، ململ کا خل خل کرتا، کرتے پر اچکن، سر پر پگڑی نما صافہ، کندھے پر تہ کیا ہوا رنگین دوشالہ، کمر تک لٹکتا ہوا، کمر میں فرنگکس کی وضع کی پیٹی۔ زبان، الٰہی توبہ جو بولے اس کی ہیچ۔ حجام

www.bhatkallys.com

کی قینچی بھی کیا چلے گی، ایک منٹ میں بیسیوں لفظ اور ہر لفظ میں بیسیوں باتیں۔ آوازیں تو آپ پہلے ہی معلوم کر چکے اب مُشتے نمونہ از خروارے اُن کی شاعری بھی ملاحظہ ہو:

دربارِ شاہی میں سلام

پڑھ کر بسم اللہ، اُس اللہ کو یاد کیا
اور نبی جی کا کلمہ دین اور اسلام ہے
اولاد باوا آدم کی، پیر کے مُرید
سُنا کے طالب اور گُنی[2] کے غلام
نگرے[3] کو نصیحت دیں ایسے نروپ بھُوپ
سائیں بس مُنجان ہی جیت، ہیں!
گدائے رائے حاضرا حضور!
سگل[4] دربار کو سلام ہے

تخت کی تعریف

کنک[5] تخت اور رنگ جڑے سب جواہر
جھلر[6] موتیوں کی جھِمتر ہل لتا ہیں

---

۱ بیٹھا۔ ۲ صاحب فن۔ ۳ احسان فراموش۔ ۴ تمام۔ ۵ سونا۔ ۶ جھالر۔

www.bhatkallys.com

مکٹ[1] سٹیس پر نور کا تجلّی!
نکھے حال ودواں[2] علی مہابلی ہیں
پیغمبر کی مسند پہ بیٹھے جو حیدر
کری جو عدالت تو قاضی قضا ہیں
قاضی قضا کے، قدر چار دفتر
مفتی صدر پروہ ارض و سماں ہیں
نبی ہیں محمدؐ شفیع روز محشر
امیر عرب شاہ مشکل کشا ہیں

قصیدہ

اوّل تو خدا خوب دوسرے رسول خوب
کون کون خوبی کہوں قادر سبحان کی
منڈپ[4] بھی بہترے کیا صفت آسمان کی
اور فرش بھی بہترے کیا ریس ہے زمین کی
بیویاں بھی بہتری کیا ریس ہے، فاطمہ خاتونؓ کی
اور مرد بھی بہترے کیا ریس ہے مسلمان کی
اے جی مسلمان بھی بہترے کیا ریس ہے ایمان کی

---

[1] تاج۔ [2] نر۔ [3] عالم۔ [4] شامیانہ۔

www.bhatkallys.com

تیس روز روزے پنج وقت کی نماز
پھیرتے تسبیح اور سبق لیتے ہیں قرآن کا
ہر سُو باجت ہے ڈنکا دینِ اسلام کا
اورنگ زیب مہابلی، اے جی عید کی مبارکی
مہینہ اُترا رمضان کا

بھٹئی یا ہجو کا طریق یہ تھا کہ جس شخص کی ہجو منظور ہوتی، گو دڑ اکٹھا کر کے ایک پوٹلی سی بنا لیتے اُس پر ایک صاف کپڑا لپیٹ کر اور آنکھ ناک کان وغیرہ بنا کر اُس شخص کا اس پر نام لکھا جاتا پھر اُسے ایک نیزے یا بانس پر نصب کر کے بازاروں میں پھرتے اور جگہ جگہ کھڑے ہو کر بھٹئی اُڑاتے، اُس بھٹئی کا ایک نمونہ بھی ملاحظہ ہو:

بھٹئی

کلر[1] کو کھا کھیت کپٹ[2] کو کھا ہیت[3]
بیسا[4] بسوا اس بھٹیو[5] کب تک سمجھایئے
کاٹ کی تلوار سے کوئی[6] جنگ جیتے
رانگ کے روپے کو کب تک چلایئے
جو جاگتے ہی سو جائے اُسے کیوں کر جگایئے
پتھر کی مورت کو کب تک سمجھایئے

---

[1] بنجر زمین۔ [2] دشمنی۔ [3] محبت۔ [4] بیسیوں بار۔ [5] محبت۔ [6] ہوئی یعنی مشد۔

www.bhatkallys.com

اکبر بے اکبر تیری عقل پر پڑے پتھر
تو نے گنگ سے گنی[1] کو گیند[2] سے ترا[3] ایے

تیسری ٹکڑی عبدالرحمٰن، شرف الدین اور رحیم الدین قوالوں کی ہے جن کے سہرے آپ شروع میں پڑھ چکے ہیں۔ اُن کے متعلق اب اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ شادی بیاہ کی محفلوں کے قوال ہیں۔ ویسے بھی گاتے پھرتے ہیں۔ شادی کے دن سہروں کی صورت میں اپنا راگ الاپ کر شہدوں اور بھانڈوں کی چیخ و پکار میں شامل ہو جاتے ہیں، جو کچھ ان کی تقدیر کا ہوتا ہے وہ ان کو علٰحدہ مل جاتا ہے۔ اس کے سوا شہدوں اور بھانڈوں سے ان قوالوں کا اور کوئی تعلق نہیں۔

لہ ہاتھی۔ ئلہ روندوانا۔

www.bhatkallys.com

دِلّی کے "کرخندار"

صبح کا وقت ہے۔ سات بج رہے ہیں۔ خلیفہ بندو کے مکان پر اُن کے پڑھے لکھے دوست بابو ننھے خاں کھڑے ہیں کنڈی کھٹکھٹا کر اُن کو آواز دے رہے ہیں۔

بابو جی۔ خلیفہ، اے میاں خلیفہ جی۔

گھر والی۔ خدا کی سنوار ابھی منہ بھی نہیں دھویا ہے کہ خلیفہ جی کے چہیتے آنے شروع ہو گئے۔ اب میں ننھے کو بہلاؤں یا ان آنے جانے والوں کی خبر رکھوں..... ارے بھئی تم کون ہو؟

بابو جی۔ میں ہوں ننھے خاں، خلیفہ بندو ہیں۔

گھر والی۔ وہ تو ابھی سو رہے ہیں۔

بابو جی۔ اوہو ابھی تک! رات کب آئے تھے؟

گھر والی۔ معلوم نئیں، کوئی دو ڈھائی بجے آئے ہوں گے جو روز یا نہ آتے ہیں۔

بابو جی۔ اچھا اُن سے کہنا بابو ننھے خاں آئے ہیں مگر دیکھنا جگا تا مت۔

گھر والی۔ اُٹھنا..... اُٹھو ... اے اٹھو نا تمھارے ننھے خاں آئے ہیں۔

www.bhatkallys.com

خلیفہ بندو ۔ وہی کیا آفت ہے، کبھی کمبخت تمہارے اس ننھے سے فرصت بھی ملے گی یا نہیں ۔ جب دیکھو ننھا ننھا، میں کوئی تمہارے لمڈے کا خدمت گار رہوں۔

گھر والی ۔ اے کون کہے رہا ہے کہ تم بچے کو بہلاؤ، گودی بہلایا بھی ہے اس نِپستی پیٹے کو، خدمت گار تو تمہاری میں ہوں۔

خلیفہ بندو ۔ خانا خاں میں لڑتی ہو، صبح ہی صبح کو سیاپا شروع کردی، اِتنا خیال نئی کہ میں رات کو آدھے بجے سویا ہوں۔

گھر والی ۔ رات گئے روزیانہ آتے ہو، روز سونے میں دیری ہوتی ہے۔ میرا کیا ہرج ہے پڑے رہو لمبی تانے، روئے جا رہے تو بھی ۔ نِستی بیٹا کہیں کا اسے ملیا میٹ کردوں۔

خلیفہ بندو ۔ ارے تو بگڑ کاہے کو رئی ہے وہ تو بچہ ہے، یوں ہی روئے جائے گا۔

گھر والی ۔ یوں ہی روئے گا تو ہماری زبان بھی چلے گی ۔ ساری رات بلکن تمام رات اس موذی کے ہاتھوں جاگنا پڑتا ہے۔ خاک میں ملادوں ایسے گھر کو، نہ کم بخت دن چین نہ رات چین۔

خلیفہ بندو ۔ ٹھیر جا ری میں اُٹھتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے تو مجھ کو سونے نئی دے گی میں تو کہتا ہوں کہ وہی جانے دو جانے دو اور تو ہے کہ ٹر ٹر کیے جاتی ہے ۔ اب کے بولی تو دیکھ قسم ہے ساڑھے سولہ آنے کی یہ جوتی کھینچ کے ماروں گا۔ بُسمری نانی کی بیٹی ہے نا،

www.bhatkallys.com

قینچی کی طرح ان کی زبان چلے جاتی ہے۔

بابو جی۔ یہ کیا بات ہے خلیفہ جی! صبح ہی صبح لڑائی اچھی نہیں ادھر تو آؤ مجھے تم سے ایک کام ہے۔

خلیفہ بندو۔ اماں کیا بتاؤں بابو جی ہماری گھر والی نے تو ہمارا ناک کی پھلنگ میں دم کر دیا ہے۔

بابو جی۔ ارے میاں تم کو تو میں بُلا رہا ہوں۔ اس غریب عورت نے تم کو کب جگایا ہے۔

خلیفہ بندو۔ کچھ نئی جی کچھ نئی۔ آپ ٹھیر یئے ابھی آ رہا ہوں دو منٹ میں۔ او نیک بخت لپک کے زلدی سے ایک پان تو لگا دے بابو جی کو۔

گھر والی۔ اے آگ لگے ان بابو جی کے دم کو، صبح ہی صبح آ کے کِل کِل کرا دی۔ جاؤ نئی ہے پان دان۔ میں کیا تمہاری یا ان کی تنخواہ دار ہوں۔

خلیفہ بندو۔ اچھا یہ مطلب ہے تو آئندہ تو مجھ سے بات بھی نہ کریو بھلا، مجھ سے بھول کر بھی نہ بولیو۔

بابو جی۔ خلیفہ تم بھی لڑے جاتے ہو میں کہتا ہوں کہ تم ذرا باہر آجاؤ۔

خلیفہ بندو۔ ذرا ایک دو جھٹکے مار لوں بابو جی ابھی آیا ابھی دو منٹ میں۔

اتنے میں اُن کے ایک پڑوسی دوست خلیفہ شمو اُن کے مکان پر آتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں تیتروں کا ایک پنجرہ ہے

www.bhatkallys.com

جس پر لوزانی نگندوں کا ایک خوبصورت، غلاف چڑھا ہوا ہے۔ بابو

ننھے خاں سے دروازے پر مُڈبھیڑ ہوتی ہے۔

خلیفہ شمّو۔ سلام علیکم جناب! بابو جی مزاج تو اچھے ہیں آپ کے، اور کہیے

بال بچے آرام سے ہیں نا آپ کے۔

بابو جی۔ خدا کا شکر ہے خیریت ہے۔

خلیفہ شمّو۔ کہیے کیسے تکلیف فرمائی اِس وقت آپ نے۔

بابو جی۔ کیا بتاؤں خلیفہ جی اس وقت تو......

خلیفہ شمّو۔ کہیے کہیے خیریت تو ہے کیا کسی لمڈے نے آپ پر ہاتھ چھوڑ دیا؟

مجھے بتاؤ میں وِس حرامی کا ابھی ٹمنڈا کس دوں گا۔

بابو جی۔ نہیں بھائی یہ بات نہیں ہے۔

خلیفہ شمّو۔ اچھا پھر اور کیا؟

بابو جی۔ بات یہ ہے کہ کل خلیفہ بندو نے یہ کہا تھا کہ صبح آنا، شاہ جی کے

تالاب چلیں گے وہاں تیتر لڑیں گے لیکن

خلیفہ شمّو۔ لیکن کیا شاہ جی کے تلاؤ پر تو ہر جمعے لڑتے ہیں، بڑے بڑے

جنگی جوڑے پہنچتے ہیں، میں بھی تو وہیں جا رہا ہوں۔ دیکھنا

میرا یہ جناور کیسا لڑاتا ہے، تو پھر چلو نا، بے فضول میں کیوں

دیری کریں۔

بابو جی۔ چلتے ہیں خلیفہ بندو تو آجائیں۔

خلیفہ شمّو۔ اچھا میں اب سمجھا آپ اِن کی اِنتظاری میں کھڑے ہیں۔

www.bhatkallys.com

میں ابھی بلاتا ہوں۔ کیا نام کے کہ "خلیفہ بندو ہیں، ذی، کیا کر رہے ہو اندر؟ باہر آؤ نا زلدی سے، میں تو سمجھا کہ تم تلاڈ پر ہو گے۔

خلیفہ بندو۔ آرہا ہوں بھائی آرہا ہوں معاف کرنا بابوجی آپ کو بے نا ق اتی دیر کھڑا رہنا پڑا، کیا کروں صبو ہی صبو یہ لگائی پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئی۔ خدا توڑی گالیاں نہ کھائے سیدھی نئی ہوتی۔

خلیفہ شمو۔ پیارے سر پہ چڑھانے کا یہی نتیجہ ہے ہماری جورہ کی مجال نہیں جو ہوں کرے۔

بابوجی۔ اچھا بھئی خلیفہ اب چلو کہیں پابلی کا وقت ختم ہو جائے۔

خلیفہ شمو۔ بہت ٹھیک صلاہے۔ بابوجی مگر یہ تو بتاؤ کہ تلاڈ پہ چلو گے کس طریاں۔

خلیفہ بندو۔ ذی خلیفہ شمو میں بتاؤں سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر لو ایک پل میں پہنچ جاؤ گے۔

خلیفہ شمو۔ یار تم تو مذاخ کرتے ہو۔

خلیفہ بندو۔ بڑی مشکلوں کی بات ہے تم میرا اقین نئی کرتے اچھا آؤ بازار توڑی تو چلو۔

تینوں جامع مسجد پر پہنچتے ہیں تانگے والے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں اور چیخ چیخ کر سواریاں تانگے میں بٹھا رہے ہیں۔

"آؤ ایک سواری گھنٹہ گھر، فتح پوری، قطب روڈ کو"

"آؤ بابوجی منڈی کو، فرسٹ لے جاؤں گا ٹریم سے پہلے"

www.bhatkallys.com

"بابو جی میں چلوں، کہاں جائیں گے آپ؟ آیئے بیٹھئے ابھی چلتا ہوں۔"

بابو جی۔ اچھا بھئی خلیفہ اب تم ایک تانگہ کر لو۔

خلیفہ شمو۔ پہلے اپنا بھی یہ ہی خیالات تو تھا۔

خلیفہ بندو۔ نئیں پیارے پا پیادہ اپنی ٹانگوں سے پیدل چلو، تانگے کا لُطف تو ہمارے توندل یار کے تانگے میں آتا ہے۔ فس کلاس تانگہ ہے، دبڑ ٹیر کا ہوا کی طریوں فروٹ دوڑتا ہے۔

خلیفہ شمو۔ ابے خلیفہ دیکھ تو سہی نہ سامنے کون کھڑا ہوا ہے توندل، تیرا یار تانگہ لیئے ہوئے۔

خلیفہ بندو۔ یار کاں ہے مجھے تو ٹیا بھی نئی۔

خلیفہ شمو۔ ابے مجھ کو معلوم ہے تجھے دن میں ذرا کم ٹپائی دیتا ہے۔ اچھا دیکھ میری آنکھ سے دیکھ وہ جُما مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے کوابی کی بریج کے پاس۔

خلیفہ بندو۔ دیئی خوب بھا نپا، خلیفہ تیری آنکھ تو این مین چیل کی سی ہے کو وی ہی توندل پیارے!

توندل۔ آ و خلیفہ تم تو عید کا چاند ہو گئے۔

خلیفہ بندو۔ چاند وا ند تو پچھلی رات کو دیکھیو پیارے، لیک کر تلاؤ تو ڑی تو لے چل بڑی زلدی میں ہوں اس وخت۔

توندل۔ خوب بولتے ہو خلیفہ جیسے تمارے گھر کی گھوڑی ہے۔

www.bhatkallys.com

خلیفہ بندو - دیکھو وئی چخلش بازی تو کرنئی، قسم ہے اُڑان جھلّے کی اکھیڑ میں بیٹھ جاوں گا، فر تو اگاڑی پچھاڑی کو ٹٹولتا ہی رہے گا۔

توندل - وی میری گھوڑی کالی چیز سے جھکتی ہے - یار بُرا تو مانیو نئی، تُو ہے بالکل شیاہ فام۔

خلیفہ بندو - اچھا توندل تم دِس دنا کی بات بھول گئے، کوئی ہرجہ نئی کدی یار خاں کے قوضے میں بھی تو آؤ گے نا۔

توندل - وا دئی خلیفہ تم تو خفا ہو گئے اچھا آؤ بیٹھو۔

خلیفہ شمّو - وئی یہ گھوڑا تو بہت بد کس معلوم ہوتا ہے۔

توندل - چلو بیٹا...... ٹِک ٹِک چِک...... ہتی ٹِک ٹِک...... ہتی ہتی ...... ابے چل نا۔

بابوجی - کیوں بھئی یہ کیا؟

توندل - اجی چلیتوں کو تو کرخندار نے ٹوک دیا اب چلے کہاں سے؟

خلیفہ شمّو - کیوں وئی یہ کیا نخریز ہے بیچ سڑک میں؟

بابوجی - خلیفہ بندو اگر یہ نہ چلا تو ہم بازی دیکھ چکے۔

خلیفہ بندو - نئی بابوجی میں چلاتا ہوں یقین کرنا، جاں میں نے گھوڑے کو ایک چابک لگایا، بس وِسی ملٹ چل پڑے گا - نئی تو میرا نام خلیفہ نئی، توندل پیارے دیجیو ذرا چابک۔

چابک لگاتے ہی گھوڑا اچل پڑتا ہے۔

بابوجی - واہ بھئی واہ کیا کہنے ہیں خلیفہ کے۔

www.bhatkallys.com

خلیفہ شمو۔ ارے خلیفہ واقعی میں تُو تو بڑا کاری گر نکلا۔

خلیفہ بندو۔ بیٹا معلوم ہوتا ہے میرا ادھوڑی کا تیرے سر پہ ٹھیک پڑا نہیں تو تُو بھی پورا ٹھیک ہو جاتا۔

توندل۔ ایک طرف کو، ایک طرف کو، ہٹو ہٹو، بچو بچو، ہٹنا بھائی سیکل والے جن ٹل میں۔ اوبے ٹم ٹم والے بائیں کو، ہٹ جابے ٹھیلے والے بیچ سے، ادہر ہو جاؤ بابو جی پٹڑی پر۔

لیجئے۔ وہ شاہ جی کے تالاب پر آ گئے۔ تالاب کی سوتیں تو بند ہو چکی ہیں، کچھ بارش کا پانی جمع ہو گیا ہے۔ چاروں طرف اس کی سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ تالاب کے پاس درختوں کے کچھ جھنڈ ہیں۔ سورج کی کرنیں پتوں سے چھن چھن کر زمین پر پڑ رہی ہیں۔ یہاں پر ایک کنواں بھی ہے۔ دو تین آدمی پانی بھر رہے ہیں اور بہت سے پینے کے لئے نیچے کھڑے ہیں۔ ایک آدمی اُن کو پلا رہا ہے۔ دوسرا کنوئیں کی منڈیر پر جو مٹکے رکھے ہوئے ہیں اُن کو بھر رہا ہے۔ دو تین پہلوان ڈنڑ اور بیٹھک لگانے میں مصروف ہیں۔ ایک طرف درخت کے نیچے ایک بوڑھے، لمبی ڈاڑھی والے شاہ جی آسن جمائے چھوٹی سی چلم تھامے چرس کا دم لگانے میں مصروف ہیں۔ شاہ صاحب کے سامنے کچھ اوباش اور بے فکرے بیٹھے ہیں، جن میں کچھ بوڑھے ہیں اور کچھ جوان۔ باری باری وہ بھی دم لگاتے ہیں۔ کنوئیں سے کچھ دور انہی درختوں کے جھنڈ میں تیتر باز جمع ہیں۔ باری باری اپنے تیتر

www.bhatkallys.com

لڑا رہے ہیں، چاروں طرف خلقت کا ہجوم ہے۔ واہ واہ! واہ واہ! وہ مارا، وہ مارا، چت کر دیا، بھاگ گیا، بھاگ گیا، کا شور غل ہو رہا ہے۔ اتنے میں بابو بختے خاں، خلیفہ بندو اور خلیفہ شمو اپنا پنجرہ لیے ہوئے مجمع میں داخل ہوئے۔ لوگ اُن کو دیکھتے ہی چیخ اُٹھے:

"خلیفہ شمو کا تیتر لڑے گا وہی خلیفہ شمو کا"

خلیفہ شمو۔ کیوں نہیں نو مرتبہ لڑا ہے اور ہر وار ہی مار کر نکل آیا ہے کسی کا جیوٹ ہو تو چھوڑو نا میدان میں!

شدو پہلوان۔ کیا کہتے ہو خلیفہ ذرا میرے تیتر سے تو لڑاؤ معلوم ہو جائے گا، کس کا جیوٹ ہے اور کس کا بھاگتا ہے؟ یہ لو میں اپنا تیتر چھوڑتا ہوں۔

خلیفہ شمو۔ دیکھو بھئی تو لڑا تو رہا ہے اگر تیرا بھاگ گیا تو پانچ روپے اور تیتر لے لوں گا۔

شدو پہلوان۔ اور اگر تیرا ہارا تو میں لے لوں گا۔ پیارے۔

خلیفہ شمو۔ ہاں ہاں، ہوگئی، ہوگئی بس ہوگئی۔ چل بیٹا پٹیلو، اجٹ جا اس سے۔

خلیفہ بندو۔ لو بھئی بابو جی، اب لڑائی کا مزہ آئے گا۔ آگے آ کے دیکھو نا۔

بابو جی۔ بے فکر رہو میں خوب دیکھ رہا ہوں۔ خلیفہ ذرا اِن کا اکڑ اکڑ کر پھرنا تو دیکھو۔ لو وہ دونوں آگے بڑھے، تیور بگڑ نے

www.bhatkallys.com

لگے ۔ اس کے پر پھول گئے ۔ اُس کی گردن بلند ہو گئی ۔ خلیفہ شمّو
والا بول رہا ہے ۔ ارے وہ دوسرا تو اس سے بھی زور سے چیخا ۔
لو بھئی وہ جُٹ گئے ، گتھم گتھا ہونے لگی ۔ چونچیں اور پنجے چل رہے
ہیں ۔

خلیفہ بندو ۔ بابو جی ، تم نے دیکھا ہی کیا ؟ دونوں کی آنکھوں کو دیکھو ، کیسی لڑ رہی
ہیں ۔ ایک ایک چال پہ نظر ہے ایک ایک چال پہ ، سچ جانو ،
اس وقت دونوں کی جانوں پر بنی ہوئی ہے ۔ ایک دوسرے کے
خون کا پیاسا ہو رہا ہے ۔

بابو جی ۔ یہ خلیفہ شمّو اور شدّو تیتروں کے ساتھ کیوں پھُدکتے پھر رہے ہیں ؟

خلیفہ بندو ۔ بابو جی تم سمجھے نہیں ، جدھر کو جس کا تیتر جاتا ہے وہ ادھر کو جاتا
ہے ، تاکہ جناوروں کا دل بڑھاوا رہے ، خلیفہ کو دیکھو نا کتنا جوش
دلا رہے ہیں ۔

خلیفہ شمّو ۔ اوئی اوئی اوئی ۔

بابو جی ۔ دیکھنا دیکھنا ۔ خلیفہ وہ دونوں اُچھل کر ہوا میں بلند ہوئے ۔ ارے
وہ تو ہوا ہی میں گتھ گئے ۔ ایک کے پنجے دوسرے کی رانوں اور
پٹھوں میں دھنسے ہوئے ہیں ۔ دوسرے کی چونچ اُس کی آنکھ میں
گڑی ہوئی ہے ۔ پر نچ نچ کر نیچے گر رہے ہیں ۔ زخموں سے خون
ٹپک رہا ہے ۔

ایک آواز ۔ لو وئی شدّو والا بھاگ گیا ۔ ٹانگ ٹوٹ گئی ہے سالے کی ۔

www.bhatkallys.com

دوسری آواز۔ ارے دِس نے کیا نلو چھوڑا ہے، دیکھو تو بھی شمّو والے کی دینی آنکھ پھوڑ کر بھاگا ہے۔

تیسری آواز۔ وِئی کانڑا کر دیا ہے، بازار بند ہو گیا ہے ایک طرف کا۔

خلیفہ بندو۔ آؤ وئی بابوجی خلیفہ شمّو کو مبارکی دیں۔ میں نے کیا وئی خلیفہ مبارک ہو جیت گئے نا۔

خلیفہ شمّو۔ ہاں وئی جیت تو گئے مگر یار ہمارے تیتر کی آنکھ جاتی رہی کیا کیا جائے؟ اس کا بڑا افسوس ہو رہا ہے۔

خلیفہ بندو۔ وئی تو نے بھلی فِکر کی، یہ تیرا تیتر تو دجّال کا پوتا ہے۔ دادا بھی کانڑا پوتا بھی کانڑا۔

بابوجی۔ آؤ خلیفہ اب چلیں۔ گیارہ بج رہے ہیں۔

خلیفہ بندو۔ اپنا تو کچھ اور ہی خیال ہو رہا ہے بابوجی۔

خلیفہ شمّو۔ وہ کیا وئی؟

خلیفہ بندو۔ تو ندل یار کا تانگہ تو ہے ہی، دِس میں بیٹھ کے ذرا نظام الدّین تو رہی چلیں۔

بابوجی۔ تو آج معلوم ہوتا ہے روٹی کی بجائے خالی ہوا ہی کھاؤ گے۔

خلیفہ بندو۔ ہوا کیوں کھائیں گے؟ آخر ہمارے یار نے پانچ روپے جیتے ہیں یا نہیں؟ دِس میں اپنا بھی تو حق ہے کیوں وئی خلیفہ تیرا دم کیوں فق ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟ ہمایوں باشاہ کے مقبرے میں مٹھائی اُڑے گی نا؟ ایسے میں نہیں کہہ دے گدی بابوجی کے سامنے

www.bhatkallys.com

واں میری ہیٹی کرائیے۔

خلیفہ شمّو۔ دی تیرے سے ہیں کیا باہر ہوں مگر یاد مجھے تو اپنے پیٹیلو کی آنکھ کا فخر ہو رہا ہے۔

خلیفہ بندو۔ دیٔ پیارے تُو دل پہ ملال منہ لا۔ وہ کوئی ڈھیلا باہر تھوڑی نکلا ہے، ذرا سی چوٹ لگی تھی وہ پچک گیٔ۔ واں چل کر تو دل کے اندر بالکل درمیان سے دعا مانگیو، اللہ نے چاہا تو تیسرے دن نمودار ہے، کنٹورا سی آنکھ رکھی ہے۔

بابوجی۔ اچھا خلیفہ مجھ کو تو جانے ہی دو کیونکہ آج جامع مسجد میں جمعہ کی نماز بھی پڑھنی ہے۔

خلیفہ شمّو۔ نئ بابوجی یہ تو کدی نئ ہوگا واں بھی تو نماز ہو سکتی ہے۔

خلیفہ بندو۔ ہاں بابوجی ٹھیک تو ہے آپ ذرا عقل و َندی سے کام لیں۔ خدا تو سب جنگہ ہے۔ اِس جنگہ بھی اُس جنگہ بھی، کچھ بھی ہو اب تو چلنا ہی پڑے گا۔

بابوجی۔ اچھا اچھا بھیٔ جیسی تمھاری مرضی۔

تینوں دوبارہ تو ندل کے تانگے میں سوار ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں نظام الدین جا پہنچے ہیں۔ تانگہ مقبرے کے پاس چھوڑ کر پہلے درگاہ کی طرف جاتے ہیں۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی باوَلی دکھائی دیتی ہے۔

خلیفہ بندو۔ دیکھا بابوجی تم نے واں شَیر میں کتےؔ زوروں کی لُوں چل رئی

www.bhatkallys.com

کھی اور یہاں چاند چک ٹھنڈی ہوا کا کیسا جھونکا آیا، میری تو جان میں جان آگئی۔

بابوجی۔ دل چاہے تو باؤلی میں نہا آؤ۔ خلیفہ شمو بھی ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

خلیفہ بندو۔ وہی خوب یاد دلایا بابوجی تم نے۔ گرمی بھی جھٹ جل جائے گی اور سارے گناہ بھی دھل جائیں گے۔ چلو وہی خلیفہ شمو نہاؤ پیارے سن لیٹ سوپ کے صابن کی ٹکیہ تو تمھارے پاس ہے ہی، خوب مل مل کے نہائیں گے۔

خلیفہ شمو۔ نہیں پیارے میں نے سنا ہے یہ بھینٹ لیتی ہے، اگر اس نے مجھے بھینٹ لے لیا تو میری جوزہ بیوہ ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ازیں میرے بٹیلو کو فر کون پالے گا۔

خلیفہ بندو۔ ابے جا یار تو نے بھلا فکر کیا۔ جد تو رٹی ہیں زندہ ہوں تجھے مرنے تھوڑی دوں گا اور سن اگر تو نہا کے فاتیاں پڑھے گا تو بس ایک دفے کی فاتیاں میں بٹیلو کی آنکھ اچھی ہو جائے گی۔

بابوجی۔ اچھا بھئی تم لوگ نہاؤ، میں اتنے میں فاتحہ پڑھ آؤں۔

خلیفہ بندو۔ بہت ٹھیک صلاح ہے مگر ایک کار خیر اور کرتے آؤ تو بڑی مہروانی ہوگی آپ کی، عمر بھر یاد رکھوں گا آپ کو۔

بابوجی۔ بولو، بولو کیا بات ہے خلیفہ؟

خلیفہ بندو۔ وہی شمو خلیفہ تم ان کو دو روپے دے دو۔ بابوجی جب آپ فاتیاں پڑھ لیں تو بستی میں جا کر کلو حلوائی کی دوکان سے، وہ بس مجد کے نکڑ ہی پر ہے نا، دو روپے کی مٹھائی خرید کر ناک کی سیدھ میں مجرے چلے جانا۔ ہم سب فراغت پا کر وہیں آ جائیں گے۔ کیوں

www.bhatkallys.com

کیسی رہی؟

بابوجی۔ کیا کہنے ہیں خلیفہ کے؟ بہت دُور کی کوڑی لائے ہو۔

بابو ننھے خاں پہلے درگاہ میں اور بعد میں مٹھائی لے کر مقبرے پہنچتے ہیں۔ اُن کے پیچھے خلیفہ بندو اور خلیفہ شمّو نہانے کے بعد حضرت کے مزار پر جاتے ہیں۔ خلیفہ شمّو فاتحہ پڑھ کر دُعا مانگ رہے ہیں۔

خلیفہ شمّو۔ اے نظام الدین اولیا، رحمۃ تو ڑی میری جان میں جان ہے تمام عمر بلکن ساری زندگی بھر تمارا یہ احسان نئیں بھولوں گا آج صبو میرے بٹیلو کی ایک آنکھ جاتی رئی ہے، وہ کل تک اچھی ہو جائے تو فِر میں پا پیادہ پیدل چل کر تو جُندی جمعرات کو پھولوں کی چدر اور مٹھیائی چڑھاؤں گا۔

فاتحے سے فراغت پا کر خلیفہ بندو اور شمّو مقبرے پہنچتے ہیں۔ بابو ننھے خاں گھاس پر ایک درخت کے نیچے دو چار آدمیوں کے پاس بیٹھے ہیں، خلیفہ بندو کو آتا ہوا دیکھ کر آواز دیتے ہیں۔

بابوجی۔ آؤ خلیفہ بندو آؤ۔ تمھارے یہ دوست بھی تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔

خلیفہ بندو۔ کوؤئی منتیاز، یار تم یاں کاں؟ ارے اِشاق اور فجّو بھی ہیں ڈئی۔

خلیفہ شمّو۔ یہ بات اَقل میں نئی آتی کہ تم سب جان جیک یاں کیسے چلے آرئے؟

www.bhatkallys.com

شابو پہلوان کے نیچے آتے ہی سب مٹھائی مانگتے ہیں۔ شابو ٹوکری سنبھال کر دوستوں میں مٹھائی بانٹنا شروع کرتے ہیں۔

شابو پہلوان۔ یہ لیجئے باؤجی آپ کا حصہ۔

فجو۔ لاؤ پہلوان مجھے بھی یہ تبرک دو، نئی تو تم جانتے ہو فرہیں ہاں۔

اِشاق۔ ابے، تو کیا کرے گا کھا کے، جا بہشتی کو تو آواز دے پہلے۔

فجو۔ دئی، یہ جھانسہ کسی اور کو دیجیو پیارے، یاں سے یار خاں مَرِیم پہ ٹلیم نہیں اور جو تجھے سچ مچ پانی کی ضرورت ہے تو یہ تیرا پرانا یار توندل بیٹھا ہے۔ پھوڑ اِس پُرانے مٹکے کو، مار اس کی توند میں ٹھکو، ابھی پانی بھلل بھلل نکلا۔

مُمتیاز۔ دئی رہسائی میں تو سب کچھ ہو جائے گا۔

خلیفہ بُندو۔ دیکھو دیکھو پہلوان دِس لے مارا اچھیٹا۔

شابو پہلوان۔ یار بڑا ہی نالائق ہے تو، دیکھ نا ساری ٹوکری گرا دی۔ نئی معلوم یار یہ فجو کون سے کنگلوں کی صحبت میں رہتا ہے؟ اپنی پالٹی میں تو ایک بھی شخص نئی، نفرت ہے پیارے اس سے۔

توندل۔ چھوڑ یار اس کل کل کو یونہیں بیٹھ کے کھاؤ۔

مٹھائی کھا پی کر سب ایک جگہ بیٹھتے ہیں تاش کھیلنے کی سوجھتی ہے، مُمتیاز، اِشاق، فجو اور شابو چاروں مل کر تاش کھیلتے ہیں۔ خلیفہ شمو پنجرے سے تیتر نکال کر اسے گھاس میں کھلاتے ہیں،

www.bhatkallys.com

اشاق اور فجو، شابو پہلوان کے تانگے میں دلی شہر کی طرف واپس جارہے ہیں۔ تو ندل کا تانگہ شابو پہلوان کے تانگے سے ذرا آگے چل رہا ہے۔ شابو اپنے گھوڑے کو ذرا تیز کر کے تو ندل کے برابر لے آتا ہے پھر دیکھ کر تو ندل کہتا ہے۔

تو ندل۔ کیوں جی پہلوان کیا دوڑ کو جی چار یا ہے؟

شابو پہلوان۔ کیا ہرج ہے ایک ریس ہو جائے۔

تو ندل۔ ارے جا رہنے دے یار کہیں ریس کی بٹیس ہو جائے۔

شابو پہلوان۔ پر کیجی نا فجر اپنے اڑیل ٹٹو کی۔

تو ندل۔ ابے، تو اپنے اس مریل اور نکھٹو کی تو خیر لے ابھی کمیٹی کا بے رحمی والا دیکھ لے تو الٹے پیروں ہسپتال جاتا پھرے گا۔

شابو پہلوان۔ تو فر دوڑا کے دیکھ لے نا۔ دلی دروازے تک ڈھول پھانکتا آئے گا۔

تو ندل۔ ابے، چپ بے فضول میں کیوں ڈھول پیٹ رہا ہے، ڈھول تو پیچھو کھلائیو پہلے اپنے گدھے کی جھول تو سنبھال لے آجا میرے پیچھو پیچھو دوڑ تا ہوا، دلی دروازے تو ڑی پکڑ لے تو وئی تیری ٹانگ تلے سے نکل جاؤں گا۔

دوڑ شروع ہو گئی۔ دونوں گھوڑے بے تحاشا دوڑ رہے ہیں ابھی تک دونوں برابر ہیں۔ لو وہ تو ندل کا گھوڑا آگے نکل گیا۔ بابو نتھے خاں سخت حیران و پریشان ہیں۔ ڈر رہے

www.bhatkallys.com

بھئی میں کہتا ہوں مُنہ سے تو کٹو کیا ہے ؟

گھر والی۔ کیا کہوں میں نے تو سمجھ لیا کہ تم مر گئے اور یہ یتیم ہو گیا۔

خلیفہ بندو۔ فرو ہی کو ساپیٹی جنبو ہی کو کل کِل ہو چکی ہے۔

گھر والی۔ خُدا کرے کہ ہر وَخت ہو۔ رات دِن جیسے میں کھولتی ہوں الٹی اس سے زادہ تم جلو۔

خلیفہ بندو۔ وئی عجیب تماش کی عورت ہے تُو کدی سیدھی طریوں بات ناہی نئی کرتی۔

گھر والی۔ مجھے کیا غرض صبو جو کیا تھا کہ بھول کر بھی نہ بولیو، بس اسی بات پہ قائم رہو۔ مجھ سے بولنے کی آپ کو کوئی ضروریت نئی۔

خلیفہ بندو۔ تو فر اس لمنڈے کو کون بہلائے گا ؟

گھر والی۔ میں کیا جانوں ؟

خلیفہ بندو۔ فر کون جانے گا ؟

گھر والی۔ اچھا آپ تو دن دن بھر یوں غائب رہیں اور رات کو دو دو بجے آئیں اور میں ہر وَخت ان کے تنمنے کو بہلاتی رہوں۔ جیسے میں ان کے گھر کی لونڈی ہوں۔ بہلائے میری جوتی "یہ مرے یا جیئے"۔

خلیفہ بندو۔ دیکھ ری تو زبان سنبھال کے بول، صبو کا گیا گیا تو میں اس وَخت آیا ہوں تو کھانا دینے سے توری اُلٹی جو تم بیزار پر آمادہ ہے۔ ہم نے کہہ دیا نیک بخت ہتو اپنا روٹی ٹکڑا لے جا۔

www.bhatkallys.com

تجھے کیا ہم چاہے جب آئیں اور چاہے جو کچھ کریں تم موئی کون ہے ہماری مزاحم۔

گھر والی۔ مرے اروٹی کپڑا دیتے، کل سے گھر میں تیل ہے نہ ایندھن۔ وہی مثل ہے کہ باہر میاں ہفت ہزاری گھر میں جورو فاقوں ماری۔

خلیفہ بندو۔ کیوں کدی تجھے کچھ کھلایا نہیں، پلایا نہیں، کیا نہیں دیا تجھ کو؟

گھر والی۔ بڑے رئیس بڑے جید اودالے۔

خلیفہ بندو۔ تو تو اپنے ساتھ بڑا دان دہیز لائی ہے نا۔

گھر والی۔ کیوں لائی کیوں نہیں، تھوڑا لائی یا بہت لائی تو اپنا، تمہاری طرح تھوڑی دھوکے سے اپنی بہنا کا زیور چڑھا دیا اور پھر واپس لے لیا تھوک کر چاٹ لیا۔

خلیفہ بندو۔ اس میں کیا ہرج ہے آج کل تو بڑے بڑے رئیسوں کے ہاں یونہیں ہو رہا ہے۔ جب ہمارے پاس ہوگا تو بہتیرا بنا دیں گے۔

گھر والی۔ ٹھوکر مارتی ہوں ایسی نگوڑی اوبگھے کو، جاں رات دن سولی ہو، میں تو کہتی ہوں جانے دو، جانے دو اور وہ کہتے ہیں کہ تو میرے اترے پترے کھول، ابھی اور رنن فریب جتاؤں گی تو میاں ناچتے پھریں گے۔

خلیفہ بندو۔ بھلا رہی تو یوں چپ نہیں رہے گی۔ جلد تھوڑی تو جوتیاں

www.bhatkallys.com

اور گالیاں نہ کھائے۔ اب کے بولی تو منہ توڑ دوں گا۔ یاد رکھ۔

گھروالی۔ تمہاری جنتی پہ طلاخ ہے جو تم کسر کرو۔ تم نے کیا مجھے بے ماں باپ کا سمجھا ہے؟ مار کے تو دیکھو کیسا مزہ چکھوائی ہوں۔

خلیفہ بندو۔ بھاری ٹھہر میں تجھے بتاتا ہوں۔ "ہوں" لے بلا اب اپنے حمایتوں کو۔ دیکھوں تو کون تیری چُٹیا چھڑاتا ہے؟

گھروالی۔ ارے تیرا جنازہ نکلے، مار ڈال ظالم، مجھے مار ڈال، اوئی اوئی، ہائے ہائے، میں مری، ارے میں مری، ہمسائی مجھے آکر بچاؤ۔ اس موذی کے ہاتھوں سے میری چٹیا چھڑاؤ، ارے خدا کے لئے کوئی بچاؤ۔ میں مری، میں مری۔

---

www.bhatkallys.com

دِلّی کے دُھوبی

دِلّی کے چاوڑی بازار میں کوچہ میر عاشق کے سامنے شاہ جی کا چھتّہ ہے اس کے اندر ایک چھوٹی سی بستی دھوبیوں کی بھی ہے۔ یہ لوگ ایک بڑے کٹڑے میں آباد ہیں۔ کٹڑے کے دروازے پر ایک بڑا اونچا پھاٹک ہے جو ہر وقت کی آمد و رفت کے باعث دِن رات کُھلا رہتا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے کے رُخ پر دُکانیں سی نظر آتی ہیں۔ دائیں بائیں بھی اسی قسم کی دُکانیں ہیں۔ یہی اِن غریب دھوبیوں کے گھر ہیں۔ ان دُکانوں کے آگے تینوں طرف ایک بڑا چبوترا ہے۔ چبوترے کے نیچے ایک نالی ہے۔ بعض مکانوں کے آگے پھوس کے چھپر ہیں اور بعض نے ٹاٹ کے پردے ڈال رکھے ہیں تاکہ دھوپ اور بارش سے محفوظ رہیں۔ صحن تمام کچّا ہے۔ جس میں جابجا کھونٹے گڑے ہیں۔ بہت سے کھونٹوں میں بیل بندھے ہوئے ہیں۔ چبوترے

www.bhatkallys.com

پر نالی کے قریب کئی مٹی کی نانْدیں اور ہودے رکھے ہیں۔ کسی میں پانی بھرا ہے کسی میں میلے کپڑوں کی گیلی پنڈھیں پڑی ہیں۔ کہیں کہیں بانسوں کے سہارے تار اور رسیاں بندھی ہیں۔ اِن الگنیوں پر ضرورت کے وقت دُھلے ہوئے کپڑے لٹکا کر سکھاتے ہیں۔ اکثر گھروں میں ایک ایک بھٹی اور بھٹی کے پاس چولھا ہے۔ ایک دو چار پائیاں گھر کے اندر پڑی ہیں جن پر دُھلے ہوئے کپڑوں کی لادیاں بندھی رکھی ہیں۔ دو تین باہر بچھی ہیں جو اُٹھنے بیٹھنے کے لئے ہیں۔

گرمی کا موسم ہے، رات کا آخری سماں ہے۔ ہر طرف خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی مرغ کی اذان سُنائی دیتی ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بے خبر سو رہے ہیں۔ لیکن دھوبیوں کی دُنیا میں بہت دیر ہوئی صبح ہو چکی۔ کپڑے کے بہت سے دھوبی آنکھیں ملتے، جمائیاں لیتے اور انگڑائیاں توڑتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ کوئی چارپائی پر بیٹھا ابھی اونگھ رہا ہے، کوئی کھانسی سے پریشان ہو کر بے تحاشا کھانس رہا ہے۔ بیل بھی جاگ اُٹھے ہیں۔ اُن کے ہلنے جلنے سے گلے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ کتنے دھوبی نے تو اپنے بیل پر کپڑوں کی لادیاں

www.bhatkallys.com

لاد بھی دیں۔ کلّن کا پڑوسی وزیرا بھی لادیاں لادنے میں مصروف ہے۔ آہستہ آہستہ دھیمی لے میں کچھ گاتا بھی جاتا ہے:

دھوبی کا البیلا چھیل
بھور بھوتے ہی لادا بیل
دھیان لگایا پانی سے
تیلی کا بیل کیا جانے سیل
لگا رہے نت گھانی سے
دانہ گھاس اُس کو نہ بھاوے
رچاوے سانی سے
دھوبی کا البیلا چھیل

وزیرا۔ کیوں چاچا۔ آج گیندا کاں ہے گھاٹ چلے گا نا رکھوالی کو؟
کلّن۔ وہ کھڑا جو ترے پر بالیٹ کے دھو رہے۔
وزیرا۔ ارے دیکھیو چاچا! عیدو کو بیل ستا رہا ہے۔ یہ کل بھی کھونٹا توڑ کر بھاگا تھا۔
کلّن۔ بھیا تو تو جلدی جلدی لاد، گدی یہیں دن نکل آئے۔ دیکھ تو اجالا ہو چلا۔
عیدو۔ چاچا رہو رے، اے ٹھیر جا میں بھی تیرے سنگ چلوں ہوں۔
کلّن۔ اَبے چلے گا بھی، تیرا بیل تو آج شاید ہی سیدھا ہو۔

www.bhatkallys.com

وزیرا۔ ارے بھیا نیا نیا ہے، لگائی کی طرویں ذرا نخرے کرتا ہے۔

کلن۔ اور کیا، جب وہ نخرے کرے ہے تو بیل کیوں نہ کرے گا۔

وزیرا۔ یہ تو ٹھیک ہے چاچا، پر عیدو اگر ذرا سختی سے پیش آئے تو ابھی دو دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔

عیدو۔ چاچا تم یقین کرکے مانو اس بیل سے تو میں تنگ آ گیا۔ جرّبے جرّبے لات چلاتا ہے۔ کبھی سینگ مارتا ہے۔ اے دیکھو اب اس نے بالٹی پہ لات ماری...... لینا لینا، چاچا اس بیل کو، پاجی نے ساری لادیاں گرا دیں۔

وزیرا۔ ابے واہ بے، تجھ سے بیل بھی نہ پکڑا جائے پھر تو دھوبی کاہے کو بن بیٹھا؟

عیدو۔ نا بھیا نا میں کہوں اور کسی سوتے کے چوٹ چپیٹ لگ جائے تو بے فضول میں ہلا ہو گا۔ بڑا مرکھنا ہے کم بخت۔

کلن۔ ابے چل چل ادھر آ، لے تھام اپنا بیل، لدوا ئیو بھیا وزیرا اس کی لادیاں، مصیبت کی جان تو ائی میں تو ھئی۔

کلن وزیرا اور عیدو تینوں گھاٹ روانہ ہوتے ہیں۔ آگے پیچھے اور بھی دھوبی جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں دن نکل آتا ہے۔ کنڑے کا ہر چھوٹا بڑا جاگ اٹھا ہے۔ کوئی بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ وہ دیکھئے عیدو کی جورو لاڈو بیٹھی منہ دھو رہی ہے کلن کی گھر والی

www.bhatkallys.com

شمو ٹانگیں پسارے بیٹھی پان بنا رہی ہے۔ شمو کا

لڑکا اُس سے روٹی مانگ رہا ہے۔

"او ماں، اری او ماں، روٹی دے دے، روٹی"

"ارے واہ رے لمڈے تجھے کھاٹ سے اُٹھتے ہی بھوک

لگ آئی، کیا ٹھیک ہے تیرا۔"

"دے دے نا، مجھے بھوک لگی ہے نہیں تو باپو سے کہہ دوں گا"

"جا جا ہانڈی میں پڑی ہے، کھالے۔"

"نہیں مجھے تو تو دے۔"

"چل چل یہاں سے ایک لات ماروں گی حرامی کے۔"

"اری تو روٹی دے ہے یا نا۔"

"دیکھ رے میں مارتی ہوں جوتی، پھر تیرا باپ بھی آئے گا تو

نہ چھوڑوں گی۔"

(منہ چڑا کر) "بھلا مار تو کیسے مارتی ہے؟"

"ارے ٹھیر تو بھی حرامی! تو جانتا کاں ہے بھاگ کر، تیرا سر نہ

پھوڑوں تو نام نہیں۔"

جوتی کھینچ کر مارتی ہے جو اتفاق سے لاڈو

کے منہ پر جا لگتی ہے۔

"اری او اندھی، یہ تو نے جوتی کیوں ماری؟"

"اندھی ہو گی تو، میں نے تیرے کب ماری؟"

www.bhatkallys.com

"میرے نہیں ماری تو کیا اپنی اماں کے ماری تھی؟"

"تو مارتی آئی ہوگی اپنی اماں کو، میں تو لمڈے کو مار رہی تھی۔"

"اچھا! مارتے وقت مجھ کو نہیں دیکھا، یہ بیل کے دیدے کیا بٹم ہوگئے تھے؟"

"کیا کریں نہیں دکھا اُس وخت، تیری طریوں میری آنکھیں چیل کی تھوڑی ہیں۔"

"کیوں ری، اگر میری آنکھ پھوٹ جاتی، وہ تو یوں کہو اچٹتی وی لگی۔"

"پھوٹ جاتی تو کیا ہوتا؟"

"ایسا مزہ چکھاتی کہ ہمیش ہمیش یاد رکھتی۔"

"اری جا سٹلو، تجھ جیسی بیسیوں پھرے ہیں رات دن، بتا تو کیا مزہ چکھواتی؟"

"مزہ! اری ایک کے بدلے تیری دونوں پھوڑتی، دونوں اور تیرا خصم بولتا تو اُس کو بھی کانڑا کرتی۔"

"اوہو! تو ہے بھی تو جلاد کی جورو کٹنی کی شکل تو دیکھو۔"

"تجھ ہتنی سے تو اچھی ہوں، جورو ہتنی میاں سانڈ۔"

"اور تو منٹنی تیرا خصم بھانڈ، موا دھوبی کا چھیلا بنا پھرے ہے، چھیلا، بیل کو اٹھانا بٹھانا بھی تو نہ جانے۔"

"اری او رانڈ، ڈائن، قحبہ۔"

www.bhatkallys.com

"چل چل چڑیل۔ ڈھڈو، حرام زادی۔"

"تو ہوگی تو۔"

"تو تو تو تو۔ تیری اماں، تیری ساری پیڑھی، سارا خاندان،"

اِن دونوں کی لڑائی نے سارے کٹڑے کو
سر پر اٹھا لیا ہے۔ چھوٹے بڑے سب کھڑے
تماشا دیکھ رہے ہیں۔ بچوں نے الگ
شور مچا رکھا ہے، منگل اور اُس کی گھر
والی مالتی بھی اِن سے ذرا دور ایک چارپائی
پر بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ مالتی منگل
سے میل ملاپ کرانے کے لئے کہہ رہی ہے۔

"یہ سب کیا ہوت رہے ہے؟"

"میں پوچھوں ہوں تجھے کیا ہوت ہے، چُپکی کیوں نہ بیٹھی رہے
ہے؟"

"کب تک۔ کیا یوں ہی تماشا دیکھتے رہو گے؟"

"پھر کا کروں؟"

"اٹھ کر بجھاؤ نا۔"

"مو کو کیا گرج پڑی ہے؟"

"یو تو کچھ اچھی بات نہ ہوئی۔"

"پھر تو کیا چاہے ہے؟"

www.bhatkallys.com

"میں جاؤں ہوں اُن کو ملائے دوں گی۔"

"ہاں ہاں تو جا، تو ہی مرد ہے۔"

"اور تم۔"

منگل ہنس پڑتا ہے، مالتی، لاڈو اور شمو کے قریب جا کر اُن کا بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کرتی ہے۔

"اری کیا بات ہے بہنا، آج ٹھنڈی بھی ہو گی یا نہ؟"

"اِس سے پوچھو اِس سُسری نے کل کِل ڈالی ہے سویرے سویرے۔"

"اور تو نے تو کچھ کیا ہی نہیں بڑی آئی معصوم فرشتہ۔"

"نہیں تو کیا، جیسے تیری ہاتھ بھر کی زبان ہے ایسی میری تھوڑی ہے۔"

"اری تیرے بکے کیا ہوئے مجھ سے پوچھ جیسی تو ہتیسی ہتیسی ہے۔"

"اری بہنا اب چُپ بھی رہو سارے عورت مرد تماشا دیکھے ہیں، مرد سچ کہت ہیں۔ عورتوں کی عقل گدی پیچھے ہوئے ہے۔ اچھا میں پوچھتا ہوں کس بنا لڑ رہو تم؟"

"اِس ڈھنڈو نے میرے حق ناق جوتی ماری۔"

"کیوں بہنا؟"

"نہیں ری، میں تو اپنے بچے کو ماروں تھی اُچٹ کے اِس کے

www.bhatkallys.com

جالگی، پھر یہ لفنگی آئے تو جائے کال۔"

"اری تو چپ رہتی ہے یا نہیں کدی یہ لوٹا کھینچ کے ماروں"

"مار تو سہی، ایسا بھنبھوڑوں کہ گوشت اکھڑ آئے"

لاڈو شمو کی طرف لوٹا پھینکتی ہے۔ وار خالی جاتا ہے۔ دونوں کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو لپٹ جاتی ہیں۔ خوب گتھم گتھا ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے کے بال نوچتی ہیں شمو لاڈو کی کلائی پر کاٹتی ہے۔ لاڈو چیختی ہے۔

"اوئی، اوئی، اوئی اللہ، اوئی اللہ، ارے میں مری ہائے اللہ میں مری اری چھوڑ ڈھنڈو چھوڑ۔"

منگل اس دھینگا مشتی کے نظارے سے شاید کچھ لطف اٹھا رہا ہے۔ بھٹی کے سامنے بیٹھا اُس میں ایندھن جھونکتا جاتا ہے اور دیکھی ہے میں آہستہ آہستہ کچھ گاتا بھی جاتا ہے۔ اسی حالت میں مالتی وہاں آجاتی ہے۔

"گوری نے کالی سے جھگڑا اڈالا رے
لڑتی بجا کے تالی رے۔"

www.bhatkallys.com

"کیوں مالتی تو سمجھا آئی، ملاپ ہو گیا؟"

"اور یہ تم کا کر رہو؟"

"کل گھاٹ پہ جانا ہے نا، اس لئے آج بھٹی چڑھاؤں ہوں"

"یہ تو مجھے بھی نجر آ رہا ہے"

"پھر اور کا؟"

"شروع سے کچھ گا رہے تھے نا"

"اگر تو سُنے تو گاؤں، پر تجھے بھی سُنانا ہو گا"

"گوری نے کالی سے جھگڑا ڈالا رے

لڑتی بجا کے تالی رے

کہتی گوری کالی سے، تو جھڑ جھیندی نار

دَرپن لے کے دیکھ ترے مکھڑے پہ خُدا کی مار

بات کیوں کرے نرالی رے"

"تم بھی بڑے وہ ہو"

"سُن اور سُن"

"کہتی کالی گوری سے تو زبان کو کر لے بند

چار میں مل کے کر دے فیصلہ ہے کس کا جھڑ جند

لڑتی بجا کے تالی رے"

"اچھا تم بھٹی جھونکو میں اتے اتری ما بجھ لاؤں آج گاہک کو کپڑے بھی دینے ہیں۔ وہ کل بھی لینے آیا تھا"

www.bhatkallys.com

"اری نا، میں تو گھاٹ جاؤں ہوں، کل لادی پوری نہ دُھلی اور آج تڑکے اسی بھول میں آنکھ بھی نہ کھلی"۔

"تم بھی بڑی عقل وند ہو، اچھا پھر روٹی لیتے جانا، ہاں کدی میری باٹ دیکھو، میں اب بھٹی جھونکوں ہوں"۔

منگل گھاٹ پر چلا جاتا ہے۔ مالتی بھٹی میں ایندھن جھونکتی ہے۔ ادھر وزیرا کی گھر والی رمضانو استری کرکے کپڑوں کو دھوپ دے رہی ہے۔ لیجیئے وہ اُس نے کپڑوں کو دھوپ دے کر سو سوا سو کپڑوں کی گٹھری باندھ لی۔ گٹھری کیا خوب بڑا گٹھڑ ہو گیا ہے پتلی دُبلی سی عورت ہے لیکن سر پر گٹھڑ۔ بغل میں پندرہ سولہ دن کا بچہ، نہایت اطمینان سے لیئے دریا گنج ڈپٹی فخرالدین کے ہاں جا رہی ہے۔ لیجیئے وہ اُن کے مکان میں مسکراتی ہوئی داخل ہو گئی۔ ڈیوڑھی میں ڈپٹی صاحب کا ملازم کلو روکتا ہے۔

"اور رمضانو اب کے تو تم بہت ہی دن میں آئیں، میں تو تمھیں کئی دن سے یاد کر رہا تھا"۔

"دیکھو رے! او کلو کے بچے تو مجھ سے نہ اترایا کر"۔

www.bhatkallys.com

"اچھا میرے کپڑے بھی لائیں؟"

"لے پھبیو مرا کیوں جاتا ہے"

"تو معلوم ہوتا ہے تم میرے کپڑے نہیں لائیں"

"ہاں لے وہ دھرے ہیں ابھی سے"

"کیوں؟"

"پچھلے مہینے کے دام تو دے پھر لیجیو وہ بھی"

"کیوں کیا وہ مار میں ہیں؟"

"تیرے آگے ہاتھ کون جوڑتا ہے دُھلوا لے کسی اور سے"

"تو میں کب جوڑتا ہوں"

"ارے تو مجھے اندر تو جانے دے، دیکھو ڈپٹی صاحب یہ کلّو نہیں مانتا ہے"

"آؤ آؤ رمضانو اندر آؤ۔ کیا ہوا کیا ہوا؟"

"میاں ہوا کیا، اب کے تم کلّو کی تنخواہ میں سے میرے دام کاٹ کے دینا۔ مجھے یہ ہر وخت کی ہرانی جتانی اچھی نہیں لگتی"

"کیا کچھ پیسوں کا حساب ہے۔؟"

"ہاں میاں صاحب میری دُھلائی کے پیسے۔ اپنے کپڑوں کا تو اتنا تقاضا کرتا ہے کہ اندر مکان میں آنا دوبھر ہو گیا، اور پیسوں کو کہو تو لڑتا ہے۔ تم جانو میں تو آپ ہی دُکھی ہو رہی ہوں۔ آپ دیکھئے نا، گود میں بچہ، سر پر کپڑوں کی لادی، بچے کو اتار دوں

www.bhatkallys.com

گٹھڑ کھولوں جب ہی تو دوں گی یوں کھڑے کھڑے کیوں کر دوں۔"

"ٹھیک کہتی ہے تو ٹھیک کہتی ہے۔ اچھا یہ تو بتا، تو اتنے دن رہی کہاں اور یہ بچہ کس کا ہے؟"

"لو اور سنو! یہ پوچھتے ہیں کس کا ہے؟ اے ہوتا کس کا، اپنا ہے"

"اچھا تو تیرے ہاں ہوا ہے جب ہی تو اتنے دن میں آئی ہے، میں سمجھا کہ شاید کسی پڑوسن کا گود میں لے آئی ہو"

"واہ ڈپٹی صاحب واہ مجھے بھی تم نے کوئی گیدی یا ملوچن سمجھا ہے جو ہر کسو کا بچہ پکڑ کر لے جاتی ہیں اے ہے، مجھے تو بیگم بلا رہی ہیں۔ اُن کے پاس تو جاؤں آئی بیگم صاحب آئی!"

"او رمضانو لا دکھا تو اپنا بچہ دیکھوں کیسا ہوا ہے؟"

"کیا کرو گی دیکھ کے اس کالے کلوٹے کو"

"چل چڑیل ذرا اپنے دل سے تو پوچھ کیسا لگتا ہے خاصا اچھا تو ہے۔ کچھ نام بھی رکھا؟"

"نام کیا ہوتا جو جی چاہے کہہ لو"

"پھر بھی کچھ تو رکھا ہی ہوگا"

"اس کا نام ہے بُدھو"

"چل مُردار کیا خاک اُڑانا نام رکھا ہے"

"بیگم یہ بُدھ کے دن ہوا تھا اس لیے بُدھو ہو گیا جیسے میں رمضانوں میں ہوئی تھی تو رمضانو ہو گئی، اچھا پھر تم بتاؤ کیا رکھوں؟"

www.bhatkallys.com

"تو رکھے تو بتاؤں؟"

"ہاں ہاں بیگم لو کیوں نہ رکھوں گی تم تو بڑا اچھا نام بتاؤ گی۔"

"تو اس کا نام رکھ "فورو"

"ہاں بیگم اب میں اسے فورو ہی کہوں گی، یہ بڑا اچھا نام نکالا آپ نے۔"

"اچھا اب تو باتیں تو ختم کر پہلے کپڑے دکھا اور سنبھلوا، دیکھوں تو کیسے دھو کر لائی ہے؟"

"ہاں لو۔ اپنی بیگم کو نہ دکھاؤں گی تو اور کس کو؟ ہمارے ڈپٹی صاحب اور یہ سب بچے پہنیں گے نا۔ لیجیے، سنبھالیے، میں تو خود ایک ایک کپڑا گن کے لے جاتی ہوں اور ایک ایک گن کے لاتی ہوں۔ کیا مجال کہ غلطی ہو جائے۔ ہاں دیکھنا یہ کپڑے کلو کے ہیں۔ انھیں الگ رکھ دو۔ جاتے وقت اس کو دیتی جاؤں گی۔"

"رمضانو تمھارے دھوئے ہوئے کپڑے اب ہماری سمجھ میں نہیں آتے"

"کیوں بیگم کیوں کیا ہوا؟ دیکھو تو کیسے سفید جھک ہیں۔ استری کرتے ہی لائی ہوں۔ ذرا جو استری ٹوٹی ہو۔ مجھے تو اپنے آپ خیال لگا رہتا ہے۔"

"دیکھ تو انہی کو سفید کہتے ہیں۔ یہ رنگ ان پر کہاں سے آیا اور یہ میاں کا پاجامہ موری پر سے کیوں پھٹا ہوا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ اسے بیل نے چبایا ہے۔"

www.bhatkallys.com

"اے واہ واہ کیا بیل دانہ گھاس نہیں کھاتا جو آپ کے کپڑے کھائے گا؟"

"اچھا اور یہ اس شیروانی کے بٹن بھی غائب ہیں۔ تو پہلے کپڑے تب ہی تھی کیا اب بٹن بھی بیچنے لگی۔"

"سرکار جو کپڑے پھٹ رہے ہیں وہ سب پرانے ہیں۔ دُھلتے دُھلتے پھٹ گئے۔ تین چار دھوپ تو چلے اور کہاں تک چلتے؟ ہاں شیروانی کا ایک آدھ بٹن ضرور میری سوکن سے ٹوٹ گیا ہوگا۔ میں اس کو ڈانٹ دوں گی کہ پتھر پر زور سے نہ پٹخا کرے اور میاں کو بھی چاہیے کہ ہمیشہ ہمیشہ کرڈی دار بٹن لگایا کریں تاکہ آپ مجھ کو دینے سے پہلے اُن کو نکال لیا کریں۔"

"تیری تو یہ عادت ہے، بھلا تو کبھی اپنی غلطی مانے گی۔ اچھا تو یہ بتا کہ یہ دونوں میری نئی کی نئی قمیضیں جو تجھے پچھلی مرتبہ دُھلنے کو دی تھیں کیونکر پھٹ گئیں؟۔ یہ چار روپے گز کا کپڑا جو اس طرح پھاڑ لائی، یہ کیوں کر برداشت ہوگا؟ ضرور تو نے اِن کو پہنا ہے۔ لے یہ دیکھ اِن کے کفوں میں ڈورا ابھی بندھا ہوا ہے، یہ کہاں سے آیا؟۔ میں تو ہمیشہ کفوں میں بٹن لگاتی ہوں۔"

"لاؤ دیکھوں تو آپ کی قمیص۔ سنو بیگم، اس میں میری کوئی خطا نہیں آپ اس کپڑے کو ذرا غور سے دیکھیں۔ دیکھنے میں تو یہ صاف ریشم کا ہے، مگر ہے جاپانی ڈوڈا۔ خدا جانے آپ نے کس سے لے لیا اس کا

www.bhatkallys.com

قاعدہ ہے کہ جہاں پانی میں بھیگا اور گیا۔ میں نے تو اِسی لئے بھی پر کبھی نہیں چڑھایا۔"

"اور یہ کھڑوں کا ڈورا ؟"

"بیگم مجھ سے تو قسم لے لو جو میں نے پہنا ہو۔ میں تو ہمیشہ حضور سے مانگ کر پہنتی ہوں۔ یہ دیکھو آپ ہی کی دی ہوئی قمیص اب تک پہنے رہوں۔ نہ جانے شاید بھولے سے میری ساس نے پہن لیا ہو۔ خدا جانے یہ کم بخت ڈورا کہاں سے آگیا ؟"

"بس بس اپنی زبان بند کر بھلا تیری زبان کے آگے کسی کی چل سکتی ہے۔ اچھا لا میرا وہ دوپٹہ اور میاں کی قمیص کہاں ہے جو تو پچھلی مرتبہ گھر بھول آئی تھی ؟"

"لو یہ ایک اور ہوئی، اچھی کون سا دوپٹہ اور قمیص نہیں لائی ؟"

"دیکھو تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح نہ چندرایا کر۔ اگر میں بھولتی ہوں تو کیا یہ کاپی کا لکھا ہوا بھی غلط ہے۔ تجھے یاد نہیں وہ دھاری دار دوپٹہ جس پر ستارے ٹکے ہیں اور ڈپٹی صاحب کی ڈبل کالر والی قمیص۔"

"ہاں بیگم ہاں یاد آیا مگر یہ دونوں کپڑے تو میں نے اپنی لمڈیا کے ہاتھ بیچ میں آپ کو بھجوا جو دیئے تھے۔"

"جھوٹ بالکل جھوٹ، کہتی کیوں نہیں کہ میں دونوں کپڑے ہضم کرنا چاہتی ہوں۔"

www.bhatkallys.com

"واہ بیگم واہ ایک کپڑا کیا کھو گیا کہ اب ہم سارے زمانے کے چور ہو گئے۔ اپنے بچوں کی قسم آپ کا کوئی کپڑا جو میرے پاس ہو"

"نہیں میں یہ ہرگز نہ مانوں گی"

"اچھا بیگم ہم تو ٹھہرے چور اور کمین ذات اور آپ ہیں اشراف ذات۔ میرا آج تک کا حساب صاف کر دیجئے اور پھر جس سے دل چاہے دھلوائیے"

"حساب کا کیا ہے؟ حساب کر لے لیکن میں کپڑوں کے دام ضرور کاٹوں گی؟"

"لے تو آپ کپڑوں کے دام لیں گی یا کسی کی جان؟ کاٹ لو جو تمھارا جی چاہے ہم بھو کے ننگوں کا بھی اوپر خدا ہے"

"اری تو تنخواہ کے علاوہ کتنا کچھ لیتی رہتی ہے اور جب دیکھو بھوکی ننگی۔ بھوکی ننگی ہے تو میں کیا کروں؟"

"دیا بھی آج تک کوئی انعام؟"

"خبردار زیادہ زبان نہ چلائیو۔ کبھی جوتیاں کھا کر نکلے۔ چلی جا یہاں سے۔ یہ لے اپنے حساب کے چھ روپے اور آٹھ آنے"

"اچھی بیگم میری غلطی ہوئی مجھے معاف کر دو۔ لاؤ میلے کپڑے تو لیتی جاؤں"

"چل چل اب تو نکل یہاں سے، کل وَل آئیو، دیکھا جائے گا اور خبردار جو تو نے آیندہ کبھی زبان چلائی"

www.bhatkallys.com

"بھلا میں اپنی بیگم کی بات ٹال سکتی ہوں۔ الٰہی تمھارے بچے جئیں
اِن کا سکھ اور خوشیاں دیکھو۔ اچھی بیگم! ایک پان، منہ سُوکھ
رہا ہے۔ بڑی دیر سے نہیں کھایا۔"

"اری سارا کلہ تو بھر رہا ہے۔"

"لے بو نِری چھالیہ ہی تو ہے، اِس میں کیا مزا رکھا ہے۔ کتھا نہ چونا
الائچی نہ زردہ۔"

"دماغ تو دیکھو اس دھوبن کے، شکل چڑیلوں کی مزاج پریوں کا۔"

"اے اِس پہ بھی وہ مُوا۔ دل و جان سے فدا ہے۔ میں سچ کہتی
ہوں۔"

"چل بے غیرت، لے یہ پان اپنی طلب بُجھا اور غارت ہو یہاں سے۔"

رمضا نے کپڑے دیے طرح طرح کی باتیں ملا،
اپنے روپے وصول کر، پان چباتی ہوئی اپنے گھر روانہ
ہوئی۔ گھر سے میاں کی روٹی، کلفٹ کی پتیلی اور
بغل میں بچے کو لے کر دریا کی طرف روانہ ہوتی ہے۔
سر پر سفید لٹھے کا جھالردار برقع ہے جو اُس نے
صرف برائے نام اوڑھ رکھا ہے۔ سر سے پاؤں
تک کُھلا ہوا ہے۔ لیکن سینے کو ململ کے بوٹی دار
دوپٹے سے ڈھانک رکھا ہے۔ جوتیاں پہنے
ہوئے۔ زمین پر کھٹ کھٹ کر کے اس طرح چل

www.bhatkallys.com

رہی ہے۔ گویا اپنی جوتیوں سے سڑک پر جھاڑو
دیتی جاتی ہو۔ چال میں کس غضب کی تیزی ہے،
اے لو وہ دریا پر پہنچ گئی۔ پل کے نیچے جہاں
دھوبیوں کے گھاٹ ہیں ریت پر چل رہی ہے۔
یہاں بھی اپنے قدم جلدی جلدی اٹھانا چاہتی
ہے لیکن پاؤں ہیں کہ ریت میں دھنسے جاتے
ہیں۔ آگے پیچھے اور بھی دھوبی دھوبن پیدل اور
اپنے بیلوں پر آجا رہے ہیں۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں
بجتی سنائی دیتی ہیں۔ دریا کے کنارے سے دُور
تک گھاٹ ہی گھاٹ نظر آتے ہیں۔ سامنے دریا
پار دوسرے کنارے پر بھی کچھ گھاٹ ہیں۔ لیجئے
وہ اپنے گھاٹ پر آگئی۔ وزیرا۔ کلّن۔ عیدا اور
منگل چاروں کے گھاٹ برابر ہی برابر ہیں۔ گھٹنوں
گھٹنوں پانی میں کمر جھکائے کھڑے ہیں۔ ہاتھوں
میں کپڑوں کی بینٹھیں ہیں۔ آگے پانی میں پڑے،
پتھر کے بڑے بڑے چوکے پڑے ہیں۔ اُن کا
ایک سرا پانی کے اندر ہے اور دوسرا اوپر
نکلا ہوا ہے۔ کپڑوں کی ان بینٹھوں کو بار بار
پانی میں بھگوتے اور پتھر پر پٹخارتے جاتے ہیں۔

www.bhatkallys.com

پھنکارنے میں کسی کے منہ سے چھو چھو کی آواز نکل رہی ہے اور کوئی ہنسی کر رہا ہے۔ ذرا اُدھر دیکھئے دو تین من چلے دھوبی کپڑے دھونے کے ساتھ ساتھ گا گا کر خوش اور مگن ہو رہے ہیں۔ ایک طرف چھوا چھو، چھوا چھو کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہیں۔ دوسری جانب پتھروں پر کپڑوں کے بار بار پھنکارنے سے متواتر جو صدا نکل رہی ہے وہ گانے کے بولوں کے ساتھ کچھ ایسی ہم آہنگ ہے کہ خواہ مخواہ اُس نے تال و تر کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے:۔

کر سولہ سنگار، نار دلیر کے چلی، دو تین بجے
چلے مٹکتی چال، چلت پہ لگے بھلی، دو تین بجے
دو تین بجے، دو تین بجے

جیوت ہے پچھو اُور جیرت ساجن کی گلی، دو تین بجے
جھلکی اندھیری رات، رات آندھی سے ڈھلی، دو تین بجے
دو تین بجے، دو تین بجے

بھگو ابستر بین، بھبھوتی تن پہ ملی، دو تین بجے
چھپائے کومل گات، جوبن چھپے کی کلی، دو تین بجے
دو تین بجے، دو تین بجے

www.bhatkallys.com

بنی ہوئی پکھراج، پری، کُندن کی ڈلی، دو تین بجے
آئی وصل کی گھڑی، ہجر کی رات ٹلی، دو تین بجے
دو تین بجے، دو تین بجے

سینے پہ جھنگانے، مونگ دشمن کے دلی، دو تین بجے
سُن سوہن کے گیان، نار شیدی کی جلی، دو تین بجے
دو تین بجے، دو تین بجے

"واہ واہ، واہ، واہ بہلتے بہلتے"

اِن کا گانا سُن کر دوسرے دھوبی بھی مستائے
اور لگے اپنی اپنی دُھن میں گانے اور سنانے۔

پہلا دھوبی:۔ گوری گوری بنیاں گُدلے گُدنا
ریشم کی چولی کسائے جُھبنا

دوسرا دھوبی:۔ تو کھالے الائچی دانا
اور ہیں بریلی جانا

تیسرا دھوبی:۔ توپ خانے کی دھوبن بڑی موٹی
لہنگے میں چھپا لائی ڈبل روٹی

چوتھا دھوبی:۔ لونڈا روئے گھڑی گھڑی
اُسے دودھ پلائے کھڑی کھڑی

پانچواں دھوبی:۔ نئی نوکری دو گُنا چاؤ
اُٹھ ری دھوبن کلپ بناؤ

www.bhatkallys.com

پانی سے کچھ دُور ریت پر اور ان جھاڑیوں پر
جو قدرت نے اس ریتلی زمین پر پیدا کر رکھی ہیں
ان دھوبیوں کے کپڑے پڑے سوکھ رہے ہیں۔
وہ دیکھیے رمضانو دھلے ہوئے کپڑے ایک
ایک کر کے اٹھاتی اور مناسب جگہ پھیلاتی جاتی
ہے۔ آہستہ آہستہ گاتی بھی جاتی ہے:

"ساری رات جھگڑے میں بیتی، بالم ہارے میں جیتی
آج کمون، کل تیاری، بمبے کے گھاٹ چلو، پیاری
بمبے کا پانی میلا رے، تم جھولی لگا لو، چھیلا رے
ساری رات جھگڑے میں بیتی، بالم ہارے میں جیتی"

بارہ بج رہے ہیں۔ آسمان سے آگ برس رہی
ہے اور زمین پر پانی بہہ رہا ہے۔ لیکن دھوبی اس
آگ اور پانی میں بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔ سیاہ
فام بدن شیشے کی طرح چمک رہے ہیں۔ دو چار
نے اپنا کام بھی چھوڑ دیا ہے۔ کوئی روٹی کھا رہا
ہے۔ کوئی حقہ پی رہا ہے۔ کوئی بیٹھی اپنے بچے
کو دودھ پلا رہی ہے۔ سامنے پُل کی طرف سے
ڈپٹی فخر الدین اپنے دوست اختر مرزا کے
ساتھ آ رہے ہیں۔ گھاٹوں کے قریب سے گذرتے

www.bhatkallys.com

ہیں۔ وزیر لاگ کو پہچان کر کہتا ہے:

"آیئے ڈپٹی صاحب آیئے کیسے آنا ہوا؟"

"ارے بھئی ہم شکار کھیلنے آئے تھے اب گھر جارہے ہیں۔"

"میاں کچھ ہاتھ بھی لگا؟"

"یہ تو اندھا شکار ہے، پھنس جائے تو ایک منٹ میں اور نہ آئے تو ساری رات"

"ہاں جی ٹھیک ہے۔"

"ارے آج صبح رمضانو آئی تھی، اُس کی گود میں بچہ بھی تھا۔"

"ہاں سرکار دو اٹھوارے ہوئے اُس کے ہاں لونڈا ہوا ہے۔"

"ارے تو اُس کو اتنی جلدی باہر نکال دیا۔"

"میاں صاحب ہماری عورت بڑی دھونتال ہوئے ہے۔"

"اختر مرزا کچھ سُنا تم نے دھونتال!"

"جی ہاں دھونتال یعنی زیادہ اور جلدی کام کرنے والی۔"

"جی سرکار! اگر ایسا نہ ہو تو ہم غریب کھائیں کمائیں کہاں سے؟"

"ارے بھئی تمہاری عورت تو عورت بیل بھی بڑا مضبوط اور کڑا ہوتا ہے۔"

"سرکار بڑے لوگوں کی ایک کہاوت ہے" سوداگر کا گھوڑا، کھاوے بہت چلے تھوڑا۔ ہمارا تو بیل ہی سب کچھ کرلیوے ہے۔"

"خوب! تم لوگ ویسے تو گھامڑ ہو لیکن باتیں اس طرح کرتے ہو جیسے پڑھے لکھے۔"

www.bhatkallys.com

"حضور گھر گھر جاتے ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہیں۔ خالی دھوبی تھوڑی ہی ہیں۔ ارے منگل بابو جی کو ایک لاچاری[1] تو سُنا دے۔"

وچاری

چلی میں دھوبی کے گھر جاؤں، بھگت سے کہے بھگتینا
دھوبی کے گھر جاؤں، بھگت جی، سلو ہماری بات
ہمیں بر بیٹھا روز کھلا دیں گے، مچھلی اور بھات
بھُنا کے دیں گے، گڑ دھنیا نا

"یہ کون سا گانا ہے؟"

"سرکار۔ اِسے لاچاری کہتے ہیں۔"

"لاچاری! میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"بابو جی جیسے آپ شعر پڑھا کرتے ہیں نا، ایسے ہی ہم لاچاری گاتے ہیں۔"

"دھوبیوں کے تو کھنڈ بہت مشہور رہیں۔"

"ہاں جی کھنڈ بھی ہوتے ہیں۔ برہ، چندولے اور لاچاری یہ بھی

---

[1] وچار: غور و فکر مصدر وچارن یا وچارنا۔ وچاری معنی لائق تحقیق۔ دھوبیوں کی اصطلاح میں اُن کے وچار کا نتیجہ یعنی گیت۔

www.bhatkallys.com

گاتے ہیں۔ ارے منگل تُو چپ کیوں ہو گیا؟ وہ لاچاری تو پوری سُنا دے۔"

"سُنا بھئی منگل سُنا۔"

اُجل کپڑے ہمیں پہنا دے، اُجل رکھے بنائے
نیچے ڈالے کمبل کا ٹکڑا، اوپر کھیس بچھائے
بنا کے دے جھلنیا نا
مورا ابر بیٹھا جگ جگ جیوے۔ مدھیا روز بلائے
دن کو دھووے کپڑے، نشانی ساری رات لگائے
دھلاؤں میں رس بنیا نا

"بہت خوب! بھئی وزیرا کبھی موقع ملے تو ہم کو کھنڈ بھی ضرور سُنواؤ۔ ضرور بابو جی۔ چاہے آج ہی ڈیوڑھے تلے آجانا، بڑے بڑے گیانی آئیں گے۔"

"گیانی کون؟"

"جو لاچاریاں اور کھنڈ پڑھتے ہیں اُن کو گیانی کہتے ہیں اور اُن کے ساتھ جو گاتے ہیں۔ وہ سُریلے کہلاتے ہیں۔"

"کیوں ڈپٹی صاحب کیا ارادہ ہے؟"

"حضرت آپ ہی جائیے مجھے تو اِن چیزوں سے کچھ رغبت نہیں ہے۔"

www.bhatkallys.com

"اچھا کوئی حرج نہیں۔ وزیرا ہم اکیلے ہی آئیں گے۔"

"ضرور، ضرور بابوجی ضرور۔"

ڈپٹی فخرالدین اور اختر مرزا شہر کا رُخ کرتے ہیں۔ وزیر اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے۔ کام کرتے کرتے چار بج گئے۔ دھوبیوں نے کپڑے اکٹھے کرنے شروع کئے۔ گیلے کپڑوں کی لدیاں الگ باندھیں۔ اور دُھلے ہوئے سوکھے کپڑوں کی الگ۔ ترکیب کے ساتھ اوپر نیچے کر کے بیلوں پر لادیں۔ ناندوں اور ہودوں کو دریا پر چھوڑا۔ آگے پیچھے اپنے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ ذرا دیکھئے، تو بیلوں کی قطار کی قطار نظر آتی ہے۔ پورا ایک قافلہ معلوم ہوتا ہے۔ دِن بھر کے تھکے ماندے ہیں۔ شہر کی منزل دُور ہے۔ لیکن بڑی ہمت سے راستہ طے کر رہے ہیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ لادیاں اُتاریں۔ بیلوں کو کھونٹوں سے باندھ کر دانہ پانی دیا۔ دھوبن نے چولھا سُلگایا۔ کھانا تیار کیا۔ بچّوں کو ساتھ بٹھا کر دونوں نے کھانا کھایا۔ دھوبن نے پھر چھوٹے بچّوں کو سنبھالا، تھپک تھپک کر باری باری سُلایا۔

میاں وزیرا نے دن بھر کے کام سے فراغت پائی۔ اِدھر اختر مرزا تشریف لائے۔ کٹڑے کے باہر چوراہے پر ایک بڑا چوک ہے۔ دونوں طرف چارپائیاں بچھی ہیں۔ بیچ میں دریوں کا فرش ہے۔ روشنی کا ایک ہنڈا بھی رکھا ہے۔ بہت سے دھوبی جمع ہیں۔ دوچاریاں

www.bhatkallys.com

گائی جارہی ہیں۔

وچاری

لہنگا نہ پُتر کی مانگے، ساڑھیا نا

ساڑی بنا نہ وہ سووے، دھیرے دھیرے کان میں بُوٹے۔

مکھڑا لے آنسو سے دھووے، روئے باڑیا نہ

ہم تو اب پہنیں گے وہی، ہم لے مَن میں جو ّن سی ہووئی

ہم را کا کرے گا کوئی، ہووے باڑھی یا نا۔

تم کو لاکے دوں گا سوئی، رنگ چھٹے نہ لیسنا دھوئی

چاہے کتنی میلی ہوئی، ہو جاؤ کھاڑی یا نا

دَیا نے خوب تماری لوٹی، ہم سے بدلگا لے کوئی

لاچاری رات دِن سُن ہوئی، اُڑا دے گا ڑیا نا"

"وزیرا۔ وہ کھنڈ کب شروع ہوں گے ہم تو وہی سُننے آئے ہیں۔"

"ابھی ہوتے ہیں سرکار۔ وہ دیکھئے سامنے گُرلا ہوری بیٹھے ہیں۔

پہلے یہی پڑھیں گے اس کے بعد منشی اللہ دین کی باری آئے گی۔

دونوں گیانی اور اُن کے سُریلے آمنے سامنے ہیں۔ دونوں

اُستادوں کے ہاتھ میں نگاڑا[1] ہے، لیجئے وہ کھنڈ شروع ہوئے:

---

[1] دھوبیوں کا گانے بجانے کا دف، عام دف سے ملتا جلتا۔

www.bhatkallys.com

کھنڈ

برہ[ا]: صنم نے کیا دل میں ٹھانا۔ کرنا جُدا تھا تو کیوں کیا بہانہ ، اور ہوگئے صاف شفاف۔

اور اِیشور، دے بھگتی اپنی، رکھوں قدم، جم جم کے تلے
ہر روز دھیان لگا رہے، میرا بھولے ناتھ، بم بم کے تلے
قدرت کے قربان برستا ہے، پانی، جھم جھم کے تلے
بیش نہیں چلتی، آنسو گرتے ہیں، تھم تھم کے تلے
خوب بنائے تہ خانے، آب حیات، زمزم کے تلے
پتہ کسی کو لگا نہیں، وہ بیٹھ گئے، رم رم کے تلے
گرلاہوری کے دشمن مر گئے، دب کے یار، تم تم کے تلے
سُنا کروں میں خلق کا طعنہ، بتایا نہ کچھ بھی اپنا ٹھکانہ، یہ اچھا کیا انصاف
"واہ اُستاد واہ، کیا کہنے ہیں وَیٔی اُستاد کے، مانتے ہیں وَیٔی تم کو"
سرکار آپ منشی الدین والوں کا جواب سُنیے۔

[ا] برہا (وِرہ) یعنی ہجر و فراق اور رفراقیہ گیت۔ دھوبیوں کی اصطلاح میں کھنڈ کے ابتدائی اور آخری مصرعے یا ٹیپ کے بند جن کے آخری الفاظ ہم قافیہ ہوں۔

www.bhatkallys.com

کھنڈ

برہ؛ ساتت برس کے غوث دُلارے، ماں باپ کے نین کے تارے
وہ کرتے تھے بے حد پیار۔

کہا خدا نے زبان سے اپنی، لو میری تلوار علی رضؓ
دینِ محمدؐ دُنیا میں، جاری کر دو، ایک بار علی رضؓ
رہے گو نجتے نام نبی سے، ہر کوچے بازار علی رضؓ
روشن ہو اسلام جہاں میں، مٹ جائے کفّار علی رضؓ
مومن کے تم دِل میں چمن ہو، اور کافر کے خار علی رضؓ
سُن کے سخن تلوار اٹھائی، ہو کے چلے تیار علی رضؓ
الدین عبد المنشی کے ہیں، وہ گلے کا ہار علی رضؓ
دِل میں شوق علم کا بھاری، پڑھنے کی کر کے تیاری، وہ چھوڑ چلے گھر بار

"واہ واہ، کیا سونا جواب دیا ہے اُستاد نے" بُلے بُلے
واہ واہ

---

www.bhatkallys.com

دِلّی کی آتش بازی

حضرت انسان آب و آتش اور باد و خاک کے پتلے ہیں، اور جناب شیطان یکسر پیکرِ آتش۔ انسان کی سرشت میں شروع ہی سے آگ سے کھیلنا، پانی کے سینے پر تیرنا، فضا میں اُڑنا اور مٹی پر حکومت کرنا ہے۔ اس کے برعکس شیطان کی فطرت ـــــ ہو بہو آگ ـــــ کی خاصیت، خود جلنا اور دوسرے کو جلانا۔ انسانیت کا شیوہ بندگی اور تعمیر، شیطنیت کا تقاضا سرکشی اور تخریب۔ اس لئے اگر آتش بازی کا موجد شیطان کو ٹھہرایا جائے تو کیا غلط ہے؟

بات اصل میں یہ ہے کہ آتش بازی کا فن بہت ہی قدیم ہے اور یہ معلوم کرنا قطعی محال ہے کہ اس کا محقق اور موجد کون تھا۔ اور اس کی ابتداء کس زمانے میں ہوئی؟ آتش بازی کی صحیح تعریف کیا ہے یہ بھی ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم۔ البتہ اس ضمن میں یہ عام اعتقاد کہ آتش بازی کی ایجاد بارود کی بدولت ظہور میں آئی نہایت تعجب خیز ہے۔ اس

www.bhatkallys.com

غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لئے ذیل کے حقائق بہت کافی ہیں:

ہندوستان (غیر منقسم) اور چین ان دونوں ملکوں میں شورہ، پوٹاشیم نائٹریٹ بکثرت پایا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں لوگ اس پوٹاس کی مدد سے جو ایک مختصر سی مقدار میں خیموں کے سامنے الاؤ پر چھڑکی جاتی تھی، گوشت وغیرہ بھونا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ آگ پیدا کرنے کی اس معمولی سی ترکیب سے آتش بازی کے کسی اوّلین موجد کو اپنے ابتدائی کیمیائی تجربات کرنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا۔ اس کے مشاہدے میں یہ بات آئی ہوگی کہ پوٹاس کی وجہ سے آگ خوب بھڑکتی اور چمکتی ہے، اور جب اس نے کسی بھڑکنے والے مادے کو پوٹاس کے ساتھ ملایا ہوگا تو انجام کار اسے فتیلے کا استعمال بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔

جلنے اور بھڑکنے والی چیزوں میں لکڑی بھی ہے جو اس وقت صرف ایندھن میں استعمال ہوتی تھی لیکن پوٹاس میں ملانے کے لئے کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جو ذرے ذرے یا پسی ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ لکڑی کو بجنسہٖ پیسنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس وقت کہیں آروں کا بھی وجود نہ تھا ورنہ لکڑی کا برادہ آسانی سے ملایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا وہ مناسب ترین سوختہ لکڑی کا کوئلہ ہی ہوگا جسے پیسنے کے بعد پوٹاس میں ملا کر آتش بازی بنانے کے لئے پہلا قدم اٹھایا گیا ہوگا۔

دوسری کوشش ان کے وہ تجربات ہوں گے جن کے ذریعے

www.bhatkallys.com

آگ جلد سے جلد جلائی جاسکے۔ اس لئے کہ ابتدائی انسانی معاشرت میں آگ نہ صرف روزانہ کی ضروریات زندگی کا جزوِ اعظم تھی بلکہ وہ مذہبی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اُن قدیم غیر متمدن انسانوں کے نزدیک آگ سے متعلق ہر ایک چیز دلچسپی کا باعث تھی۔ بالخصوص وہ چیزیں اور طریقے جن سے آگ جلد روشن ہو جاتی ہے، زیادہ قیمتی اور قابلِ توجہ تھے۔ وہ اس فن میں کمال حاصل کرنے کو اپنی تمام دوسری ایجادات پر فوقیت دیتے تھے۔

اُس وقت جب کہ چقماق پر گندھک آلودہ آہنی ٹکڑے کی رگڑ سے آگ پیدا کی جاتی تھی، تو ان کے لئے یہ نظارہ نہایت دلچسپ تھا کہ لوہے کے ننھے ننھے ذرات آتشی مرکب پر گرتے ہی فوراً آگ پکڑ لیتے ہیں اور پھر ایک عجیب ضوفشانی کے ساتھ شعلوں کی صورت میں بھڑک اُٹھتے ہیں۔ جیسا کہ آجکل لوہ چون، بارود کے ساتھ مل کر پھول برساتا ہے۔ اس مشاہدے سے ان کو اور مزید تجربات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا۔ اور بالآخر انھوں نے اس مرکب کے اجزائے ترکیبی معلوم کر لئے ہوں گے۔ جسے "چینی آگ" کہا جاتا ہے۔ اور جس کا رواج مشرق میں زمانہ دراز سے چلا آتا ہے۔

آتش بازی کا یہ مرکب معلوم کرنے کے بعد اُن کو قدرتی طور پر یہ جستجو لگی ہوگی کہ اس آتش بازی کا کوئی نیا اور زیادہ کارآمد طریقۂ استعمال معلوم کیا جائے۔ چنانچہ جلد یا بہ دیر انھیں اس مرکب کو نلکیوں

www.bhatkallys.com

میں بھرنے کا خیال سوجھا ہو گا۔ خصوصاً اہلِ ہند اور چین کو، کیونکہ اغلب یہی ہے کہ فنِ آتش بازی کی ابتدا چین یا ہندوستان سے ہوئی ہے۔ جہاں یہ نلکیاں خاص طور پر مستعمل تھیں۔ اِن نلکیوں کو موجودہ زمانے میں نال کہا جاتا ہے۔ یہ نال یا نلکیاں بانسوں کی ہوتی ہیں جن کے درخت کم و بیش ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ بانس کو اس مقصد کے لئے مشرق میں جا بجا خوب برتا گیا ہے، یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں جب کہ اس کا استعمال نو ایجاد ہتھیاروں کی وجہ سے تقریباً ترک کر دیا گیا ہے پھر بھی بانس کی نالوں کو آتشی مرکبات پھینکنے کے لئے بے تحاشا کام میں لایا جاتا ہے۔ یہ آتشیں نال جن کے قطر چھ انچ سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اب تک چین اور جاپان میں رائج ہیں۔

جب وہ آتشی مرکب کو نال میں بھرنے کی حد تک کامیاب ہو گئے تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اِن تجربات کے دوران میں اِن لوگوں کو ضرور کوئی چھوٹا موٹا دھماکا اور کسی مرکب کے بے ساختہ بھڑک اُٹھنے اور پھٹ جانے کا حادثہ پیش آیا ہو گا۔ نتیجے کے طور پر یہ بات اُن کے ذہن نشین ہوئی ہو گی کہ نال کے ذریعے گولا بھی پھینکا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نئی ضرورت کے پیشِ نظر انھوں نے یہ سعی کی ہو گی کہ اُن کو کسی نہ کسی طرح بھک سے اُڑ جانے والا مادہ یا مرکب بھی معلوم ہو جائے یوں آخر کار وہ بارود کی تحقیق و ایجاد میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بارود کے لئے یہ لازم ہے کہ

www.bhatkallys.com

اس کے اجزائے ترکیبی (شورہ، گندھک اور کوئلہ) بالکل اوزان کے مطابق ہوں۔ لیکن اس کے برعکس آتش بازی کے مرکب (پوٹاس اور کوئلہ) میں اوزان کی قید ضروری نہیں اور یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ اگر آتش بازی کے مقررہ اوزان میں کوئی کمی بیشی ہو جائے تو نتیجہ صفر برآمد ہوگا۔

مذکورہ بالا واقعات کو تمام و کمال صحیح سمجھنا چنداں ضروری نہیں، کیونکہ اب تک صرف قیاس آرائی سے کام لے کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آتش بازی اور بارود کو وجود میں آنے سے قبل کن مراحل سے گزرنا پڑا، اور یہ اعتقاد کہ آتش بازی کی ایجاد بارود کی رہینِ منّت ہے کسی قدر غلط ہے۔ آتش بازی کی ایجاد فی الاصل صرف اس دریافت پر منحصر ہے کہ پوٹاس سے شعلے کو بھڑکنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ بعد میں یہی بارود آتش بازی کا جزوِ اعظم بن گئی، اور جنگی ضروریات نے اسے کافی فروغ پہنچایا۔

اُس زمانے میں جب لوگ بارود سے قطعاً ناآشنا تھے، جنگ دُو بدُو اور دست بدست ہوتی تھی۔ گرز و تبر۔ خنجر اور بھالے۔ نیزے و تیر۔ تلواریں اور شمشیریں۔ تمام دستی ہتھیار کام میں لائے جاتے تھے۔ اُس وقت یکایک ایک خوفناک قسم کی آگ اور اُس کی آتش بازی ظہور میں آئی۔ یہ آتش بازی (آگ) جس کا تذکرہ درمیان

www.bhatkallys.com

میں آگیا، اس کا تعلق نہ تو براہِ راست بارود سے ہے اور نہ آتش بازی سے، مگر آتش بازی میں بھی چونکہ ایک قسم جنگی آتش بازی کی موجود ہے اس خیال سے کہ ناظرین دونوں میں فرق محسوس کر سکیں ہم یہاں اس آتش بازی (آگ) پر بھی کچھ روشنی ڈالیں گے جو قدیم زمانے میں مختلف ناموں سے مشہور تھی۔

مؤرخین یورپ اُسے "گریک فائر" آتشِ یونان کہتے تھے۔ لیکن خود اہلِ یونان کی زبان اور اصطلاح میں اس کا نام و مفہوم "آتشِ بحری" تھا۔ اہلِ عرب اُسے 'روغن نفط' یا 'زراقات' کہتے تھے۔ اِس وقت یہ پٹرول اور مٹی کے تیل سے موسوم ہے۔ یہ سیاہ اور سفید رنگ کا ہوتا تھا۔ اِس کی خاصیت بھک سے اُڑ جانے والی ہے۔ سرزمینِ بابل اس کا سرچشمہ تھی۔ تمام سامانِ حرب میں سب سے زیادہ یہی کام آتا تھا۔ اس کے علاوہ مصطگی، گندھک، روغنِ بکساں، لاکھ، موم، بغیر بجھا ہوا چونا، گوند، افیون، ہڑتال اِن تمام چیزوں کو بھی آتشی اشیاء ہی میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور نفط کے مختلف مرکبات میں استعمال ہوتی تھیں۔

اب ہم پہلے ابتدائے عہدِ اسلام کے اُن اسلحۂ آتش بار کا ذکر کرتے ہیں جن کی مدد سے وہ اسلحات اپنا کام کیا کرتے تھے۔ مثلاً:

تانبے اور پیتل کی پچکاریاں:

اِن میں روغن نفط بھر کر بَری لڑائی کے وقت قلعے یا شہر کی فصیل پر

www.bhatkallys.com

سے دشمن کی طرف پھینکتے تھے اور جب بحری جنگ مقصود ہوتی تھی، تو تانبے کی ایسی پچکاریاں جن کے دہانے اژدھوں مگرمچھوں اور شیروں کی سی مہیب وضع وقطع کے ہوتے جہاز کے چاروں طرف لگادی جاتیں جن کو دیکھتے ہی دشمن کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔

تانبے، لوہے اور پتھر کی دیگچیاں:

اِن میں نکیلی اور تیز دھار والی چیزیں اور روغن نفط بھر کر منجنیق کے ذریعے پھینکتے تھے۔

پتھر کے گولے:

اِن گولوں میں چار چار خانے ہوتے تھے۔ جن میں مصطگی اور روغن نفط بھرا جاتا تھا۔

دبابیں:

ایسے آہنی اور آتشی آلات جن کو گھوڑوں کی زین پر کس کر دشمن کی صفوں میں چھوڑ دیتے تھے۔

نیزے، تیر اور برچھے:

اِن کی نوکوں اور پھلوں پر یہی روغن نفط لاکھ یا موم میں ملا کر

www.bhatkallys.com

موم کی شکل میں چپکا دیا جاتا تھا۔ جب یہ نفط آلودہ تیر دشمن کی طرف قوت اور جھٹکے سے پھینکے جاتے تو وہ محض جنبشِ اعضا کی گرمی اور ہوا کے خفیف اتصال ہی سے فوراً مشتعل ہو جاتے۔ اوپر پہنچتے ہی پہلے ایک مہیب آواز نکلتی تھی اِس کے بعد نہایت کثیف اور غلیظ دھواں، جس سے ساری فضا تیرہ و تاریک ہو جاتی۔ اس تیرگی میں یہ آتشی تیر اور نیزے کڑکتے، چمکتے اور شعلہ فشانی کرتے دشمن پر جا گرتے۔ اُس وقت دشمن کی مجبوری و بے کسی اور وحشت و اضطراب کا جو عالم ہوتا اُس کا اندازہ ژاں ڈیل مشہور مؤرخ (جو لوئی نہم شاہ فرانس کے ہمراہ صلیبی جہاد کے لئے فلسطین آیا تھا) کے مندرجۂ ذیل الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔

"یہ آگ رات کو برسائی جاتی تو سارا کیمپ روشن ہو جاتا۔ لوگ گھبرا گھبرا کر اوندھے منھ گر پڑتے، آستینوں میں مُنھ چھُپا لیتے۔ بے کسی اور بدحواسی کے عالم میں دعا کرتے کہ خدایا! بچا" (مضامین شرر)

اس آگ کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ خواہ صحرا ہو یا سمندر، دونوں مقامات پر یکساں مشتعل ہوتی تھی، اور ایک دفعہ جب بھڑک اُٹھتی تو پھر گھنٹوں بجھنے کا نام نہ لیتی۔ اگر پانی سے بجھانے کی کوشش کی جاتی تو اُس کے شعلے اُٹھ کر آسمان سے باتیں کرنے لگتے۔ اس کو بجھانے والی صرف تین چیزیں تھیں۔ ریت، پیشاب اور سرکہ۔

www.bhatkallys.com

زمانۂ ایجاد:

یہ آگ جو مختلف ناموں سے مشہور ہوئی اس کے موجد اور زمانۂ ایجاد دونوں کے بارے میں اس قدر متضاد تاریخی روایات ہیں کہ اُن کا مقابلہ اور تجزیہ کیے بغیر کسی صحیح نتیجے اور فیصلے پر پہنچنا قطعی دشوار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ آگ سب سے پہلے قسطنطنیہ میں مؤرخینِ یورپ کے مشاہدے میں اُس وقت آئی جب اسلام کا ظہور ہو چکا تھا۔ قسطنطنیہ میں مشرقی سلطنتِ روم ختم اور یونانی مشرقی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ بعد ازاں صلیبی لڑائیوں کے سلسلے میں جب اقوامِ یورپ شام، فلسطین اور مصر میں مسلمانوں پر حملہ آور ہوئیں تو انھیں یہ دیکھ کر بے انتہا حیرت ہوئی کہ وہاں کے مسلمان بھی اُن کی طرح روغنِ نفط کے استعمال سے اچھی طرح واقف اور آتش بازی میں درجۂ کمال رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس مسٹر گبن اور دیگر یونانی مؤرخین ہم رائے ہیں کہ اس آگ کا رواج قسطنطنیہ میں یونانیوں کی مشرقی سلطنت کے زمانۂ قیام سے کافی مدت قبل موجود تھا۔ اس ضمن میں وہ عربوں کے اُن دو ابتدائی حملوں کا حوالہ دیتے ہیں جو انھوں نے حضرت معاویہ رضؓ اور ولید بن عبد الملک کے زمانۂ خلافت میں قسطنطنیہ پر کئے تھے۔ اور جن میں اُن کو اسی آتشِ یونان کی بدولت

www.bhatkallys.com

شکستِ[1] فاش کھانی پڑی تھی۔

اہلِ یورپ کا خیال ہے کہ اس آگ کے محقق تو اہلِ یونان ہی ہیں لیکن اس کا نسخہ گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں سب سے پہلے شہر بسا والوں نے یونان والوں سے چُرا کر حاصل کیا اور تقریباً اُسی زمانے مسلمانوں کو بھی یہ نسخہ کسی نہ کسی طرح ہاتھ لگ گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب یونانیوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا تو انھوں نے نہ صرف اُن کو ترکی بہ ترکی جواب دیا بلکہ اس آتشِ انتقام کو بھی کام میں لائے جو اُن کے سینوں میں نارِ یونانی نے اس سے قبل قسطنطنیہ میں بھڑکائی تھی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے "آتشِ یونان کا رواج اس سے بھی زیادہ قدیم زمانوں میں پایا جاتا ہے، جس کی شہادت برٹش میوزیم میں اسیریا والوں کی یادگاروں سے ملتی ہے"۔

مسٹر کانڈر اپنی تصنیف "لیٹن کنگڈم آف یروشلم" میں لکھتے ہیں کہ اس نارِ یونانی کا راز وسط ایشیا کے مغلوں اور یونانیوں کو مدت ہائے دراز سے معلوم تھا۔

موجد:

گبن کے بقول اس کا موجد کالی نیکوس[2] نامی ایک عیسائی شہر بعلبک[3] ملکِ

---

[1] مسلمان مورخین نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا کہ عربوں کو قسطنطنیہ میں صرف اس آتشِ یونان کی بدولت شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ (مضامین شرر)

[2] اہلِ عرب کا قول ہے کہ وہ شخص کالی نیکوس کے بجائے "لوقا بن قسطا" تھا۔ جو سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔

[3] ملک شام میں ایک شہر ہے جس کو ہیلو پولی بھی کہا جاتا ہے۔ مسٹر بیٹن نے (بقیہ ۲۵۲ پر)

www.bhatkallys.com

شام کا باشندہ تھا۔ جو خلیفۂ اسلام کی سلطنت سے بھاگ کر قسطنطنیہ پہنچا اور یونان کے شہنشاہ "گوناطوس" قسطنطین ثالث کے دربار میں نوکر ہو کر اس آگ کے نسخے سے اُسے آگاہ کر دیا۔ اُس نے اس آگ کے ذریعے (۶۷۳ء) میں عربوں کے متعدد جہازوں کو پھونک ڈالا۔

مسیو مشو نے اپنی تاریخ کے ضمیموں میں سوانح عمری سلطان صلاح الدین مُصنفہ مسیو رینودو (قلمی نسخہ) کے حوالے سے کالی نیکوس کے بارے میں اس کے چند الفاظ نقل کیے ہیں۔ جن کا لب لباب یہ ہے کہ کالی نیکوس نارِ یونانی کا موجد نہیں تھا، البتہ اُس نے اس آگ کے استعمال کے لئے بہت سی پچکاریاں اور منجنیقیں تیار کی تھیں۔ اس کا موجد فی الاصل ایک شخص ابن النحاس تھا۔ اس سے زیادہ اس کے متعلق دونوں مؤرخوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اور نہ کہیں اور سے اس کا اتا پتا مِلا۔

الغرض مغربی مورخین نے کالی نیکوس کو نارِ یونانی کا موجد ثابت کرنے کے لئے اپنا پورا زورِ قلم صرف کیا ہے لیکن کوئی اُن سے پوچھے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ کالی نیکوس نے بعلبک میں اس نسخے کو مسلمانوں سے سیکھا ہو، اور قسطنطنیہ پہنچ کر اور لوگوں کو ناواقف پا کر ایک موجد کی حیثیت سے اُن کو بتا دیا ہو۔ اسی طرح یہ تصور بھی غلط ہے کہ کالی نیکوس کے ذریعے جب اس آگ کا علم یونانیوں کو ہو گیا تو صدیوں تک صلیبی

(بقیہ حاشیہ ۲۵۱) اپنی بیاگرفیکل ڈکشنری میں بعلبک کو مصر کا ایک شہر قرار دیا ہے جو غلط ہے۔ اسی غلط فہمی کے باعث وہ کالی نیکوس کو بھی شامی کے بجائے مصری سمجھ بیٹھے۔

www.bhatkallys.com

لڑائیوں سے قبل اس کا نسخہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ حالانکہ کالی نیکوس کے زمانۂ قریب ہی میں یعنی (۷۱۲ء) مطابق (۹۴ھ) میں جب محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور راجہ داہر سے مقابلہ ہوا تو قاسم کی فوج کے ۹۰۰ تیر اندازوں نے روغنِ نفط کا استعمال کیا تھا اور حقہ ہائے آتش بار سے راجہ داہر کے ہاتھی پر حربے کئے تھے۔ یہ واقعہ میر معصوم بھکری کی تاریخِ سندھ میں تمام و کمال موجود ہے۔ اور اگر اسے مذہبی تعصب کی بنا پر معتبر نہ سمجھا جائے تو چچ نامہ اور ایلیٹ کی تاریخِ ہند حاضر ہے۔

ایک اور موثر شہادت تاریخِ یعقوبی مطبوعہ لیڈن میں موجود ہے۔ ہشام بن عبد الملک کے عہد (۱۰۸ھ) مطابق (۷۲۶ء) میں جب بصرہ کے گورنر جنرل خالد قسری نے جنید بن عبد الرحمٰن مری کو سندھ کا والی مقرر کیا تو جنید نے قلعہ جیتن[1] کے محاصرے کے وقت روغنِ نفط استعمال کیا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس کی لگائی ہوئی آگ فوراً بجھ جاتی ہے۔ جب قلعہ فتح ہو گیا تو معلوم ہوا کہ دو عربی نژاد اشخاص اس فعل کے ذمے دار تھے۔ چنانچہ جنید نے قومی غداری کی پاداش میں ان دونوں کو فوراً قتل کر ڈالا۔

ان حقائق کی روشنی میں تمام واقعات کا مقابلہ اور تجزیہ کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ چونکہ اس عجیب و غریب روغن کا سرچشمہ سرزمین بابل تھی اس کا قدیم نسخہ بابلیوں اور مغلوں کو شروع ہی سے

---

[1] مراد "جیناپت" ہے جو اس زمانہ میں پنجاب میں دریائے بیاس سے دس میل دور مغرب کی جانب واقع تھا۔

www.bhatkallys.com

معلوم تھا۔ اُن کے ذریعہ اپنے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کو حاصل ہوا اور وہ اپنی ایجاد اور اختراع۔ جو عربوں کا خاصۂ طبیعت ہے کی بدولت اُسے بامِ عروج پر لے گئے۔ اسی دوران میں اُن کے ملک کا ایک شخص اس ایجاد سے واقف ہو کر قسطنطنیہ بھاگ گیا اور وہاں کے شہنشاہ کو اس کی خوشنودی اور قربت کے لالچ میں اُس سے آگاہ کر دیا۔ ان لوگوں نے اُس کو اُس کی ایجاد سمجھا۔ اور تحفۂ خداوندی سمجھ کر اُسے ایک رازِ سربستہ بنالیا۔

کچھ مدت بعد ضرورت اور احتیاج نے عربوں کو مجبور کیا اور اس آگ کو اپنے فوجی حربوں میں استعمال کرنے لگے۔ اول اول اہلِ یورپ عربوں کی اس تحقیق اور عمل سے قطعاً بے خبر اور اس خیال میں محو رہے کہ اس آگ کا راز صرف قسطنطنیہ والوں ہی کو معلوم ہے۔ لیکن جب صلیبی لڑائیوں میں شام اور فلسطین کے مسلمانوں نے آتش باری کی تو وہ دنگ رہ گئے، اور چھکے چھوٹ گئے۔ انہی لڑائیوں میں مغربی یورپ والوں اور انگریزوں کو اس کا نسخہ مسلمانوں سے حاصل ہو گیا۔

قصہ کوتاہ حضرت انسان کو اس آتش یونان یا روغن نفط کی بدولت بارود کا نسخہ ہاتھ لگ گیا۔ پھر جوں جوں انسانی آبادی بڑھتی اور سائنس اور ایجادات نے ترقی کی اُسی قدر طاقت کے اظہار اور ملک گیری کی ہوس میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ بری۔ بحری۔ اور فضائی تینوں جنگوں میں بارود طرح طرح سے بے تحاشا استعمال ہونے لگی۔ اور سابقہ آلاتِ حرب کا کوئی معقول مصرف اور قدر و قیمت باقی نہ رہی

www.bhatkallys.com

اُن کے بجائے بندوقیں، توپیں، مشین گنیں، ٹینک، بمبار ہوائی جہاز، آب دوز کشتیاں، زہریلی گیس یہاں تک کہ ایٹم بم جیسی تباہ کن چیز ایجاد ہو گئی، اور آتش بازی محض ایک کھیل اور تفریح کا سبب بن کر رہ گئی۔ شادی، بیاہ، خوشی کی دیگر تقاریب، مذہبی تہوار، قومی میلے، بادشاہوں کی سالگرہ، جشنِ آزادی، اور فتح کی خوشی کے موقعے پر تفننِ طبع کے لئے اس کی نمائش ہونے لگی۔ چنانچہ نوروز کے موقعے پر اہلِ فارس، ہولی دیوالی کے تہواروں پر ہندو اور شبِ برات کے موقعے پر مسلمان خوب بڑھ چڑھ کر آتش بازی میں حصّہ لیتے ہیں۔ شبِ برات اگرچہ محض ایک عبادت کی رات ہے لیکن آتش بازی کا رواج لال قلعہ دہلی سے شہری آبادی میں آیا، اور رفتہ رفتہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔

بہادر شاہ کے زمانے میں جب سلطنتِ مغلیہ کا آخری چراغ ٹمٹما رہا تھا، قلعے میں تیسرے پہر کے وقت شہزادوں اور شہزادیوں کو آتش بازی تقسیم ہوتی تھی۔ رات کے وقت پہلے شہزادوں کے چکنی مٹی کے ہاتھی بھوڈل (ابرک) بھرے ہوئے جن کی سونڈوں پر، اور شہزادیوں کی ہنڈیاں (گھروندے) جن کے سروں پر چراغ بنے ہوئے ہوتے روشن کی جاتیں۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دی جاتی۔ پھر تاشے، باجے، نوبت، نقارے اور روشن چوکیاں بجتیں۔ اس دھوم دھام سے آتش بازی کا آغاز ہوتا۔ اس موقعے پر جو دوسرے اہتمام اور لوازمات ہوتے اُن کے متعلق چند بول مشہور ہیں۔

www.bhatkallys.com

بول ملاحظہ ہوں:

"اے لو! شب برات کھڑی - بہو ساس سے لڑی
کوئی لیپے، کوئی پوتے، کوئی کمہار سے ہے کھڑی
اے بھیا مٹکے اچھے دیکھیو، آئیں گے مُردے
کھائیں گے حلوہ، چھوڑیں گے انار اور پھلجھڑی"

آتش بازی کے متعلق امیر خسرو کی ایک پہیلی بھی سُن لیجیے اور دیکھیے کہ اس میں کس خوبی سے انار کو پیش کیا گیا ہے:

رات سمے ایک میوہ آیا	پھولوں پاتوں سب کو بھایا
آگ دیئے وہ ہووے روکھ	پانی دیئے وہ جاوے سوکھ

(درخت)

بہادر شاہ سے پہلے کی ایک روایت ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کو ایک دفعہ کھجلی کی شکایت ہوئی - شاہی حکیموں نے اس کا علاج آتش بازی تجویز کیا - اس تجویز میں ایک خاص حکمت اور ندرت شامل تھی - بارود صرف تین چیزوں کا مرکب ہے - یعنی شورہ، گندھک اور کوئلہ گندھک کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جلدی بیماریوں کو دُور کر دیتی ہے - دِلّی کے قریب ریاست الور کے راستے میں سوہنا اور ہمارے دارالسلطنت کراچی کے موضع منگا پیر ان دونوں مقامات پر پانی کے چشمے ہیں جن کا پانی قدرتی طور پر گرم اور گندھک آمیز ہے - اس پانی میں غسل کرنے سے خارش دُور ہو جاتی ہے - اس لحاظ سے اگر بادشاہ کو اس قسم کے

www.bhatkallys.com

بد بُودار پانی سے نہلایا جاتا یا جسم پر کسی گندھک آمیز مرہم کی مالش کی جاتی تو نازک مزاج بادشاہ کو ناگوار گزرتا۔ اس لئے حکیموں نے دلی کے مشہور آتش باز لالہ ہردیال جی کو یہ حکم دیا کہ وہ طرح طرح کی آتش بازی کافی مقدار میں قلعے میں لائیں۔ چنانچہ وہ لائی گئی اور کئی گھنٹے تک چھوٹتی رہی۔ بادشاہ تو اس تماشے میں محو رہا اور آتش بازی کا گندھک آلودہ دھواں بادشاہ کے جسم کو برابر چھُوتا رہا۔ کئی دفعہ یہی کیا گیا، یہاں تک کہ دھوئیں کے اثر سے بادشاہ اچھے ہو گئے۔ اور اتنے خوش ہوئے کہ قلعے میں آتش بازی چھوڑنے کی رسم قائم کر دی۔

اتفاق دیکھئے کہ تھوڑے ہی دن بعد محرم آگیا۔ شہری آبادی میں تعزیہ داری ہونے لگی۔ چونکہ محمد شاہ کی بیوی نواب قدسیہ بیگم مذہباً شیعہ تھیں اس لئے قلعے میں بھی تعزیے نکلے۔ لالہ ہردیال جی نے بیگم صاحبہ کو خوش کرنے کے لئے یہ جدت کی کہ محرم کی دسویں شب کو آتش بازی کا ایک چھوٹا سا جہاز جس کو بجرا کہتے ہیں تیار کر کے قلعے میں لے گئے اور اس کو وہاں چھوڑا۔ بیگم صاحبہ کو یہ بجرا بہت پسند آیا۔ اُس وقت سے محرم کے موقع پر قلعے اور شہر دونوں جگہ بجرا چھوٹنے لگا۔

لالہ ہردیال دہلوی اصل میں بھڑ بونجے تھے۔ اس خاندان کے ایک بھڑ بونجے لالہ کنہیا لال کی دُکان جامع مسجد دہلی کے جنوبی دروازے کے سامنے بازار میں اب بھی موجود ہے۔ جب تک یہ بڈھا کنہیا زندہ رہا محرم کی دسویں شب کو جامع مسجد کے جنوب مشرقی سموسے میں یہ بجرا برابر

www.bhatkallys.com

چھوڑتا رہا۔ اُس کے بعد اُس کی اولاد چھوڑتی رہی۔ تقسیمِ ہندوستان سے کچھ قبل یہ چھٹنا بند ہوگیا تھا۔ اس خاندان نے آتش بازی کا یہ فن دلّی کی پُرانی اور مشہور لاہوری برادری سے سیکھا بعد میں اس کو پیشے کے طور پر کرنے لگے۔

تلمذ کا یہ دعویٰ تو لاہوری برادری کا ہے۔ معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسی بھڑبونجے کے کئی پوتے پڑپوتے آتش باز ہیں، اور اُن کی دُکانیں بازار پائے والان دہلی میں اب تک موجود ہیں۔

حکومتِ برطانیہ نے ۱۹۰۳ء کے دربار شاہی کی تقریب میں جہاں لندن کے کرسٹل پیلس کے مشہور آتش باز میسرز سی۔ٹی۔ بروک اینڈ کمپنی کو ولایت کی آتش بازی دکھانے کے لیے دہلی بلایا —— وہاں دہلی کے کئی آتش بازوں کو بھی دعوتِ مقابلہ دی تھی۔ ۱۹۱۱ء کے دربار میں بھی اِن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ دِلّی والوں نے یورپ کے آتش بازوں کے مقابلے میں دِلّی کی آتشبازی کے ایسے نادر اور لاجواب نمونے پیش کئے کہ یورپ والے اُن کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ مثلاً:

دِلّی والوں نے آتش بازی کے دو مینڈھے بنا کر الگ الگ کھڑے کئے جب اِن دونوں میں آگ لگی تو وہ دونوں آپس میں لڑنے لگے، یہاں تک کہ ایک نے دوسرے کو مار بھگایا۔ دوسرا کمال یہ پیش

www.bhatkallys.com

کیا کہ ایک بہت ہی اونچے بانس پر ایک بہت بڑی چرخی نصب کی۔ آگ لگنے پر جب اس چرخی نے چکر کھانے شروع کیے تو ان چکروں میں سے پہلے چاند ظاہر ہوا پھر وہ گہن میں آگیا اور بعد میں آہستہ آہستہ صاف ہو کر چمکنے لگا۔

دلّی والوں کے مقابلے میں یورپ والوں نے ایسی چرخیاں چھوڑیں جن میں ایڈورڈ ہفتم، ملکہ الیگزینڈر، لارڈ اور لیڈی کرزن وغیرہ کی شکلیں نمودار ہوئیں۔ ایسے تارامنڈل چھوڑے جن میں سے رنگ برنگ کے پھولوں کے علاوہ اسٹار آف انڈیا اور مختلف قسم کے تمغے لوگوں پر برستے رہے۔

دن کے وقت ایسے گولوں کی بھی نمائش کی گئی جو جسامت میں فٹ بال سے بڑے اور چمڑے اور کریچ سے منڈھے ہوئے تھے۔ یہ گولے نظروں میں آئے بغیر ایک دم اوپر جا کر پھٹتے تھے، اور پھر اُن میں سے مختلف قسم کے ریشمی رومالوں کی بارش ہوتی تھی جن میں بادشاہ اور ملکہ کی تصاویر اور رو پہلی کلماتِ مبارک باد تحریر ہوتے تھے۔ انہی گولوں میں سے بعض ایسے دُم دار ستارے بھی چھوٹتے تھے جن میں مختلف آوازیں مثلاً شیر کی دہاڑ، پرندوں کی چہچہاہٹ، بچوں کا رونا اور دو آدمیوں کی گفتگو صاف سُنائی دیتی تھی۔

اس ضمن میں ہم مسٹر ٹی۔ سینٹ ایچ بروک کی کتاب "پائروٹیکنکس" (جو فنِ آتش بازی پر ایک مفید اور بہترین تصنیف ہے)

www.bhatkallys.com

سے ایسی دو تصویروں کے قلمی خاکے پیش کر رہے ہیں جو بلاشبہ آج سے نصف صدی بیشتر کی آتش بازی کا نادر اور تاریخی شاہکار ہیں۔

پہلی تصویر آتش بازی کے اس شاہکار کو پیش کرتی ہے جو لندن کے کرسٹل پیلیس میں ۱۸۹۲ء میں دکھایا گیا تھا۔ تصویر میں جلتی اور چھوٹتی ہوئی آتش بازی کے اندر خوبصورت اور شہرۂ آفاق شاہجہانی جامع مسجد دہلی نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔

دوسری تصویر برٹش میوزیم لندن کی یادگار اور اٹھارویں صدی عیسوی کے مغل اسکول آف آرٹ کا ایک انمول اور نادر شاہکار ہے۔ تصویر کے پس منظر میں رات کا وقت دکھایا گیا ہے۔ چاند بدلی میں آیا ہوا ہے۔ بائیں سمت ایک وسیع سبزہ زار ہے۔ جہاں آتش بازوں کا ہجوم ہے۔ جابجا انار چھوٹ رہے ہیں۔ جیسے سرو کے درختوں میں کسی نے آگ لگا دی ہو۔

درمیان میں ایک چشمہ خراماں خراماں رواں ہے۔ پانی میں کشتیاں پڑی ہوئی ہیں جن میں آتش باز سوار ہیں۔ وہ بھی آتش بازی چھوڑ رہے ہیں۔ پیشِ منظر میں سطح دریا سے ایک کافی بلند قطعۂ زمین پر ایک دل کش چمن کھلا ہوا ہے۔ چمن کے وسط میں ایک خوبصورت بارہ دری ہے۔ اس بارہ دری کے قریب ایک چوبچہ آبی کے سامنے ایک مغل شہزادہ اور شہزادی پھلجھڑیاں چھوڑ رہے ہیں۔ شہزادے کی پشت پر ایک داسی بھی محوِ تماشا نظر آتی ہے۔ چوبچے

www.bhatkallys.com

کے قریب زمین پر ایک دو شاخہ پیچ دان رکھا ہوا ہے، اس میں دو موم بتیاں آتش بازی چھوڑنے کے لئے روشن ہیں۔

دِلّی والوں نے آتش بازی کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ "جنگی اور گُل کاری"۔ جنگی آتش بازی جو جنگ کے وقت کام آئے، اور گُل کاری وہ ہے جسے تفریح اور تماشے کی خاطر استعمال کیا جائے۔ یوں تو اس کا چلن سارے ہندوستان میں ہے، لیکن دہلی، لکھنؤ، میرٹھ، مراد آباد، لاہور اور دیوبند خاص طور پر مشہور ہیں۔ دیوبند کے آتش باز جانوروں کے سینگوں میں بارود بھر کر چھوڑتے ہیں۔ ان سینگوں کی نوکیں تیز کی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر یہ سینگ کسی جاندار کے لگ جائے تو اس کا زندہ رہنا محال ہے۔

دِلّی کی لاہوری بہادری نے اس آتش بازی کو فن کی حیثیت سے اختیار کیا اور تکمیلِ شوق کی خاطر اس میں اس طرح حصّہ لیا کہ درجۂ کمال کو پہنچا دیا۔ چنانچہ محمد شاہ کے زمانے میں حامد اور محمود جنگی آتش باز تھے سنا ہے ہیں کہ ان کی قبریں قصبۂ مہرولی صوبۂ دہلی میں اب تک موجود ہیں۔ حامد۔ محمود سے یہ فن سینہ بہ سینہ علی احمد اور شیخ سعادت اللہ لاہوری تک پہنچا۔ شیخ صاحب موصوف کے پردادا عبداللہ اور دادا حبیب اللہ اور باپ عزیز اللہ یہ تینوں بزرگ بھی مشہور آتش باز گزرے ہیں۔ عزیز اللہ کے بھائی عنایت اللہ اور محمد عمر بھی اس میں کافی ماہر تھے۔ سعادت اللہ لاہوری (جس وقت راقم الحروف نے اس

www.bhatkallys.com

مضمون کا مسودہ ۱۹۶۶ء میں رقم کیا تھا) بقیدِ حیات تھے اور باڑہ ہندوراؤ میں انھوں نے راقم الحروف کو آتش بازی کے متعلق کافی معلومات فراہم کی تھیں۔

شب برات کی پندرھویں شب کو جامع مسجد کے چاہ رہٹ پر اور باسی کی شام کو کوچہ چیلاں میں اور بائیسویں شب کو نئی دہلی میں، سید حسن رسول نما رحمۃ کے حوض پر سالہا سال تک آتش بازی کے مظاہرے اور مقابلے ہوتے تھے۔ ان مقابلوں میں سعادت اللہ کا جنگی آتش بازی میں اکرام گنج والوں اور شفیع جوتے والوں سے اور گل کاری میں حمزہ مرحوم اور محمد احمد صدر بازار والوں سے زبردست مقابلہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب اس گئے گذرے زمانے میں اس کثرت اور شدت سے مقابلے ہوتے تھے تو شاہی زمانے میں قلعے والوں کا شہر والوں سے پتنگ بازی کی طرح آتش بازی میں بھی ضرور مقابلہ ہوتا ہوگا۔ حضرت بہادر شاہ ظفر خود آتش بازی کے شوقین تھے۔ اُن کے دربار میں نامی گرامی آتش باز ملازم تھے۔ کوئی میلہ ایسا نہ تھا جس میں قلعے سے آتش بازی نہ جاتی ہو اور شہر والوں سے مقابلہ نہ ہوتا ہو۔ چنانچہ مہرولی صوبۂ دہلی میں پھول والوں کی سیر کے موقعے پر شمسی تالاب پر میلے کے آخری دن آتش بازی کا ایک شاندار مقابلہ ہوتا تھا۔ درگاہ شریف میں پنکھا چڑھنے کے بعد رات کو دس ساڑھے دس بجے کے قریب بادشاہ سلامت مہتابی پر جلوس

www.bhatkallys.com

فرماتے۔ شاہی بیگمات کے بیٹھنے کے لئے جہاز پر چلمنیں چھوڑ دی جاتی تھیں۔ اُمراء اور مصاحب کو اشارہ مرحمت ہوتا کہ وہ بادشاہ سلامت کے پاس اُوپر آجائیں۔ سیلانیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ تالاب کے کنارے لگ جاتے۔ شاہی آتش باز اور شہر کے نامور اور ماہرِ فن اُستاد بجروں اور نواڑوں میں سوار ہو جاتے۔ یہ پہلے ہی سے تالاب میں پڑے ہوئے ہوتے تھے۔ ایک طرف شاہی آتش باز اپنے بجروں کو لے جاتے اور شہری آتش باز دوسری طرف۔ پھر دونوں اُس مہتابی کا انتظار کرتے جو جہاز پر چھٹتی تھی۔ اس مہتابی کے چھٹتے ہی مقابلہ شروع ہو جاتا۔

سب سے پہلے دونوں طرف سے ہوائی بُرج۔ سُرخ و سفید غبّارے کثیر تعداد میں چھوڑے جاتے کہ آسمان اُن سے چھُپ جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے جنوں، دیووں کا کوئی بڑا قافلہ اپنے ہاتھوں میں جادو کے چراغ لئے گزر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مطلع صاف ہوتے ہی جنگی آتش بازی شروع ہو جاتی۔ ہوائیاں، چھچھے، لٹو، خدنگیے چلتے اور اپنی خوفناک آوازوں کے ساتھ ہوا کو پھاڑتے فضا کو چیرتے ہوئے آسمان میں غائب ہو جاتے۔ نیچے سطحِ آب پر دونوں فریقوں کے بڑے بڑے بجرے جو قد و قامت اور جسامت میں اچھے خاصے جہاز معلوم ہوتے۔ اپنی جگہ سے حرکت کرتے اور بیچ تالاب میں پہنچ کر پھٹا پھٹ اور دُھواں دُھوں شروع کر دیتے۔ اُس وقت مہتابیاں، پھلجھڑیاں، چکر، خدنگیے اور منی کے آتشی سپاہی دونوں طرف سے بے تحاشا چھوڑے

www.bhatkallys.com

جلتے۔ جنگل میں خالی منگل ہی نہیں آگ کا دنگل بھی قائم ہو جاتا۔

اس خوف ناک آتش بازی کے بعد خدا خدا کر کے گُل کاری کی باری آتی۔ فضا ایک دم پُرسکون ہو جاتی۔ دونوں طرف کے آتش باز اپنی اپنی کشتیاں کھسکا کر شاہی جہاز کے سامنے لے آتے۔ اَب آفتابیاں، مہتابیاں، انار، جائی، جوئیاں، ہت پھول، چرخیاں اور لنسریاں اپنے رنگ رُوپ اور گل بوٹے اپنے دَم خم کے مطابق دیر تک دکھاتیں۔ دونوں طرف کے اُستادوں کے ہُنر اور جوہر سامنے آتے۔ اس سلسلے میں آتش بازی کے ایک منظر کی کیفیات ملاحظہ ہوں:

فتیلوں میں دی آگ خُدّام نے — غُبارے ہَوا میں چلے سامنے
غُبارے جو اُڑ کر ہوئے ہیں بلند — شبِ جشن کو دی ہے رونق دو چند
ہزاروں جو یک بار چھوٹے انار — ہوا صحنِ گلشن میں رقصِ شرار
دل افروز ہیں کیا شراروں کے پھول — دکھاتے ہیں عالم اناروں کے پھول
اُڑا ایک طرف قلعہ میدان میں — فرشتوں نے دیں اُنگلیاں کان میں
نہیں قلعہ آتشیں کا جواب — جو گولا چلا بن گیا آفتاب
صدا توپ کی بم کے گولوں نے دی — زمین آسماں کے برابر ہلی
کلس قصرِ شاہی کے مہتاب سے — چمکنے لگے تابِ مہتاب سے
وہ مہتاب جس سے رُخِ ماہ فق — ہوائی جو چھوٹی تو پھولی شفق
چلیں زور سے اس قدر چرخیاں — کہ چکّر میں آیا سرِ آسماں
بدلتی ہیں یوں چرخیاں رنگِ چرخ — بشر بھول جاتے ہیں نیرنگِ چرخ

www.bhatkallys.com

غرض خاک سے چرخ تک رات بھر سوا شعلے کے کچھ نہ آیا نظر

یہ مقابلہ کہیں دس بجے رات کو ختم ہوتا۔ بادشاہ خود اپنے دست مبارک سے شال دوشالے، مندیلیں اور سیلے، روپے اور اشرفیاں مرحمت فرماتے۔

خلقت کچھ تو رات ہی کو اور باقی صبح ہوتے ہی تتر بتر ہو جاتی۔ پھر اسی دن، اسی رات، اسی گھڑی اور اسی تماشے کا انتظار کرتی جیسے چشم بینا دیکھ کر آج بھی اپنا سر دُھنتی ہے۔

---

www.bhatkallys.com

دِلّی کی پتنگ بازی

رات کو جب اُڑن انار فضائے آسمانی میں پہنچ کر سنہری اور روپہلی پھول برساتے ہیں اور خدنگے شہاب ثاقب بن کر ٹوٹتے اور تیر چھوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ آج ضرور شب برات ہے اسی طرح جب دن کے وقت چاروں طرف طرح طرح کی بے شمار رنگین اور خوبصورت گُڈیاں ہوا میں رقص کر رہی ہوں تو فوراً پتا چل جاتا ہے کہ آج کوئی نہ کوئی تہوار ہے۔ زمین و آسمان دونوں رنگ منا رہے ہیں۔

پتنگ بازی کے اس دلچسپ و رنگین شوق کی ابتدا کیوں کر ہوئی پتنگ بازی کا موجد کون تھا، شوق و تفریح کی کون کون سی ضرورتوں کے لئے دنیا میں پتنگ —— کا استعمال کیا گیا، قلعہ معلیٰ دہلی اور مرحوم دِلّی اور دِلّی کے بعد لکھنؤ کی پتنگ بازی کی کیفیت، قدیم و جدید پتنگوں کی قطع وضع، اُن کے بنانے کا فن اور پتنگ بازی کے دستور و قواعد کو نظرِ ثانی کے بعد پیش کیا جارہا ہے۔

www.bhatkallys.com

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے پڑھنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ پتنگ کو ایک شخص آرچی ٹاس (ARCY TAS) نے چار صدی قبل ٹارنیٹم (TARENTUM) میں ایجاد کیا تھا۔ لیکن ایشیا کے باشندوں نیز دوسری اقوام اور قبیلوں میں اس کا رواج نامعلوم مدت سے چلا آتا ہے۔ مشرقی ایشیا میں پتنگ بازی ہمیشہ ایک دلچسپ قومی مشغلہ اور تفریح رہی ہے۔ البتہ یورپ میں اس کا شوق بہت کم رہا۔

پتنگ بازی کی ابتدا کیوں کر ہوئی۔ یہ مسئلہ ہنوز تاریکی میں ہے لیکن عام طور پر اسے مذہب سے نسبت دی جاتی ہے۔ چنانچہ قبیلۂ موولیس میں اسے مذہبی حیثیت حاصل ہے۔ پتنگ کے چڑھاوں کے ساتھ ساتھ پتنگ کے گیت یا بھجن بھی گائے جاتے ہیں۔ اہلِ کوریا اس کی وجہ ارتقا، اپنے ایک جنرل سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صدیوں قبل اس نے اپنی فوج کا دل بڑھانے اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لئے پتنگ کے ساتھ ساتھ ایک قندیل بھی اڑائی تھی۔ اس قندیل کو اس کی فوج نے اپنے خیال میں یہ سمجھا کہ شاید قدرت کی طرف سے یہ کوئی نیا ستارہ طلوع ہوا ہے جو اُن کے واسطے فتح و نصرت کی بشارت لے کر آیا ہے۔ کوریا کے ایک دوسرے جنرل کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے پتنگ کو میکانیکل یعنی جرِ ثقیل کی ضروریات کے لئے استعمال کیا اور اس کے ذریعے ایک ندی کے پاٹ کو ناپ کر ایک پُل تیار کیا۔ الغرض کوریا، جاپان اور چین بلکہ تمام ایشیا

www.bhatkallys.com

میں پتنگ بازی سے غایت درجہ شوق کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عام کاروباری لوگ اپنی دکانداری کے اوقات میں پتنگ بازی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ پتنگ بازی کی بدولت اُن کی ساری خرید و فروخت یوں ہی دھری رہ جاتی ہے۔

چینی اور جاپانی پتنگیں مختلف وضع قطع کی ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی کی شکل پرندے کی ہے تو کسی کی اژدہے کی۔ کوئی بالکل چوپایہ نظر آتی ہے تو کوئی مچھلی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اُن سائزوں میں بھی فرق ہوتا ہے چھوٹے سے چھوٹے سائز سے لے کر سات فٹ طویل و عریض ہوتی ہیں۔ ان کے کانپ اور ٹھڈے معمولی بالس کے ہوتے ہیں اور جاول کے مہین کاغذ یا بہت ہی باریک ریشم سے منڈھی جاتی ہیں۔

چین میں نویں مہینے کا نواں دِن "یوم پتنگ" کہلاتا ہے۔ اُس روز چھوٹے بڑے طبقوں کے ہزارہا آدمی اور لڑکے چھتوں، ٹیلوں اور میدانوں میں جاکر پتنگ اُڑاتے ہیں۔

اہلِ ملایا نے بھی انواع و اقسام کی پتنگیں ایجاد کر رکھی ہیں جن میں کثرت ایسی پتنگوں کی ہے جو بغیر دم چھلے کے ہوتی ہیں۔

شکاگو میں سلطان جمہور نے ایک دفعہ ۱۸۹۳ء میں کولمبین کی نمائش کے موقع پر پندرہ مختلف قسم کی پتنگیں بھیجی تھیں۔

ایشیا میں ایسی نغمہ ریز پتنگیں بھی بنتی ہیں جن کے دلکش نغمے فضا میں کافی دیر تک گونجتے سنائی دیتے ہیں۔ یہ سریلی تانیں ہوا میں اُڑتے

www.bhatkallys.com

وقت اُن سوراخوں سے نکلتی ہیں جو پتنگ کے کانپ ٹھڈّوں میں نہایت صنعت اور کاریگری سے کئے جاتے ہیں۔

بعض توہم پرست جو پتنگوں کی نسبت یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان سے خبیث رُوحیں ڈرتی ہیں اور دُور رہتی ہیں؟ اپنے پتنگوں کو ساری ساری رات یوں ہی اُڑتا ہوا رکھتے ہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں پتنگ کو سائنٹفک ضروریات کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں بینجامن فینکلن (BENJAMIN FLANCLIN) نے اپنے قابلِ یادگار پتنگی تجربے کی آزمائش کی۔ پتنگ کے ذریعے اُس نے ہوا سے بجلی کو پکڑا، اور روشنی کی برقی خصوصیات کا مظاہرہ کیا۔ اسی طرح پتنگ کا ایک اور مفید طریق استعمال سائنس کی روزافزوں فوائد کے لئے انیسویں صدی کے آخری چوتھائی حصے میں منصۂ شہود پر آیا۔

حوادثِ سماوی یعنی باد و برق و باراں کے لیے بھی پتنگ کا استعمال کیا گیا۔ چنانچہ امریکہ اور یورپ کی کئی میٹرولوجیکل اداروں نے پتنگ کا باقاعدہ استعمال صرف موسمی حرارت ہی معلوم کرنے کے لئے نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعے طوفانِ باد و باراں کا بھی قبل از وقت پتا لگالیا۔ ایسی پتنگوں کو بوکس کائیٹس (BOX KITES) کہتے ہیں۔ ان کا موجد ایل ہارگریو (L. HAR GRAVE) تھا۔

مُلکی دفاع کے لیے بھی پتنگ کو استعمال میں لایا جاچکا ہے۔ اور

www.bhatkallys.com

پتنگ کے ذریعے کوئی بھی چیز زیادہ سے زیادہ اوپر لے جانا نہایت سہل اور آسان ترکیب تھی۔ مثلاً دُور دراز فاصلے پر پڑی ہوئی نوجوں کو کوئی اشارہ دینا۔ پتنگ کے ذریعے جھنڈا اُڑانا یا خاص مقررہ نشانیوں کے مطابق اپنی فوج کو ہدایات اور احکام بھیجنا۔ انھیں پتنگوں کو برّی و بحری فوج کو غنیم کی جائے محاصرہ تک تار پیڈو پہنچانے کے لئے استعمال میں لایا گیا ہے۔ کم از کم دو میل تک کے فاصلے کے لئے پتنگ کارآمد ثابت ہوا۔ پتنگ کے ذریعے نہایت کارآمد اور کامیاب فوٹو بھی اس طرح حاصل کئے گئے کہ پتنگ کے ساتھ کیمرہ بھی آویزاں کر دیا گیا جس کے بٹن کا تعلق ڈور سے وابستہ تھا۔

طبّی نقطۂ نظر سے بھی پتنگ بازی آنکھوں کے لئے فائدہ مند ہے۔ اس کی بدولت بینائی میں اضافہ اور نظر میں تیزی پیدا ہونے کے تجربات ظہور میں آئے ہیں۔

مرحوم شررؔ لکھنوی اپنی مشہور تصنیف "گذشتہ لکھنؤ" میں تحریر کرتے ہیں:

> "اس (پتنگ) کی کثرت اور تعلیم دیکھ کے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کی بہت پرانی چیز ہوگی مگر ایسا نہیں ہے یہ فن ایک صدی پیش تر کا بھی مشکل سے کہا جا سکتا ہے اور اس کا مرکزِ ترقی لکھنؤ ہی ہے۔"

(ملاحظہ ہو گذشتہ لکھنؤ صفحہ (۲۶۸) مطبوعہ مفید آرٹ پریس کراچی ۱۹۵۸ء)

www.bhatkallys.com

لیکن ہم نے سطور بالا میں انسائیکلو پیڈیا کے جو اقتباسات ترجمہ کرکے پیش کیے ہیں اُن کی روشنی میں شررؔ مرحوم کی اس تحقیق یا اجتہاد کو کون تسلیم کرسکتا ہے؟

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"سُنا جاتا ہے کہ دہلی میں شاہ عالم بادشاہ اوّل کے عہد میں یہ شوق شروع ہوا"

"سُنا جاتا ہے" ہرچند کہ ان الفاظ نے تنقید کی گنجائش کو بہت محدود کردیا ہے لیکن جب اُن کی تحقیق میں یہ آچکا تھا کہ

"یہ فن ایک صدی پیشتر کا بھی مشکل سے کہا جاسکتا ہے"

تو شاہ عالم بادشاہ اوّل کے عہد (۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء) کا علم ہوتے ہوئے بھی ایسی گمراہ کن روایات کا درج کرنا کیا ضرور تھا۔ مولانا شررؔ کا انتقال دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہوا تھا۔ اگر ۱۹۲۶ء زمانہ حیات شرر اور ۱۷۱۲ء اختتام عہد شاہ عالم اوّل کے درمیانی زمانے کو شمار کیا جائے تو اس لحاظ سے پتنگ کا زمانۂ ایجاد بجائے ایک صدی "مشتبہ" کے ۲۱۴ برس "قطعی" برآمد ہوتا ہے۔

بہرنوع دُنیا کی مختلف اقوام کی پتنگ بازی کے متعلق یہ مختصر سا تاریخی جائزہ بھی پتنگ بازی کی طرح کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اسی ضمن میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پتنگ جو بظاہر دو نازک تیلیوں پر منڈھے ہوئے ایک رنگین کاغذ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے بنانے

www.bhatkallys.com

اور تیار کرنے میں کس قدر محنت، دیدہ ریزی اور بانکپن کی ضرورت ہے۔ دیکھنے میں یہ کام جس قدر آسان ہے، عملی طور پر اسی قدر مشکل بھی ہے۔ کوئی ماہر پتنگ ساز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو پتنگ اس نے تیار کیا ہے وہ اپنی بناوٹ میں بالکل ٹھیک ہے۔ اور اڑتے وقت صحیح صحیح اپنا کام کرے گا۔

بات یہ ہے کہ جب تک پتنگ کے کانپ، اس کے دونوں کُنڈے، چاروں طرف کی کنیاں، درمیانی ٹھڈا، ٹھڈے کے اوپر کا حصّہ بگّا اور نیچے کا پتّا درست نہ ہوگا۔ پتنگ صحیح معنوں میں اُڑ ہی نہیں سکتا۔

یوں کہنے کو تو یہ کانپ ٹھڈے معمولی بانس کے ہوتے ہیں لیکن پتنگ کے لئے نہایت عمدہ بانس مہیا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے اچھا بانس پرتیا کا ہوتا ہے۔ پرتیا کلکتے کے قریب بھارت میں واقع ہے۔ وہاں کا ایک بانس تقریباً سترہ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ اس بانس کی خوبی یہ ہے کہ اس کی گرہیں یا گانٹھیں بہت دور دور ہوتی ہیں۔ پتنگ کے کانپ اس میں سے سلگ کے سلگ نکل آتے ہیں۔ اس میں سے ٹھڈے نہیں نکل سکتے۔ ٹھڈوں کے لئے بانس کا سخت ہونا ضروری ہے۔ مرشد آباد اور نجیب آباد کے بانس بھی پتنگ کے لئے کارآمد ہوتے ہیں۔

کانپ اور ٹھڈے بنانے کے لئے بانسوں کو چیر کر پہلے کھپچیاں نکال لیتے ہیں پھر انھیں کو چھیل چھال کر کانپ اور ٹھڈے بنا لیتے ہیں۔ ٹھڈوں کے دونوں سروں کو پتلا اور درمیانی سروں کو موٹا رکھا جاتا ہے۔

www.bhatkallys.com

ورنہ پتنگ اُڑتے وقت جھبر رہتا ہے اور ڈور کی جنبش پر ٹھیک ٹھیک کام نہیں کرتا۔ سب سے عمدہ ٹھڈا وہ ہوتا ہے جس کو چراغ کی لَو پر سینک کر سیدھا کر لیا جاتا ہے۔ ٹھڈا تکلے کی طرح بالکل سیدھا اور کانپ کمان کی مانند خم دار ہونی چاہیئے۔

کُندے دراصل پتنگ کے بغلی گوشوں کو کہتے ہیں جہاں کانپ کے خم دار سرے آکر ختم ہوتے ہیں۔ ان سروں کو پتنگ ہی کے کاغذ سے چپکا کر اوپر سے ایک اور چیپی لگا دیتے ہیں۔

اب لیجیے رکّھی، پتنگ کی چو طرفہ کور کو کہتے ہیں۔ جس میں مضبوطی پیدا کرنے کے لئے باریک ڈورے کی تہہ دی جاتی ہے۔

اب پتا اور پَتَّھا باقی رہ گیا۔ پتا پان کی شکل سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور پتنگ کے نچلے سرے پر کاغذ سے باریک باریک تیلیوں کی کنیاں لگا کر بنایا جاتا ہے۔ تاکہ پتنگ کا رُخ بھاری اور مضبوط رہے۔ ہوا میں اُڑتے وقت پتنگ اسی وزن کی وجہ سے سُدھ اور قائم ہو جاتا ہے۔

پَتَّھا ٹھڈے کے بالائی سرے کو کہتے ہیں۔ مضبوطی کے خیال سے اس کے بھی دونوں طرف گول یا تکونا کاغذ چپکا یا جاتا ہے۔ بعض بڑے پتنگوں میں پتّے کے بجائے پھندنا ہوتا ہے جیسے تُکّل وغیرہ میں۔

پہلے پتنگوں میں ولایتی یا جرمنی ٹشو پیپر استعمال ہوتا تھا۔ اب دیسی کاغذ کام میں لایا جاتا ہے۔

بعض پتنگوں کے کاغذ پر آپ نے روشن اور چمک دار لکیریں دیکھی

www.bhatkallys.com

ہوں گی۔ ان لکیروں کا کاغذ کی بنیادی ساخت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ بعد میں کھینچی جاتی ہیں۔ کاغذ کا تاؤ کاٹنے کے بعد اس پر تیل کا ایک ہلکا سا پچارا پھیر کر اُسے عقیق یا کوڑی سے گھونٹ دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ چمکدار لکیریں کاغذ کی سطح پر اُبھر آتی ہیں۔

جب تک مشینیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں ڈور، روئی کے گالوں کو چرخے پر بار بار کات کر بٹی جاتی تھی۔ یہ کام بڑا دشوار اور صبر آزما ہوتا تھا۔ مشینیں ایجاد ہونے کے بعد عمدہ سے عمدہ اور باریک سے باریک ڈور مہیا ہو گئی جو ریلوں پر تہہ بہ تہہ چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

مانجھا عام طور پر دار چینی، پسا ہوا شیشہ، گیرو اور چاول کا مرکب ہوتا ہے۔ اگر ڈور کو چکنا اور رنگین بنانا ہو تو تھوڑا سا اسپغول اور رنگ بھی ملا لیتے ہیں۔ اس مانجھے کے جہاں پانچ چھ ہاتھ ڈور پر پھیرے اور ڈور میں تیزی آئی۔ مانجھا چڑھی ہوئی ڈور جس قدر پرانی ہو گی اتنی ہی عمدہ ہو گی۔ بات یہ ہے کہ ڈور کو زیادہ مدت رکھنے سے مانجھے کے چاول کا گن ٹوٹ جاتا ہے اور شیشے کی باریک دھار کھڑی ہو جاتی ہے جو حریف کی ڈور پر تلوار کا سا کام کرتی ہے۔ جتنے بھی ہشیار پتنگ باز ہیں وہ اپنی چرخیوں پر ڈور لپیٹ کر کئی کئی سال تک محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اُس کو اپنے کام میں لاتے ہیں۔ پتنگوں کے ہچکے، ٹھاڑیاں اور چرخیاں بنانے کا کام یوں تو دراصل بڑھئی کا ہے، لیکن بعض پتنگ ساز انھیں بھی خود ہی بنا لیتے ہیں۔ آمنے سامنے کے دونوں گھیرے اور درمیانی ڈنڈی خیر اوپر

www.bhatkallys.com

بنوا لیتے ہیں۔ گھرے میں برابر برابر چند سوراخ ہوتے ہیں اِن سوراخوں میں بانس کی گول یا چپٹی تیلیاں پھنسا کر اس کو مُدوّر کر لیا جاتا ہے۔

گھرے اور درمیانی لکڑی اگر شمشیم کی ہو تو چرخی مضبوط اور دیرپا ہوتی ہے۔ ایک درمیانی چرخی پر ہزار ہزار کے گز کے تقریباً چھ ریل چڑھ جاتے ہیں۔

جن کے پاس فالتو پیسے نہیں ہوتے وہ ڈور کو کاغذ ہی پر لپیٹ لیتے ہیں یا اُس کی ہاتھ پر بڑی بڑی انٹیاں بنا لیتے ہیں۔ بظاہر اس ڈور میں کوئی وزن معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مشاہدہ پتنگ اُڑاتے وقت ہوتا ہے جب ڈور اپنا پیٹا چھوڑنے لگتی ہے یعنی فضا میں سیدھی رہنے کے بجائے نیچے گرنے اور جھولنے لگتی ہے۔ اس پیٹے میں تھوڑا بہت نقص پتنگ کی بناوٹ کا بھی ہوتا ہے۔ اگر پتنگ عمدہ ہے تو پیٹے میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور آجائے گی۔ یہ پیٹے عام طور پر لمڈورے پیچوں میں پڑتے ہیں۔

پتنگ بازی کا مذکور ہو اور اپنے دِلّی مرحوم کے مرزا اچپاتی یاد نہ آئیں یہ ناممکن ہے ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مرحوم مرزا فخرالدین عرف مرزا اچپاتی کو لال حویلی والے "عالم" کہا کرتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُن کے والد رحیم الدین کا تخلص بھی عالم ہی تھا۔ شاہ عالم کے پڑپوتے تھے۔ اپنے زمانۂ شباب میں شاہی لنگر خانے کے داروغہ تھے۔ بادشاہ کی طرف سے اولیاءاللہ کے مزاروں پر اُن کے سالانہ

www.bhatkallys.com

عرس میں چپاتیاں تقسیم کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے مرزا چپاتی مشہور ہوگئے۔ غدر کی بھاگڑ میں قلعے سے نکلے۔ جان بچانے کے لئے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پھرتے پھرتے دہلی سے آگرے، پھر واپس دہلی آئے۔ پہلے قدم شریف گئے۔ اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیا، میں پناہ لی۔ نہ معلوم کیا کیا مصیبتیں جھیلیں اور صعوبتیں اٹھائیں۔ حیات مستعار باقی تھی بچ گئے۔ غدر میں ان پر جو کچھ گزری اور بیتی وہ کسی کو نہ سناتے تھے۔ لیکن جب لوگ ضرورت سے زیادہ اصرار کرتے تو مجبوراً انھیں اپنا دکھڑا سنانا پڑتا۔ سناتے سناتے ان کا جی بھر آتا، اور غم زدہ آنکھیں پکے پھوڑے کی طرح پھوٹ بہتیں۔ سننے والوں کا دل بھی بے قابو ہو جاتا اور بے اختیار آنسو بہنے لگتے۔

جوں ہی بہادر شاہ کا ذکر آتا، مرزا جی دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے۔ بوڑھے مرحوم کی ہچکی بندھ جاتی۔ بڑی دیر میں جاکر سنبھلتے۔

ان پڑھ ہوتے ہوئے فی البدیہہ شاعر، سپہ گری کے ماہر، شطرنج میں طاق، چوسر، گنجفہ، بچیسی کے استاد، کبوتر اڑانے اور مرغ اور دیگر طیور لڑانے میں لاثانی۔ شاہد احمد دہلوی کا بیان ہے کہ انھوں نے ان کو طوطے اڑاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ غضب کے تیراک، بلا کے ظریف اور حاضر جواب تھے۔ سیلانی جیوڑے ایسے کہ ادھر برکھا رت آئی ادھر ان کا من لہرایا، اور ایسی دھت چڑھی کہ جس طرح بن پڑے قطب پہنچو۔

ذرا دیکھنا مرزا جی کس شان اور ٹھاٹ سے قطب پہنچتے ہیں۔ ایک

www.bhatkallys.com

ہاتھ میں سادی اور مانجھے کی ڈوروں سے بھرے ہوئے چھوٹے بڑے پچکے چرخیاں اور ٹھاریاں ہیں۔ دوسرے ہاتھ کی بغل میں ایک چادر اور تکیے ہیں پیٹ ہوئی رنگ برنگ کی چھوٹی بڑی گڈیاں ہیں۔ رات کو یہی چادر اور تکیہ اُن کا بستر اور بچھونا ہوگا۔ ابھی دُکان سے باہر قدم رکھا ہے کہ کسی اِکّے یا تانگے والے کی اُن پر نظر پڑی جھٹ اکّہ پاس لاکر کھڑا کر دیا۔ چونکہ تُتلے ہونے کے ساتھ ساتھ بہرے بھی تھے۔ جب تک گلا پھاڑ کر نہ بولو اُن کے پلّے کچھ نہ پڑتا تھا۔ "ت" اور "د" کا تلفّظ "ٹ" اور "ڈ" سے کیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ چیخ کر بولا:

"مرزا جی سواری حاضر ہے"

مرزا جی نے اُس کی طرف دیکھا بولے۔ "جاؤ جاؤ بیٹا اپنا کام کرو۔ ٹم ڈھیلی روپلے کی باٹ کرو گے۔ چل کے گھونسلے میں بھلا ماس کہاں؟ اپنی ہاٹ پیروں سے پیر کر ڈلّی سے آگرے کو جا لیا۔ ٹو قٹب پہنچا کیا باٹ ہے۔ بیٹا اب پہنچا"

اِکّے والا یہ سُن کر بولا۔ "واہ مرزا جی واہ! بھلا یہ کیا بات کہی آپ نے۔ اِدھر دیکھنا"

اور یہ کہہ کر اُس نے اپنی ریزگاری سے بھری ہوئی جیب کو کھنکھنایا اور کہنے لگا۔

"یہ سب آپ کی دعاؤں کا ظہور ہے، مرزا جی ہم تو آپ کے دیداد اور شعروں کے بھوکے ہیں۔ زیادہ نہیں بس دو چار پھڑکتے ہوئے شعر"

www.bhatkallys.com

ہو جائیں۔ باقی اور آپ سے کیا لینا دینا ہے۔"

مرزا جی یہ سن کر مسکرائے اور بولے۔

"تو نہیں مانے گا۔ اچھا بیٹا تیری مرضی۔ رات ہی ایک غزل کہی تھی۔ بیس بائیس شعر ہوں گے۔ شرط یہ ہے کہ دلّی دروازے اور نظام الدّین کے بیچ میں سناؤں گا۔"

مرزا جی اب اِکّے پر سوار ہیں۔ اِکّا دِلّی دروازے سے باہر نکل کر کوٹلہ فیروز شاہ کو پار کر چکا ہے کہ اِکّے والے نے مرزا جی کو ٹوکا۔

"ہاں مرزا جی اب ہو جائیں وہ رات والے شعر۔"

"ارے سن لیجیو۔ مرا کیوں جاتا ہے۔ ابھی تو نظام الدّین بہت دُور ہے۔ میرے خیال میں تو تو نظام تک بھی قطب پہنچا دے تو غنیمت ہے۔"

یہ سن کر اُدھر اِکّے والے نے گھوڑے کو ذرا تیز کیا، اُدھر مرزا جی کی زبان شعروں کے فرّاٹے بھرنے لگی۔

مقبرہ صفدر جنگ پہنچ کر مرزا اذرا اکی ذرا اِکّے سے اُترے۔ پنواڑی سے پان کا بیڑا لگوایا۔ سگریٹ سُلگا کر دو چار کش لئے اور پھر اِکّے پر آن بیٹھے۔ آن کی آن میں قطب صاحب کا مینا بازار نظر آنے لگا۔ اِکّے والے نے پوچھا۔ "مرزا جی یہیں اُتاروں یا شاہی جھرنے پر۔"

جواب ملا۔ "بیٹا اپنا بھیّا تو دہی پُرانا جھرنا ہے۔ اُسی کھنڈر کے

www.bhatkallys.com

کسی ڈربیں جا کے بیٹھیں گے۔"

جھرنے پر پہنچ کر مرزا جی نے آثارِ قدیمہ کا ایک دُرتا کا۔ چادر بچھائی، تکیے کو دیوار کے سہارے لگا کر گاؤ تکیہ بنایا۔ ایک کونے میں چرخیاں کھڑی کیں اور گڈیوں کو پھیلا کر رکھ دیا۔ اچھی خاصی دُکان لگا کر بیٹھ گئے۔ اِدھر دُکان لگی اُدھر پتنگ بازوں نے ہاتھوں ہاتھ اُن کی گڈیاں خریدنی شروع کیں۔

وہیں آس پاس دو تین دوسرے پتنگ فروش بھی اپنی تھڑی پر گڈیاں بیچ رہے ہیں۔ لیکن اب اُن کی طرف کوئی رُخ بھی نہیں کرتا۔ بےچارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ آخر ڈور اور پتنگوں کے خریدار اُدھر کیوں جائیں وہ تو مرزا جی کے بنائے ہوئے پتنگوں کے کانپ اور ٹھڈوں کے قائل ہیں۔ وہ کیا بڑے بڑے اُستاد اُن کا لوہا مانتے تھے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ مرزا جی بناتے اور چھیلتے بھی غضب کی تھے۔ اور پھر خالی کانپ اور ٹھڈا ہی نہیں، سادی ڈور پر مانجھا بھی وہ غضب کا چڑھاتے اور ایسی صفائی سے اس کو سوتتے کہ رہے نام سائیں کا۔ مرزا جی خدا جانے اس مانجھے میں کون سی ہیرے کی کنی ملاتے تھے کہ ایک دو ہی ہاتھ سوتنے پر ڈور میں بلا کی تیزی اور برّائی آجاتی تھی۔

جہاں تک اُن کی پتنگ بازی کا تعلق ہے وہ ہمیشہ اُدھا اُڑاتے تھے۔ وہ جس پتنگ کو بھی ہاتھ میں لیتے اُسے نوشیرواں

www.bhatkallys.com

اُتارتے۔ نوشیرواں پتنگ بازوں کی اصطلاح میں اُس پتنگ کو کہتے ہیں جو مسلسل نو پتنگیں کاٹ کر صحیح سلامت واپس اتر آئے۔ آخر عمر میں جب نظر کمزور ہو گئی تو شاگردوں سے اُڑواتے اور خود داؤں پیچ بتاتے جاتے۔ دِلّی اور لکھنؤ میں آج تک اُن کا نام باجتا ہے۔

مرزا جی نے بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ ایک زمانے میں ہمیں بھی پتنگ بازی کا خاصا شوق تھا۔ اُن کی دُکان ہمارے گھر سے بہت قریب تھی اس لیے ہمیشہ انہی سے جا کر ڈور اور پتنگ خریدا کرتے تھے۔ لیکن ہم نے اُن کو اُس وقت دیکھا جب وہ بہت بوڑھے اور ضعیف ہو چکے تھے۔ مگر اُن کی نقل و حرکت میں زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ ہوں گے کوئی ستر اسّی برس کی لپیٹ میں۔ بال سفید بگلا اور کمر خاصی دوہری ہو چکی تھی۔ بھرے بھرے تھے۔ گورا رنگ، دراز قامت، ستواں ناک، بڑی بڑی سُرخ مخمور آنکھیں، چوڑی چوڑی کلائیاں، موٹی موٹی انگلیوں پر رگیں اُبھری ہوئی۔ عہدِ جوانی میں بر میں سفید انگرکھا۔ چوڑی دار آڑا پاجامہ سر پر چوگوشیہ مغلئی ٹوپی۔ پاؤں میں سلیمے کی جوتی ہوتی تھی۔ اس عالم پیری میں سر پر اکثر لیس دار چوڑی ٹوپی، گلے میں ململ کا سفید کرتا، پاؤں میں پھٹے پرانے لیتڑے۔ کھنڈر ہو جانے کے باوجود آخر دِلّی کی موئی مٹی کے ہو تام تھے مغل شہزادے کیوں نہ نظر آتے؟

جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے نیچے جو راستہ مٹیا محل سے

www.bhatkallys.com

ہوتا ہوا چتلی قبر کی طرف جاتا ہے، اُس بازار کے شروع میں ایک دُکان چھوڑ کر دوسری دُکان میں قدیم سے کنھیا نامی ایک بھڑبونجے کی دُکان تھی - بڈھا کنھیا تو کبھی کا مر چکا تھا لیکن وہ اپنے جیتے جی پیسے پیسے دھیلے دھیلے اور دمڑی دمڑی کے بھنے ہوئے چنے مرمرے، مکئی اور ستو بیچ کر ایک عمارت کھڑی کر گیا - اس عمارت میں بھڑبونجے کی دُکان کے برابر تیسری دُکان مرزا چپاتی کی تھی - رہتے بھی اسی میں تھے - افسوس نومبر ۱۹۴۳ء میں یہ رہی سہی دُکان بھی ہمیشہ کے لئے بڑھا گئے -

اُن کا تخلص فخرؔ تھا "فغانِ دہلی" کے نام سے غدر کے حالات و واقعات کو نظم کر کے مرزا جی نے ایک مجموعہ چھپوا لیا تھا - لیکن سرکار انگریزی نے اُسے ضبط کر لیا -

ہمارے دوست شاہد احمد دہلوی نے "نقوش" لاہور کے شخصیات نمبر مطبوعہ ۱۹۵۵ء میں مرزا چپاتی مرحوم کی شخصیت کے ایک مختصر اور جامع خاکے میں اُن کی شاعری کا تبرک پیش کیا ہے - اس وقت یہ تبرک قندِ مکرر بن کر انہی کی بدولت آپ کو مل رہا ہے ملاحظہ ہو:

بنائی شوٹ میں شدّاد نے پر یہ نہیں سمجھا
نہ میں جنٹ کے قابل ہوں نہ جنٹ میرے قابل ہے

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

www.bhatkallys.com

ایک غزل کے یہ تین شعر ہیں:

صراف کسوٹی پہ گھسا کرتے ہیں زر کو

ہم وہ ہیں جو آنکھوں سے پرکھتے ہیں بشر کو

ڈل ڈل کے ہیں جو تنتیس عدد حرف بھی دو دو

بے لکھے سمجھ لیتے ہیں ہم زیر و زبر کو

ان چاروں کو جا ڈوبے سمجھ دیکھ لے فخرو

اک حسن کو، آواز کو، دولت کو، ہنر کو

دوتی، چوتی، کبھی دلی کی دو ڈیرے دار طوائفیں تھیں، شادی کی ایک محفل میں اُن کا مجرا ہو رہا تھا۔ اتفاق سے مرزا چپاتی بھی بہر دید اور وہاں موجود تھے۔ جب اُس نے ایک غزل ختم کی تو بولے:

"بائی جی ذرا ٹھہرنا ایک شعر ہو گیا ہے پہلے اسے سن لو پھر اپنا راگ شروع کرنا۔

ڈھیٹ ڈھیٹ ہو ڈی اٹنی ملٹ

ساٹ پیسے تی ڈوتی رہ ڈی

ادھر گانے والی بچاری جھینپ کر رہ گئی۔ اُدھر بڑی دیر تک محفل میں قہقہے گونجتے رہے۔

قلعے والوں کی پتنگ بازی سلیم گڈھ پر ہوا کرتی تھی۔ سلیم گڈھ لال قلعے کے شمال میں بائیں کونے پر واقع ہے۔ جہاں قلعے کی عمارات کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اسے اسلام شاہ نے ۹۵۳ھ میں بنایا تھا۔ شاہان

www.bhatkallys.com

تیموریہ اسے تُوزِ گُڈّ ہ کہتے تھے۔ پتنگ بازی کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ جہاں عصر کا وقت ہوا بڑے بڑے نامی گرامی استاد اور ماہر پتنگ باز طرح طرح کے پتنگ ڈور کے بڑے بڑے پنڈے، خوش نما گولے، غلاف دار چرخیاں، مُھاڑیاں اور ہچکے جن پر کنکوّں اور تکلّوں کے زور کے مطابق دو بلّی، تبلّی، چوبلّی مانجھے دار ڈور چڑھی ہوئی ہوتی تسلیم گڈھ جا پہنچتے۔ بادشاہ سلامت تختِ رواں میں تشریف لاتے۔ ایک طرف بادشاہی پتنگ باز ہوتے اور دوسری طرف معین الملک، نظارت خاں، بادشاہی ناظر اور اُن کے کھلاڑی دونوں میں مقابلہ ہوتا۔

سامنے دریا کی ریتی میں دُور دُور تک سوار آنکڑے دار لکڑیاں لے کر کھڑے ہو جاتے۔ دونوں طرف سے انگارہ، الفی، تکل، دوباز، دو پلکا، دو پنا، کل ڈمہ، کل ہیرا، کانڑا، بگلا، کلیجہ جلی، کل چڑی، سرکھلی، کُندے کھلی، اُدھ رنگ پری، مانگ دار، زلفوں دار، جنیودار، پریوں دار اور طرح طرح کے نہایت شوخ اور خوش رنگ پتنگ دریا کی طرف ہوا میں بڑھتے اور فضا میں تیرنے لگتے۔ تھوڑی دیر میں سارا آسمان پتنگوں سے معمور اور رنگین ہو جاتا۔ اب پیچ لڑنے شروع ہوتے۔ نیچے کا پیچ ہوا تو ایک نے اگر اپنے پتنگ کو جھول میں گھسانا شروع کیا تو دوسرا اوپر سے قط کے منہ اُتارنے لگا۔ یہاں تک کہ دونوں کی ڈوریں آپس میں مل گئیں۔ موقعہ ملا تو کسی نے پیچ نکال لیا ورنہ پھر اتنا لمبا چلا کر بے پناہ ڈھیلیں جلیں، پتنگ ڈوبتے ڈوبتے آسمان سے جا لگے۔ بیٹیا اس قدر چھوڑا کہ

www.bhatkallys.com

ڈور زمین کو چھونے لگی۔ فوراً سواروں نے اپنی آنکڑے دار لکڑی سے ڈور کو اوپر اٹھایا اور اُس وقت تک سہارا دیتے رہے جب تک پیچ ختم نہ ہو گیا۔ بالآخر دونوں میں سے کسی ایک کا پتنگ کٹ جاتا۔ اسی وقت واہ واہ کا ایک شور فضا میں گونج اٹھتا۔ کٹا ہوا پتنگ ہوا کے جھونکے اور تھپیڑے کھاتا ہوا ایک دل رُبا انداز میں جا بجا ڈگمگاتا، لڑکھڑاتا، جھومتا جھامتا دریا کے پار جا گرتا۔ سوار اس کو وہاں سے اُٹھا لاتے یا جس کے ہاتھ لگتا وہ لے اُڑتا۔

اس اثنا میں بادشاہ سلامت برابر پیچ دیکھتے رہتے۔ اگر جی چاہتا تو تختِ رواں سے اُتر کر اشارہ مرحمت ہوتا۔ فوراً ایک پتنگ باز آگے بڑھتا اور مچھلی کے چھلکوں کے دستانے ہاتھوں میں پہناتا۔ بادشاہ سلامت قدِ آدم تُکّل ہاتھ میں لیتے۔ اکثر چوبلّی ڈور پر اور بعض اوقات لوہے کے باریک تار پر اُڑاتے۔ شاہی پتنگ ذرا کی ذرا میں مثلِ شہباز تن تن کر ہوا سے باتیں کرنے لگتا اور اس قدر اونچا چڑھتا کہ رفعت میں چرخ کا ستارہ معلوم ہوتا۔ نظر بازوں کا پیکِ نظر بھی بہ مشکل وہاں تک پہنچتا۔ کسی شاعر کے بقول:

اُس شوخ نے بڑھا کے شفق سے ملا دیا
جس دن قریبِ شام اُڑایا پتنگ سرخ

بادشاہی حریفوں اور صیدیوں میں شہزادہ مرزا یاور بخت بادشاہ سے پیچ لڑاتے۔ دلّی میں یاور بخت سے بڑھ کر کوئی دوسرا پتنگ باز نہیں

www.bhatkallys.com

لڑا سکتا تھا۔ شاذو نادر ہی اُن کا پتنگ کٹتا تھا۔ جو پیچ سے پہلے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ آسمان پر جا کر چپک گیا ہو۔ مرزا جیانی کی طرح مرزا یاور بھی اپنی ڈور اور پتنگ خود تیار کرتے تھے۔ غدر کے بعد بھی ان دونوں کا شوق جاری رہا۔

یہ تو تھی قلعے والوں کی پتنگ بازی۔ اب شہر کا حال سنئے۔ شہر کے نامور اور مشہور پتنگ باز جمعہ کے جمعہ ظہر کی نماز کے بعد مسجد گھٹا کے باہر جمنا کے کنارے ریتلے میدان میں جمع ہو جاتے۔ بالخصوص شب برات اور عید بقر عید کے لئے بہت پہلے سے تیاریاں ہوتیں۔ کئی کئی درجن انگریزی موٹے ریل کی ڈور پر زرد، سرخ، سبز، کاہی مانجھا سوت کر بڑی بڑی چرخیوں پر چڑھایا جاتا۔ گڈیوں میں الفی، تکل، پونا، ادھا، بھیڑیا، چڑا، چپ، پری، شکر پارہ، چاند تارا، پتیل، نعل دار، گنڈیری دار طرح طرح اور رنگ برنگ کی گڈیاں تیار کی جاتی تھیں۔ آپس میں پتنگ بازی کے ہاتھ لگتے۔ دن اور وقت مقرر کیا جاتا۔ ڈیرے، تنبو اور شامیانے تنتے، سپائی کا انتظام ہوتا۔ دونوں فریق پورے اہتمام سے پہنچتے۔ بڑے زور شور سے پتنگ بازی ہوتی۔ شہر کی خلقت بھی یہ تماشا دیکھنے اُن کے ساتھ جاتی۔ جو پتنگ نوشیروانی اُترتا اُس کو مکانوں اور دُکانوں میں بڑی حفاظت اور نمائش کے ساتھ بطور یادگار رکھا جاتا۔

شہر کی عام پتنگ بازی کا مظاہرہ سال کے سال یا تو مہرولی میں پھول والوں کی سیر کے موقعے پر ہوتا۔ جب ساری دِلّی خالی اور

www.bhatkallys.com

مہرولی شہر والوں سے آباد ہوتی۔ امریوں میں عورتیں جھولا جھولتیں، ملہار گاتیں۔ مرد پینگیں بڑھاتے۔ شاہی جھرنے اور شمسی تالاب میں تیراکی کے فن دکھاتے۔ آپس میں کشتیاں ہوتیں۔ پٹے بازی کے اکھاڑے جمتے۔ نٹ اور مداری مختلف کھیل اور تماشے دکھاتے۔ ڈنڈے والوں کی سنگتوں میں لال، سبز ڈنڈے والوں کی خوب کھٹا کھٹ چلتی۔ رقص و سرود کی محفلیں قائم ہوتیں۔ طبلہ، سارنگی، طنبورے کھڑکتے۔ گھونگرو بجتے۔ چھم چھم ناچ ہوتا۔ مکانات آئینہ اور اور مینا بازار بیچ بیچ مینا نظر آتے۔ سودے والوں کی سُریلی آوازیں، پنکھوں کی بہار، کٹوروں کی جھنکار، ساقی کی پکار، نوبت اور نقاروں کی دھوں دھوں سے دِلّی والوں کا دل مست اور سرشار ہوتا۔

اُس وقت نوعمر لڑکے اور مَن چلے جوان اپنی پتنگ بازی میں مصروف ہوتے۔ جس طرف نگاہ ڈالو گُڈیاں ہی گُڈیاں نظر آتیں۔ شاید اتنی تعداد میں چیل اور کوّے بھی آسمان پر نظر نہ آتے ہوں گے۔

کوئی اپنا پتنگ بڑھاتا، کوئی ٹھمکیاں لگاتا۔ کسی کا چکر آتا۔ کسی کا کنیاتا۔ کسی کی دال پیچو ہوتی۔ کوئی ڈھیل دیتا۔ کوئی کھینچ کرتا۔ کوئی اینچم کرتا، کسی کا کھٹکی لگ کر ہتھے پر سے اکھڑتا اور جب کسی کا پتنگ کٹتا تو کوئی دھیری پکارتا اور بیری پکارتا۔

"بیری ہے بے بیری"

یا پھر ہر چھٹے مہینے سترہویں شریف کے موقعے پر نظام الدین اولیاء کی باؤلی

www.bhatkallys.com

اور ہمایوں کے مقبرے پر یہی سماں نظر آتا۔ شبِ برات، عید اور بقرعید کے تہواروں پر کوئی محلہ اور گلی کوچہ ایسا نہ ہوتا جہاں لڑکے، بالے، شرارت کے پُتلے، آفت کے پرکالے، چھوٹے چھوٹے کنکوّے پن چھالے، تکلیں، دم چیل، ڈھیلچیل ہیٹیل گڈیاں اپنی اور پرائی چھتوں پر نہ اُڑاتے ہوں اونچی نیچی اور غیر محفوظ چھتوں پر دوڑتے، دھمال کرتے، چیختے چلّاتے، اور ایک دوسرے پر فقرے اور آوازے نہ کستے ہوں۔ یہ پتنگ بازی اور دھوم دھڑکّا گھروں ہی پر نہیں بلکہ اوکھلا۔ روشن آرا اور محل دار خاں کے باغوں میں جہاں عید کے دوسرے دن تِر کا میلہ ہوتا تھا میں بھی یہ ہنگامہ برپا رہتا تھا۔

غرض جاڑا ہو یا گرمی، تیج تہوار ہوں یا میلے ٹھیلے، دِلّی والوں کی پتنگ بازی کسی دن ناغہ نہیں ہوتی تھی۔

ایک مزے کی بات سُنیئے۔ اسی پتنگ بازی میں بعض اوقات ڈورِ کورشتۂ اُلفت بنا کر عشق و محبت کے ڈورے بھی ڈالے جاتے تھے۔ سحر کا ایک شعر ہے:

لڑ چکیں آنکھیں اب اُس قاتل سے لڑنا ہے پتنگ
ڈور کی فرمائشیں ہیں یہ بھی سب پر ڈور ہے

اور جب عاشق و محبوب کا دل اس ریشمی ڈور کی گُتھیوں میں اُلجھ جاتا اور نکالے نہ نکلتا تو یہی ڈور اور پتنگ تار برقی سے بڑھ کر اپنا کام دکھاتے۔ محبت کے نامہ و پیام آتے جاتے۔ کسی کو کانوں کان

www.bhatkallys.com

خبر نہ ہوتی۔

خود بخود دل کو پہنچتی ہے خبر محبوب کی
تار برقی پر بھی یہ اُلفت کا رشتہ ڈور ہے

پھر عشق و محبت کے ان متوالوں کو حضرت ناسخ کے بقول:

دے اِسی کا کوٹ کر ما نجھا تو اپنی ڈور کو
شیشۂ دل میرے پہلو میں جو چکنا چور ہے

جب یہ حالت ہوتی تو شیشۂ دل کو کوٹ کرا ور پیس کر عشق کی ڈور پر مانجھا چڑھایا جاتا۔ اور بلا ناغہ محبت کے پیچ لڑائے جاتے۔ ایسے پیچ جو کبھی کٹنے کا نام نہیں لیتے۔

غالب مرحوم کو بھی اپنے بچپن میں پتنگ بازی کا بہت شوق تھا۔ خاصی شہرت رکھتے تھے۔ کبھی انھوں نے بھی شاید ایسے ہی پیچ لڑائے ہوں گے۔ فارسی کا ایک شعر ہے:

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مرزا غالب نے پتنگ کے تلازمے میں اس شعر پر بطور ترکیب بند چند شعر لکھے تھے۔ جن کو منشی صفدر علی صفدر مرزا پوری نے اپنی تالیف "حسن خیال" میں نقل کیا ہے وہ ترکیب بند یہ ہے:

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی

www.bhatkallys.com

خود بخود کچھ ہم سے کَنیانے لگا
اِس قدر بگڑا کہ سَر کھانے لگا
میں کہا یہ اے دل ہوائے دلبراں
بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
ہیچ ہیں اُن کے نہ آنا ذی ہنر یار
یہ نہیں ہیں گے کسُو کے یارِ غار
گورے پنڈے پہ نہ کر اِن کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مِل جائے گی تیری اِن سے سانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سُلجھانا تجھے
قہر ہے دل اِن سے اُلجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
بھول مت اس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دِن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دِل نے سُن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب
غرفے میں جا کر دیا کٹ کر جواب
رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

www.bhatkallys.com

تقسیم ہند سے قبل مرحوم دِلّی میں ۱۹۱۵ء تک نامی گرامی پتنگ بازوں کی بہت سی کائٹ کلبز قائم تھیں۔ حکیم اشفاق احمد صاحب عرف عشو میاں نے ہمیں اُن کے نام بتائے تھے۔ وہ یہ ہیں:

(۱) امپیریل کائٹ کلب دہلی۔ بانی نواب اعجاز حسین۔ سکریٹری سراج احمد تھے اور عبد الستار اس کلب کے مشہور پتنگ باز تھے۔

(۲) وزیریہ کلب دہلی۔ سکریٹری سیّد محمد قاسم زیبا۔ مرزا محبوب بیگ مرحوم، مالک محبوب المطابع دہلی اس کے مشہور پیچ باز تھے۔

(۳) رنگین کائٹ کلب دہلی۔ بانی نواب سراج الدین احمد خاں سائل مرحوم۔ سائل صاحب کا مقابلہ اکثر دِلّی کے مشہور سوداگر حاجی علی جان سے ہوا کرتا تھا۔ اُن کے ساتھی لالہ رنگی لال بھی پتنگ بازی میں شہرت رکھتے تھے۔

(۴) مسکین کائٹ کلب دہلی۔ بانی عبد الستار مرحوم جو امپیریل کائٹ کلب کے رکن تھے۔ دِلّی کے مشہور اُردو بازار میں انہی عبد الستار مرحوم کے برادرِ خورد عبد الوہاب صاحب تھے۔ وہ بھی ایک مدّت ہوئی مرحوم ہو چکے۔ اُن کی پتنگ بازی کے شوق کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ ہزاروں روپے اسی شوق میں تباہ کر دئیے۔ پیچ لڑانے میں اِس درجہ ملکہ حاصل تھا کہ دس دس پندرہ پندرہ اُستادوں کے مقابلے میں تن تنہا کھڑے ہو جاتے۔ اگرچہ اُن کے پیچ بھی

www.bhatkallys.com

کاٹی کٹتے۔ لیکن انجام کار کامیابی کا سہرا اُنہی کے سر رہتا۔ حاجی وہاج الدین مراد آبادی جو پتنگ بازی کے جرنیل تھے دو مرتبہ ان سے مقابلہ ہوا۔ اُن کے بڑے بڑے ادّھوں کو اپنی ایک معمولی پیشیل سے کاٹ دیا۔

رام پور میں چھٹن خاں سے بازی جیتی۔ لکھنؤ میں یوسف حسین مرحوم نے مقابلے کی دعوت دی۔ وہاں نواب صاحب کے علاوہ اُن کے آڑی پیارے میاں نواب کلن وغیرہ سے دو دن تک پیچ چلتے رہے۔ دِلّی کی وہ لاج رکھی جو رکھنے کا حق تھا۔

۱۹۴۷ء تک دہلی میں حسب ذیل کائٹ کلبز قائم تھیں :-

(۱) مہذب کائٹ کلب دہلی۔ اس کے بانی حکیم اشفاق احمد عرف عشو میاں تھے۔ کلب کے دیگر ارکان میں عبداللہ ٹال والے۔ سیّد مجید عالم۔ خلیفہ اوّل برکت اللہ اور وزیر علی تھے۔

(۲) ریاضیہ کائٹ کلب، دہلی۔ اس کے بانی سوئی والان کے وزیر علی تھے۔

(۳) گولڈن کلب، پہاڑ گنج دہلی۔ بانی عنایت الرحمٰن۔

(۴) خوشنما کائٹ کلب تکی ماران دہلی۔ بانی محمد اسحٰق۔

(۵) اسٹار کائٹ کلب فراش خانہ دہلی۔ بانی اسلام الدین عرف کاکوان۔

(۶) حمیدیہ کائٹ کلب صدر بازار دہلی۔ بانی حمید مرحوم شیشے والے

www.bhatkallys.com

ہمارے سامنے اس کلب کے ایک رکن عزیز کی بہت شہرت تھی۔

(۷) پتنگ بین کائٹ کلب کوچہ پنڈت دہلی بانی احمد چاندی والے اور سکریٹری محمد میر صاحب تھے۔

ان تمام کائٹ کلبز کے باقاعدہ دستور و قواعد مقرر تھے۔ کرکٹ کی طرح ان کی بھی ایک اسکورنگ ہوتی تھی۔ جس میں فریقین کے پیچوں شمار باقاعدہ درج ہوتا تھا۔

اس وقت دِلّی کا حال دِلّی والے جانیں۔ معلوم نہیں وہاں اب بھی پتنگ بازی کا پہلا ہی سا شوق و ذوق اور جوش و خروش ہے یا برائے نام ہوتی ہے۔ سچ پوچھو تو دہلی کی پتنگ بازی کی وہ ہوا جو بہادر شاہ کے دَم خم سے قائم تھی۔ وہ انہی کے ساتھ ہوا ہوئی۔ اب نہ وہ بہادر شاہ رہے نہ وہ باکمال پتنگ باز۔ نہ وہ وقت رہا نہ وہ سماں۔ یقیناً پتنگ بازی آج بھی ہوتی ہے۔ اب بھی کہیں کہیں بھولے بھٹکے ہاتھ لگائے جاتے ہوں گے۔ بازیاں بدی جاتی ہوں گی۔ لیکن اپنا خیال تو یہ ہے کہ اب کس کساؤ کا زمانہ ہے اور ویسے ہی کھینچا تانی پیچ ہیں۔

آں ہم نماند ایں ہم نماند۔

---

www.bhatkallys.com

دستور و قواعد پتنگ بازی

۱۔ پیچ ہمیشہ بیرونِ شہر میدان میں ہو گا۔

۲۔ پیچ بالعموم اتوار کے دن ہو گا۔ لیکن خاص صورتوں میں حسبِ مرضی فریقین کوئی اور دن بھی مقرر ہو سکتا ہے۔

۳۔ ماہ مئی، ماہ جون، ماہ رمضان، ایامِ عیدین اور یکم محرم سے بیسویں صفر تک پیچ نہیں لڑائے جائیں گے۔

(۴) ایک فریق کے سو پیچ کٹ جانے یا کاٹ دینے کا نام ایک پیچ ہو گا۔

(۵) پیچ میں پیچ لڑانے کے لئے دو مقامات کا درمیانی فاصلہ ۲۲۵ فٹ ہو گا۔

(۶) پیچ لڑانے والے کے لئے طول میں دس گز اور عرض میں ۵ گز جگہ مخصوص ہو گی۔ جس کی حدبندی خواہ فرش سے ہو خواہ کسی نشان یا خط سے، اور اسی محدود جگہ کا نام "کریز" ہو گا۔

(۷) پیچوں کے شمار کے لئے ہر فریق کی طرف سے ایک اسکورر مقرر ہو گا۔

(۸) ہر میچ میں تین امپائر ہوں گے، دو سائڈ امپائر اور ایک فرنٹ امپائر۔ تینوں امپائروں کے پاس ایک ایک سیٹی ہو گی۔ دونوں کریز امپائروں کے پاس ایک ایک جھنڈی سُرخ اور ایک ایک

www.bhatkallys.com

سبز ہو گی۔ فرنٹ امپائر کے پاس تین جھنڈیاں ہوں گی۔ ایک سُرخ، ایک سبز، ایک زرد۔

(۹) سائڈ امپائر فریقین کے ممبران میں سے ہو سکتے ہیں لیکن اُن کا تقرر ہر دو فریق کی رضامندی سے ہو گا۔ اگر فرنٹ امپائر ہی کے لئے ایک فریق ایک شخص کو اور دوسرا فریق دوسرے شخص کو پیش کرے تو فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہو گا۔

(۱۰) اگر ضرورت ہو تو فرنٹ امپائر میچ میں تین گھنٹے کام کرنے کے بعد بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(۱۱) دونوں سائڈ امپائر۔ سبز جھنڈی دکھا کر پیچ لڑانے کے لئے فریقین کی آمادگی فرنٹ امپائر سے دریافت کریں گے۔ اگر فرنٹ امپائر نے جواب میں اپنی سبز جھنڈی دکھادی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ پیچ لڑایا جائے۔ بغیر اس کے کوئی شخص پیچ لڑانے کا مجاز نہ ہو گا۔

(۱۲) اگر سائڈ امپائر سرخ جھنڈی دکھائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ پیچ لڑانے والا ابھی پیچ لڑانے کے لئے تیار نہیں ہے۔

(۱۳) اگر فرنٹ امپائر زرد جھنڈی ہلائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ پیچ لڑانے والے کا نام دریافت کرنا چاہتا ہے۔

(۱۴) اگر کوئی پیچ لڑانے والا پیچ لڑاتے وقت گریز سے

www.bhatkallys.com

باہر نکل جائے تو اُس کا بیٹنگ کرتا ہوا شمار کیا جائے گا۔ میچ لڑانے کا وقت وہ سمجھا جائے گا۔ جب فرنٹ امپائر سبز جھنڈی سے ہر دو فریق کو مطلع کر چکا ہو کہ میچ لڑاؤ اور اس وقت تک کہ میچ کا نتیجہ برآمد ہو۔

(۱۵) اگر کوئی میچ لڑانے والا۔ میچ لڑاتے وقت کریز سے باہر نکل جائے تو سائڈ امپائر کو لازم ہے کہ سبز اور سُرخ دونوں جھنڈیاں بلند کر کے ہلائے اور سیٹی بجا کر اسکورر کو مطلع کر دے۔

(۱۶) ایک میچ میں ابتدا سے انتہا تک ایک فریق کے زیادہ سے زیادہ بارہ آدمی میچ لڑا سکتے ہیں۔ خواہ میچ کتنے ہی دنوں میں ختم ہو۔

(۱۷) کریز میں صرف میچ لڑانے والا اور ایک چرخی پکڑنے والا ہوگا اگر کوئی ضرورت ہو تو ایک شخص اور کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ آدمیوں کو کریز میں آنے کی اجازت نہ ہوگی جس وقت تک کہ میچ لڑ رہا ہو۔

(۱۸) میچ میں فریقین کی جانب سے کوئی شخص میچ نہیں لڑا سکتا تاوقتیکہ وہ دہلی والا نہ ہو، یا غیر دہلوی ہونے کی صورت میں فریق ثانی کی منظوری نہ لے لی ہو۔

(۱۹) میچ میں چھوٹی سے چھوٹی بائیس انچ کی گڈی سے لے کر اڈّھے اور پونے تک اڑائی جائے گی لیکن دونوں فریقوں کی رضامندی

www.bhatkallys.com

سے پیشل گڈی بھی لڑائی جا سکتی ہے۔

(۲۰) میچ کی اجازت کے بعد اگر کسی کی گڈی ٹوٹ جائے یا پھٹ جائے یا کسی بھی طرح تلف ہوجائے تو وہ کٹا ہوا پیچ قرار دیا جائے گا۔

(۲۱) جو پیچ فرنٹ امپائر کی دانست میں ضرورت سے زیادہ ہو جائے اور نظروں سے اوجھل ثابت ہو تو وہ اُس پیچ کو سُرخ جھنڈی دکھا کر ملتوی کر سکتا ہے۔

(۲۲) اگر پیچ کی اجازت کے بعد زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کے اندر پیچ نہ لڑایا جائے تو فرنٹ امپائر کو لازم ہوگا کہ اس پیچ کو ملتوی کردے اور فریقین کے دوسرے دو آدمی پیچ لڑانے پر مامور کردے۔

(۲۳) پیچ کی اجازت کے بعد کسی فریق کے پتنگ لڑانے والے کو اگر اپنے پتنگ کے لئے کسی اوپر کی ٹوٹی ہوئی گڈی سے یا چیلوں وغیرہ سے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ سائڈ امپائر کو مطلع کرکے اپنا پیچ ملتوی کرا سکتا ہے۔

(۲۴) جو گڈی نوشیرواں ہو جائے اُس کی تحریری تصدیق فرنٹ امپائر کرے گا۔

(۲۵) سُوت کی ڈور کے سوا تار یا نخ فریقین میں سے کوئی بھی پیچ لڑانے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا اگر کسی نے ایسا کیا تو نخ یا تار سے کاٹے ہوئے پیچ سوخت ہو جائیں گے۔ اور بطور جرمانہ پانچ پیچ دینے ہوں گے۔ سائڈ امپائر کو جس شخص کی ڈور پر تار یا نخ

www.bhatkallys.com

ہونے کا شبہ ہو تو وہ اس کی ڈور کو دیکھ کر اپنا اطمینان کر سکتا ہے۔

(۲۶) دورانِ میچ میں اگر ہوا کا رُخ بدل جائے اور کسی فریق کا ہاتھ دَب جائے یا پورا دکھا ؤ نہ رہے تو اُس فریق کو اختیار ہوگا کہ فریق ثانی کو اطلاع دے کر اپنے لئے کوئی دوسری جگہ تجویز کرالے۔ لیکن اگر فریق ثانی اس بات سے مانع ہو تو ضروری ہوگا کہ اپنی جگہ شکایت کرنے والے فریق کو دے دے اور خود اس کی جگہ کھڑے ہو کر پیچ لڑائے۔

(۲۷) جس فریق کا پیچ کٹ جائے اُس کو لازم ہے کہ فریقِ غالب کو ایک تصدیقی ٹکٹ دے۔

(۲۸) میچ ختم ہونے کے بعد فریقِ غالب تمام تصدیقی ٹکٹ واپس کر دے گا۔ اور فریقِ مغلوب کو فریقِ غالب کی اسکور بک پر پیچوں کی زیادتی کی تصدیق ثبت کر کے اپنے کلب کے کپتان یا کسی دوسرے عہدہ دار سے دستخط کرانے ہوں گے۔

(۲۹) اگر کوئی ممبر کسی دوسرے ممبر کی نسبت کوئی اہانت آمیز کلمہ میدانِ میچ میں کہے گا۔ تو اُس کلب کے کپتان کو اُسے سزا دینی اور اُس سے معافی منگوانی مناسب ہے۔

(۳۰) اگر دو کلبوں میں میچ شروع ہو گیا ہو تو ہر دو کلب میں جو نیا ممبر دورانِ میچ میں داخل ہوگا وہ اس میچ میں پتنگ نہیں لڑا سکے گا جو اس کے ممبر ہونے سے قبل شروع ہو چکا ہے۔

(۳۱) جو کلب میچ جیت جائے اُس کو لازم ہوگا کہ مغلوب کلب

www.bhatkallys.com

کا ریٹرنڈ میچ کا چیلنج تاریخ اجرائے چیلنج سے ایک ماہ کے اندر اندر ضرور منظور کر لے، البتہ تاریخ کے تقرر کا اختیار فریق غالب کو ہی ہوگا۔

(۳۲) اگر کوئی فریق وقت و تاریخ معینہ پر بلا کسی عذر معقول وجائز کے آکر میچ نہ لڑائے تو صرف فرنٹ امپائر کی تصدیق پر اُس فریق کی شکست منصور کی جائے گی۔

(۳۳) اگر کوئی فریق دستور و قواعد کی تمام دفعات میں سے کسی دفعہ کی خلاف ورزی میدان میچ میں کرے گا تو فرنٹ امپائر کو اختیار ہوگا کہ وہ ایک میچ سے لے کر پانچ پیچول تک اس فریق پر جرمانہ کر سکتا ہے۔

(۳۴) اگر ان دستور و قواعد کے خلاف کوئی نئی بات میچ کے میدان میں پیش آئے گی تو اُس کا وقتی فیصلہ صرف فرنٹ امپائر کے اختیار میں ہوگا اور آئندہ ہونے والی پہلی میٹنگ میں اُس نئے قضیہ کے لئے ایک قاعدہ مقرر کرنا ضروری ہوگا۔

نقشہ سکور بک پتنگ بازی

گوشوارہ فتح و شکست مابین ...... کلب دہلی و ...... کلب دہلی
مقام ...... تاریخ ...... وقت ......

نام ممبران	فتح										میزان	شکست										میزان	نتیجہ کم

فرسٹ امپائر کا نام و سکونت ...... ہر راؤنڈ کتنے پیچ لڑائے گئے فتح شکست ...... میزان ...... تعداد ایام پیچ

فتح	۵	۱۰	۱۵	۲۰	۲۵	۳۰	۳۵	۴۰	۴۵	۵۰	۵۵	۶۰	۶۵	۷۰	۷۵	۸۰	۸۵	۹۰	۹۵	۱۰۰
شکست	۵	۱۰	۱۵	۲۰	۲۵	۳۰	۳۵	۴۰	۴۵	۵۰	۵۵	۶۰	۶۵	۷۰	۷۵	۸۰	۸۵	۹۰	۹۵	۱۰۰

میں تصدیق کرتا ہوں کہ ممبران ...... کائٹ کلب دہلی فریق اول نے ممبران ...... کائٹ کلب دہلی فریق ثانی کے ...... پیچ زیادہ کاٹے۔

آخری نتیجہ

دستخط فرسٹ امپائر ...... دستخط کپتان فریق ثانی ......

www.bhatkallys.com

پتنگوں کی مختلف صورتیں اور رنگ

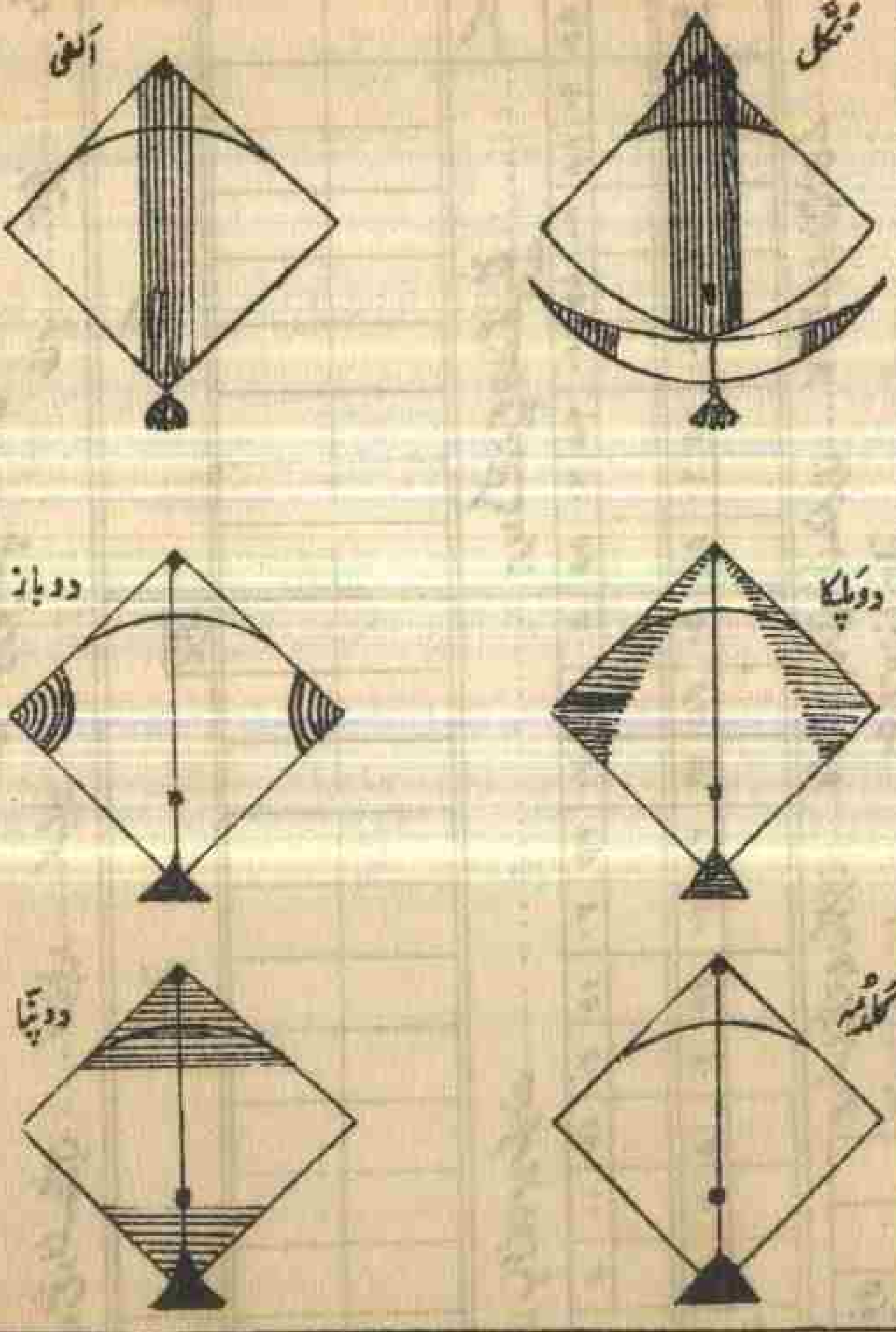

www.bhatkallys.com

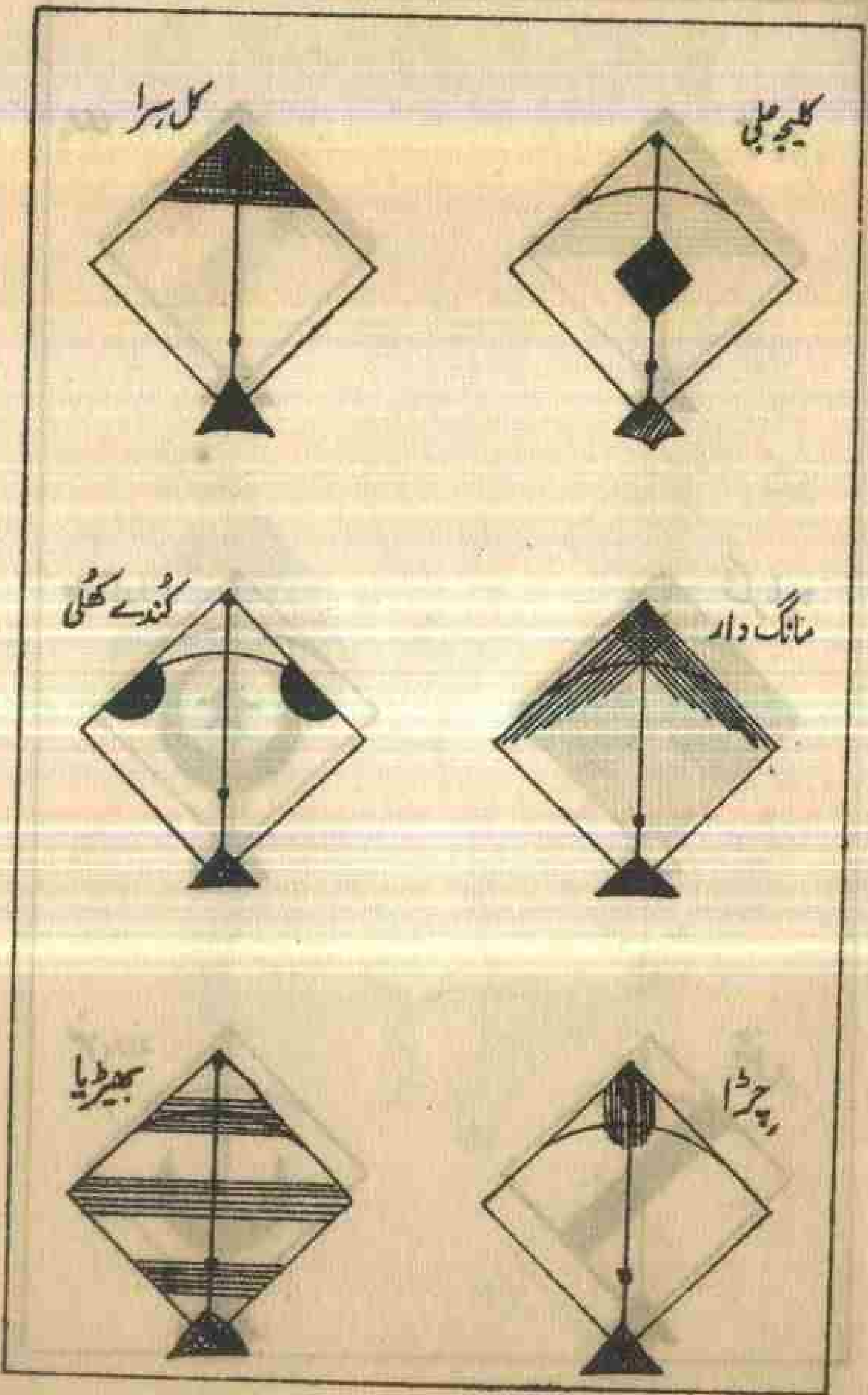

www.bhatkallys.com

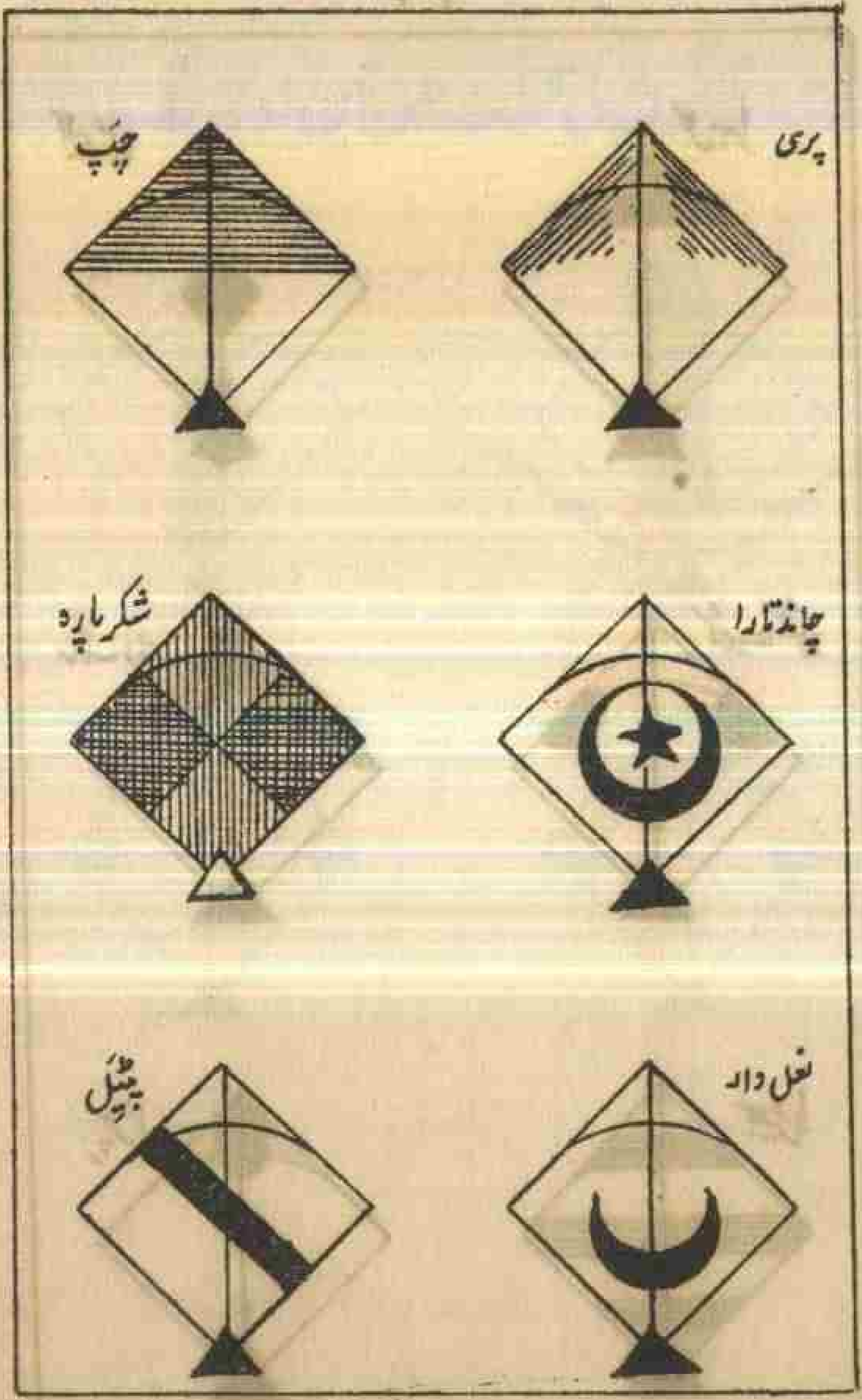

www.bhatkallys.com

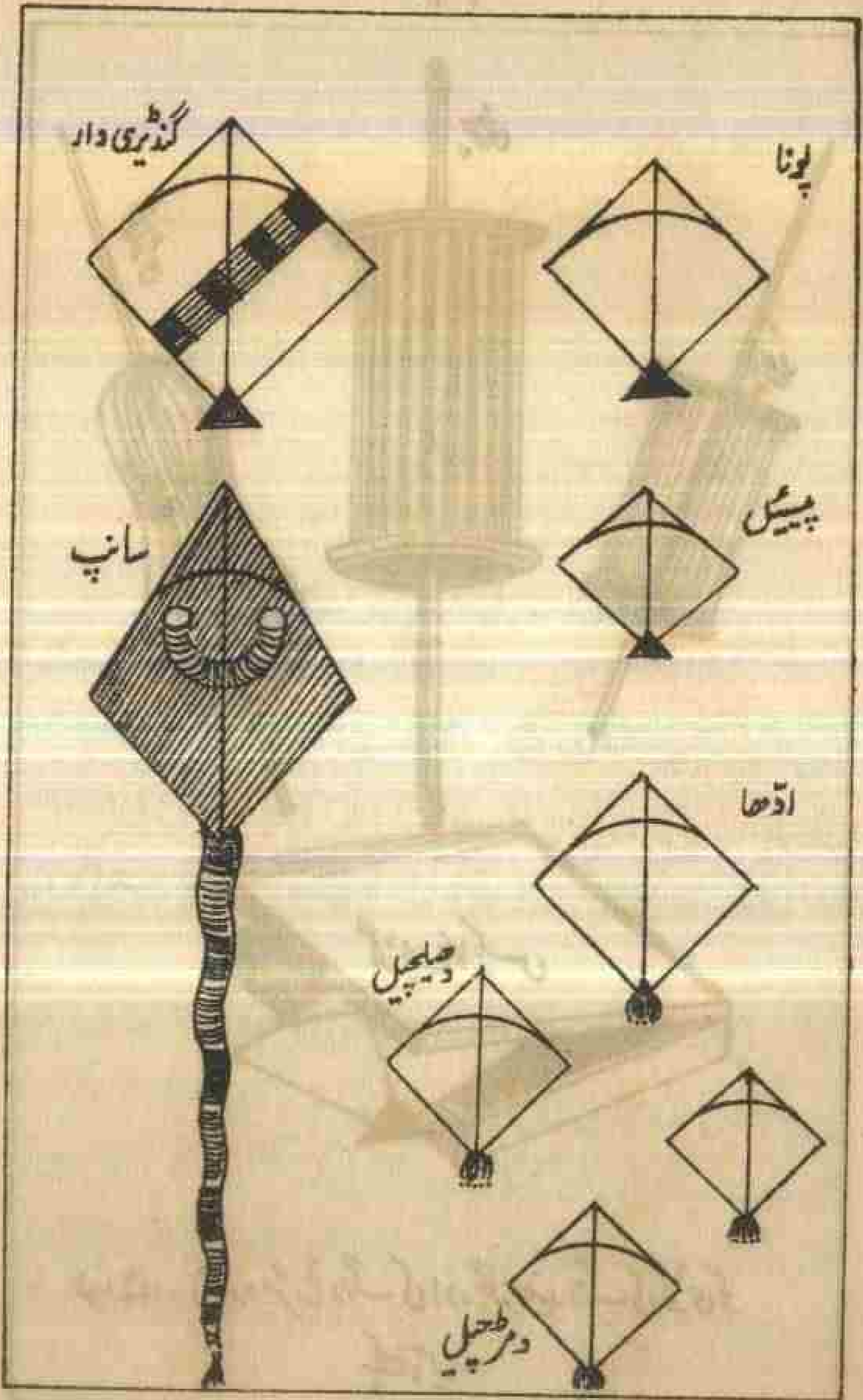

www.bhatkallys.com

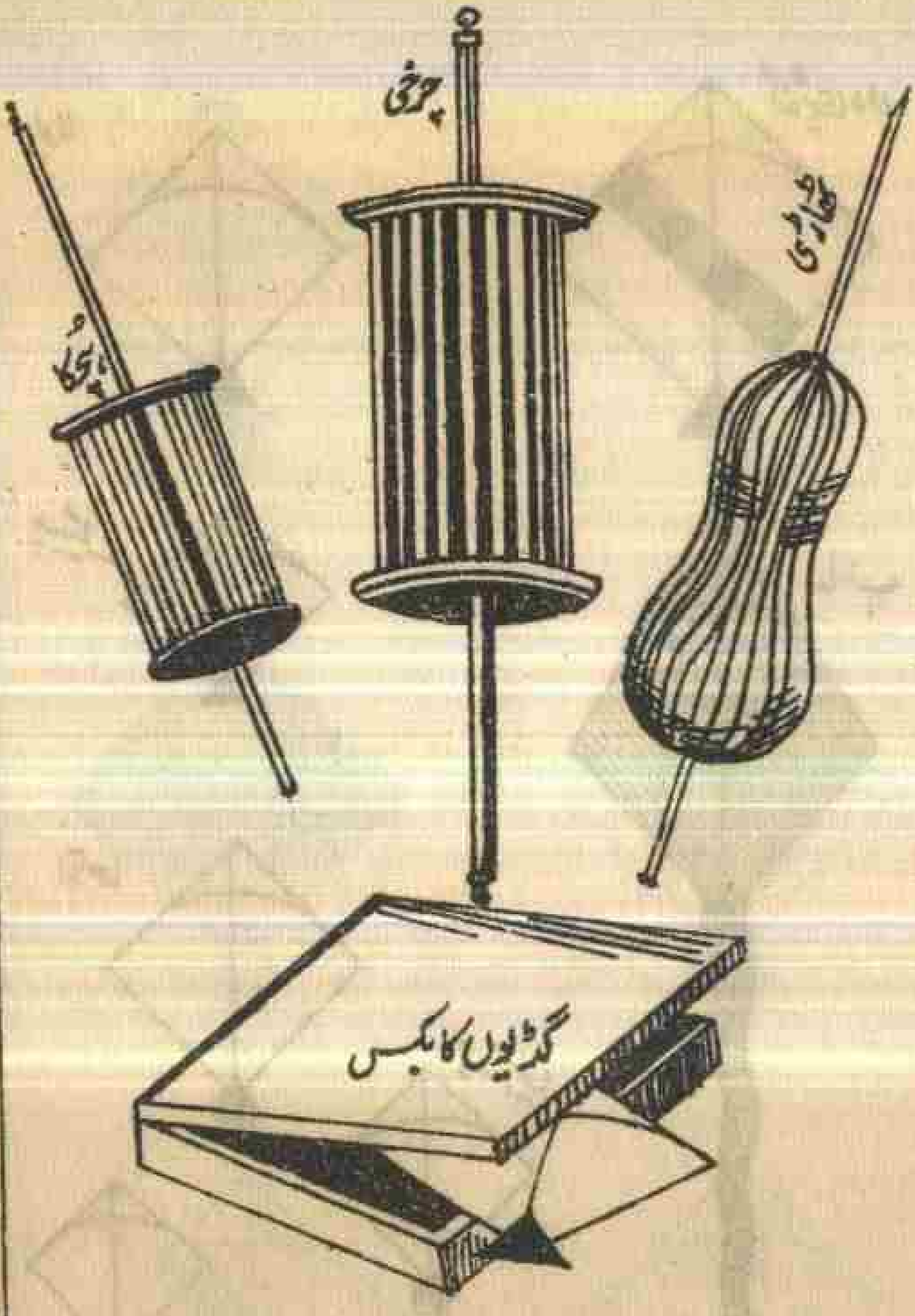

نوٹ:- انگارہ سُرخ رنگ کی اور بگلہ سفید رنگ کی گڈی کو
کہتے ہیں۔

www.bhatkallys.com

دِلّی کی شطرنج

بقول مرزا غالبؔ:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یہ دُنیا دار المحن ہے اور زندگی نام ہے، افکار و حوادث کا، لیکن انسان بھی جو مختلف عناصر کا مجموعہ ہے، کس بلا کا انسان ہے کہ اپنی بے سروپا زندگی اور ابتلاء کے باوجود اپنی دماغی آسودگی اور نشاطِ روحانی کے لئے، کسی نہ کسی طرح کوئی نہ کوئی ذریعۂ نشاط پیدا کر ہی لیتا ہے۔

فی الاصل مختلف عناصر کے امتزاج کی بدولت انسان کی فطرت میں بوقلمونی اور مزاج میں ایسی رنگا رنگی ہے کہ وہ عاجز ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مختارِ کل سمجھتا ہے۔ اس کی گوناگوں حکمتیں، راحت و عیش اور غم و افکار کے ڈانڈوں کو آپس میں اس طرح ملا دیتی ہیں کہ وہ طوفانِ عیش ہو یا موجِ حوادث، دونوں سے ہنستا کھیلتا گزرتا

www.bhatkallys.com

چلا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کو اپنی خودداری اور خود سری کا اتنا زعم ہو جاتا ہے کہ وہ دُنیا کو ایک بازیچۂ اطفال اور گردشِ لیل و نہار کو ایک تماشے سے زیادہ نہیں گردانتا۔

کسی نے ایک یونانی حکیم سے پوچھا کہ "فہم و فراست کا دارومدار کس چیز پر ہے؟" اُس نے کہا۔ "تندرستی پر" اس جواب پر فوراً ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ تندرستی کا انحصار کس چیز پر ہے؟ اگر ہم غور کریں تو اس دوسرے سوال کا جواب یونانی حکیم کے اس جامع اور مسکت جواب میں موجود ہے، اور وہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ مردانہ ورزشوں اور کھیلوں پر۔ محنت و مشقت کے بعد کھیل کود سے قوائے جسمانی کی نشوونما ظہور میں آتی ہے مضمحل یا رنجیدہ دماغ راحت پاتا ہے۔ اس طرح تمام اعضائے جسمانی صحت مند ہوتے ہیں لیکن جسمانی تربیت کا مسئلہ صرف صحت تک محدود نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا مبحث ہے جس کے متعدد پہلو ہیں۔ مثلاً عام معاشرتی بُود و باش کا مسئلہ۔ اس موضوع کا ماحصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسانی زندگی کا ماحول زیادہ سے زیادہ پُرامن، پُرکیف اور روح افزا ہونا چاہیئے۔ جب ہم جسمانی تربیت کا یہ وسیع مفہوم ذہن نشین کرتے ہیں تو پھر ہمارا مطمحِ نظر محض پرورشِ جسم نہیں رہتا بلکہ غرض و غایت یہ ہو جاتی ہے کہ جسمانی قوتوں کے پہلو بہ پہلو، حسیات اور جذبات کی بھی نشوونما ہو تاکہ ہماری دماغی

www.bhatkallys.com

اور عقلی صلاحیتیں استوار ہوں۔ اُن صلاحیتوں سے ہم اُن تعمیری اور تخلیقی کاموں میں حصّہ لیں جو انسان کی طبع خلاق کا جوہر کہلاتے ہیں، ایسا جوہر جس سے بعض اہم ترین جبلتوں کی تسکین ہوتی ہے۔

ماحصل یہ کہ انسانی زندگی جو افکار و حوادث کا مجموعہ ہے، اُس سے عہدہ برآ ہونے کے لیۓ اس کو جس قدر طاقتِ جسمانی کی ضرورت ہے اُس سے کہیں زائد وہ ذہنی اور روحانی بالیدگی کا محتاج ہے۔ چنانچہ حصولِ مسرت کی خاطر حکمائے قدیم نے ایسی چیزیں اور کھیل ایجاد کئے جو بظاہر ایک لہو و لعب کا ذریعہ ہیں۔ لیکن اُن اہلِ بصیرت کے نزدیک اُن میں بھی حکمت و دانش کے بہت سے اَسرار پوشیدہ ہیں۔ کھیل نہ صرف مشغلۂ حیات ہے بلکہ اس سے بنی نوعِ انسان کی شخصیت، افعال و کردار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کھیل ہی کی بدولت جرأت و ہمّت، استقلال، بہادری اور شجاعت کے اوصاف معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وہ رشتہ ہے جس سے محبت کا سلسلہ مضبوط ہوتا ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ "ایک سال کی گفتگو سے زیادہ ایک گھنٹے کا کھیل آدمی کی خصلت اور مزاج کو واضح کر دیتا ہے"۔

ان اختراعات اور ایجادات کا دائرہ بہت وسیع اور تفصیل طلب ہے۔ سیر و شکار سے لے کر درجنوں کھیل اور بازیاں قدیم اور جدید موجود ہیں۔ جن کو وقت اور موسم، موقع و محل کے

www.bhatkallys.com

اعتبار سے کھیلا جاتا ہے۔ اِن کھیلوں اور بازیوں میں بادشاہ و وزیر سے لے کر اپنے اپنے وقت اور زمانے میں ہر کبیر و صغیر نے کم و بیش حصّہ لیا ہے اور اب بھی تھوڑے یا بہت ان کھیلوں کو کھیلتے اور جی بہلاتے نظر آتے ہیں۔ اِن کھیلوں کی تفصیل تاریخ کی روشنی میں پھر کبھی سنیے گا۔ سر دست ہم صرف شطرنج کی تاریخ پیش کر رہے ہیں۔

شطرنج کا تعلق عقل و فہم، غور و فکر اور حافظہ و یادداشت سے ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کھیل منحوس ہے لیکن ہمیں اس قول میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔

شطرنج کا کھیل جس قدر عجیب اور دلچسپ ہے۔ اُسی قدر اُس کی تاریخ بھی عجیب اور پُر لطف ہے۔ مسٹر فورنس مصنّف "تاریخ شطرنج" ڈاکٹر وانڈر لنڈے اور علمائے مشرق و مغرب حیران ہیں کہ کس طرح شطرنج کے موجدِ اوّل نے ایک مربع فٹ کپڑے پر ساری دانائی کو ختم کر دیا ہے۔ اسیر کا شعر ہے:

جہاں کو وضع جہاں پائمال کرتی ہے
نئی طرح کی یہ شطرنج چال رکھتی ہے

صاحب بہارِ عجم لکھتے ہیں کہ یہ فارسی زبان کے لفظ "سترنگ" معرّب ہے جو "مردم گیاہ" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ مردم گیاہ،

www.bhatkallys.com

ایک قسم کا پودا ہے جو نواح چین میں بہ شکل مردم پیدا ہوتا ہے۔ اس کے پتوں کا رُخ ہمیشہ آفتاب کے مقابل رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سم قاتل ہے۔ چنانچہ تزک جہانگیری میں حنظل کے معنی میں آیا ہے۔ الغرض چونکہ مردم گیاہ کی جڑ اور پتے انسان کی صورت سے مشابہ ہوتے ہیں اور اس کے اکثر مہروں کے نام انسانی ناموں پر ہیں لہٰذا اس کو مجازاً استرنگ کہنے لگے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ "چترانگ" کا معرّب ہے۔ سنسکرت میں 'چتر' چار کے عدد اور "انگ' جسم یا عضو کو کہتے ہیں۔ چنانچہ پہلے 'چترنگی' اُس فوج کو کہا جاتا تھا جس میں چار رکن یعنی ہاتھی، گھوڑا، رتھ اور پیدل ہوں۔ چونکہ اس بازی میں شاہ و فرزیں کے علاوہ فیل، اسپ، رُخ اور پیادہ ہیں، لہٰذا اسی مناسبت سے اس کو چترانگ کہا جانے لگا۔

بعض محققوں کے نزدیک یہ لفظ "شُد رنج" تھا یعنی "رنج رفت" غم دُور ہوا۔ چونکہ اور کھیلوں کے مقابلے میں شطرنج زیادہ دلچسپ اور نشاط انگیز ہے اس لئے یہ غم کا بہترین مداوا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ لفظ شطرنج اصل میں "شصت رنگ" ہے یعنی متعدد رنگوں والا چونکہ اس کی بازیوں میں مختلف نقشے اور رنگ نظر آتے ہیں، اس لئے شصت رنگ مشہور ہو گیا۔ غرض جتنے مُنہ اُتنی ہی باتیں، حقیقت یہ ہے کہ ان مختلف روایتی ناموں کے باوجود ہر اسم کی رُو سے ایک اسم با مسمّیٰ کھیل ہے۔ کہا جاتا

www.bhatkallys.com

ہے کہ اس کھیل کو مسلمانوں نے ہندوؤں سے سیکھا اور وہی اس کے موجد تھے۔ چنانچہ سنڈے ایڈیشن، بمبئی کرانیکل مورخہ ۹ اپریل ۱۹۳۹ء میں ایک صاحب نے ایک طویل مضمون اسی شطرنج کے متعلق لکھا تھا جس میں مقالہ نگار نے اپنے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کی ایجاد کا فخر ہندوؤں کو حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"(۱) مہابھارت کے مشہور مصنف و مورخ بھاوشیہ پوران دیاس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پانڈوؤں کے سب سے بڑے لڑکے یدھشٹر کو شطرنج کا کھیل سکھایا تھا۔

(۲) شطرنج کے بہت سے اصول اور قواعد گن تاما نے مقرر کئے تھے جو زمانۂ وید کا ایک بہت ہی زیرک اور دانا شخص تھا۔

(۳) اس کھیل کو لنکا کے راجا راون کی بیوی مندودری نے راجا کے مشیروں کی مدد سے راون کو خوش کرنے کے لئے اُس وقت ایجاد کیا تھا جب راجا رام اور لچھمن نے اس کی راج دھانی کو فتح کرنے کے لئے اُس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔

(۴) ایک انگریز ادیب لکھتا ہے کہ شطرنج کو ہندوستان

www.bhatkallys.com

کے اُن لوگوں نے ایجاد کیا تھا جن کی زبان سنسکرت ہے اور ہندو کہلاتے ہیں۔"

مقالہ نگار نے اپنی اِن چاروں دلیلوں میں کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا۔ اس لیئے ہمیں اُن کی صحت میں تامل ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ کھیل قدیم زمانے میں یونان میں بھی کھیلا جاتا تھا۔ چنانچہ اہلِ یونان فلومیدوس کو اس کا موجد بتاتے ہیں۔

منشی بلاقی داس دہلوی، مرتب رسالہ شطرنج نے اس کی وجہ ایجاد کے متعلق ایک حکایت تحریر کی ہے کہ ہندوستان کا ایک بادشاہ بہت ہی جنگ جُو تھا۔ اتفاق سے وہ بیمار پڑا اور گھوڑے کی سواری کے قابل نہ رہا۔ اُس وقت اُس نے اپنے وزیروں کو بُلا کر کہا کہ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ میں گھر بیٹھے جنگ کا نقشہ دیکھ لیا کروں۔ درباریوں میں سے ایک حکیم لجاج نامی تھا۔ اُس نے بادشاہ کی خدمت میں شطرنج کا کھیل پیش کیا۔ بادشاہ کو بے اختیار پسند آیا۔ کہتے ہیں کہ جب بادشاہ نے حکیم لجاج کو انعام و اکرام دینا چاہا تو اُس نے بادشاہ سے صرف اتنے چاول طلب کئے جو بساط کے ۶۴ خانوں میں پہلے خانے سے دو چند کے حساب سے آجائیں جب حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ بیس خانوں تک چاول کا وزن اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ شاہی گودام بھی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

www.bhatkallys.com

رفتہ رفتہ یہ کھیل تمام ہندوستان میں پھیل گیا، یہاں تک کہ متحدہ ہندوستان سے ایران پہنچا۔ فردوسی نے اپنے شاہ نامے میں لکھا ہے کہ ہندوستان نے نوشیرواں کو دوسرے تحائف کے ساتھ شطرنج بھی بھیجی تھی تاکہ اُس کے ارباب دانش پر ہندوستان کے حکماء کی حکمت کا سکہ بیٹھے۔ نوشیرواں اور اُس کے وزراء اس کھیل سے ناواقف تھے، شطرنج دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ وزیر بزرجمہر کو بلایا گیا تاکہ وہ اس ہندی قاصد کے ساتھ شطرنج کھیلے۔ کھیل شروع ہوا، پہلی بازی برابر اُٹھی، دوسری بازی پر بزرجمہر نے ہندی شاطر کو مات دی۔ بعد ازاں بزرجمہر نے بھی ایک تختۂ نرد اختراع کیا اور تحفے کے جواب میں بادشاہ کی طرف سے ہندی قاصد کے حوالے کیا۔ اسی روایت کو صاحب "نفائس اللغات" نے یوں رقم کیا ہے اور یہی قرین قیاس اور معتبر معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"قاضی ابن خلقان کی کتاب وفیات الاعیان میں یوں لکھا ہے کہ شطرنج کا موجد صصہ ابن داہر ہندی ہے جس نے اس کھیل کو شاہ ایران کے نام پر اختراع کیا تھا۔ اس کا باعث یہ تھا کہ اردشیر ابن مالک جو سلاطین عجم کا پہلا بادشاہ تھا اُس نے تختۂ نرد ایجاد کیا تھا۔ اسی وجہ سے اُسے نردشیر بھی کہتے ہیں۔ اس

www.bhatkallys.com

ایجاد پر اہل عجم اپنے آپ کو بادشاہ ہند سے زیادہ مفتخر سمجھنے لگے۔ جب یہ خبر بادشاہ ہند کو پہنچی تو اُس نے صصہ کو حکم دیا........ چنانچہ اُس نے تختۂ نرد کے جواب میں یہ شطرنج ایجاد کی اور شاہ ایران کو بطور تحفہ بھیجی۔"

ایران سے یہ کھیل عرب پہنچا۔ عربوں کے ذریعے قبیلہ مورلیس میں پھیلا۔ اور انھوں نے اسے تمام یورپ میں رائج کیا۔

ابتدا میں شطرنج موجودہ طریق بازی سے مختلف انداز میں کھیلی جاتی تھی۔ دو آدمیوں کے بجائے اُسے چار آدمی کھیلتے تھے۔ ہر کھلاڑی کے پاس آٹھ مہرے ہوتے تھے۔ یعنی فیل، اسپ، رُخ اور شاہ اور چار پیادے۔ دو کھلاڑی ایک طرف اور اُن کے دو حریف دوسری طرف۔

بساط کا نقشہ یہ تھا:

رُخ	اسپ	فیل	شاہ			پیادہ	رُخ
پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ			پیادہ	اسپ
						پیادہ	فیل
						پیادہ	شاہ
شاہ	پیادہ						
فیل	پیادہ						
اسپ	پیادہ			پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ
رُخ	پیادہ			شاہ	فیل	اسپ	رُخ

www.bhatkallys.com

مہروں کی چال کا قاعدہ موجودہ دستور ہی کے مطابق تھا البتہ مہروں کا چلانا شاطر کے اختیار میں نہ تھا بلکہ اس کا انحصار پانسہ پھینک کر اُس سے ظاہر ہونے والے اعداد پر تھا، یہ ثابت کرنا بہت دشوار ہے کہ قدیم بازی جو چار کھلاڑیوں کے درمیان سولہ مہروں سے کھیلی جاتی تھی۔ دو کھلاڑیوں اور بتیس مہروں کی شکل میں رائج الوقت نقشے میں کب وجود میں آئی۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ تبدیلی ایران میں رائج ہونے کے بعد ظہور میں آئی ہوگی اور اہلِ ایران ہی موجودہ دستور کے مطابق اِن مہروں کی نئی ترتیب کے واضع ہیں۔ پہلے فرزین (وزیر) صرف ایک گھر آڑا چلتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ سب سے گھٹیا مہرہ تھا۔ جو فوقیت اور آزادی اِسے اِس وقت حاصل ہے وہ اُسے پندرھویں صدی عیسوی میں حاصل ہوئی تھی۔ پیادہ زمانۂ ایجاد سے آج تک ایک گھر سیدھا چلتا ہے اور اپنے حریف مہرے کو آڑا پیٹتا ہے۔ البتہ یورپ میں سولھویں صدی عیسوی میں پیادہ صرف پہلی چال کے وقت ایک گھر کے بجائے دو گھر چل سکتا تھا۔

رائج الوقت تختۂ بساط، ایجادِ شطرنج کے وقت شطرنجی نہ تھا، معلوم نہیں کہ خانوں میں یہ رنگا رنگی کب داخل ہوئی۔ فردوسی اپنے شاہ نامے میں اس عقدے کا حل یوں پیش کرتا ہے کہ ہندی قاصد، نوشیرواں کے دربار میں جو شطرنج لایا تھا اُس کی بساط

www.bhatkallys.com

رنگ برنگی تھی۔ یورپ میں تیرھویں صدی عیسوی سے قبل ایسی رنگین بساط کا کوئی وجود نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ امیر تیمور نے کوشش کی تھی کہ ۶۴ خانوں کے بجائے ۱۲۰ خانوں کی بساط ہو جائے لیکن وہ اپنی اس تدبیر میں ناکام رہا۔

شطرنج کے متعلق بعض بہت دلچسپ واقعات مشہور ہیں۔ چونکہ شطرنج میں فراست و دانائی اور حافظے و یادداشت سے کام لینا پڑتا ہے، اس لیے زمانۂ قدیم میں جب بادشاہ کسی شخص کو بڑے منصب پر مامور کرنا چاہتا تھا تو اس کی فراست و قابلیت کا امتحان لینے کے لیے اُسے جلسۂ شطرنج میں بھیجا جاتا تھا۔ اُس وقت بادشاہ بھی وہاں موجود ہوتا تھا۔ اگر بادشاہ مشاہدہ کرتا کہ شخص مذکور عقلمندی اور بُردباری کے ساتھ کھیلتا ہے تو اُسے اپنے حلقۂ ملازمت میں لے لیتا تھا۔

زمانۂ قدیم میں شطرنج کے ایسے متعدد شیدائی گزرے ہیں جنھوں نے اس کی بازیوں پر اپنا تن من دھن اور تاج و تخت حتیٰ کہ اپنی ملکہ اور رانیوں تک کو شطرنج پر قربان کر دیا تھا۔ ایک ایرانی شہزادے کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ وہ شطرنج کے شوق میں شاہ شطرنج بن چکا تھا۔ ناگاہ ایک دشمن نے اس کے علاقے پر حملہ کیا۔ یہ شہزادہ اُس وقت شطرنج کھیلنے میں مصروف تھا۔ غنیم نے شہزادے کے اس بے پناہ شوق اور فرصتِ استغراق سے فائدہ

www.bhatkallys.com

اُٹھا کر اُس کا شہر فتح کر لیا۔ بعد فتح غنیم کی فوج کے سپاہی شہزادے کو گرفتار کرنے کے لیے اُس کے محل پہنچے۔ شہزادے نے ایک نظر اُن کی طرف دیکھا اور بغیر کسی خوف و ہراس کے اُن سے کہا۔ "ذرا تامل کرو، میں اپنی بازی تو ختم کر لوں، پھر تمھارے ساتھ چلتا ہوں"۔

قرونِ وسطیٰ میں پادریوں کو شطرنج کھیلنے کی سخت ممانعت تھی۔ اس ارتکابِ جرم پر سزا بھگتنے کے علاوہ اُن کو مذہبی دستور کے مطابق کفارہ بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ انتہائی سزا کے طور پر اُن کو مذہب سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ پھر بھی شطرنج کھیلنے سے باز نہ آتے تھے۔

اسی شطرنج کے متعلق جہانگیر اور اُس کی روایتی محبوبہ دلآرام کا ایک رومان زمانۂ شہزادگی کا مشہور چلا آتا ہے۔ منشی سید احمد دہلوی مرحوم مصنف فرہنگِ آصفیہ نے اپنی فرہنگ میں اس واقعہ کو تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جہانگیر کی بیگمات میں سے ایک بیگم دلآرام آرام بھی تھی۔ مؤلف ملاحت والمقال نے اِسے شاہِ ایران کی بیگم لکھا ہے۔ القصہ ایک دن شہزادہ کسی ایرانی شہزادے کے ساتھ شطرنج کی بازی میں مصروف تھا۔ بازی مشروط تھی۔ شرط یہ تھی کہ اگر صاحبِ عالم کو مات ہوئی تو وہ اپنی بیگمات میں سے کسی ایک بیگم سے شہزادۂ ایران کے حق میں دست بردار ہو جائیں گے۔ اوّل اوّل تو بازی صاحب

www.bhatkallys.com

عالم کے حق میں رہی پھر اُس کا رُخ کچھ ایسا پلٹا کہ مات صاف صاف نظر آنے لگی۔ صاحب عالم گھبرا گئے اور بے قراری کے عالم میں پہلو پہ پہلو بدلنے لگے۔ حُسنِ اتفاق کہ اُس وقت دلآرام بھی حریری پردوں کی اوٹ سے بازی کا رنگ اور صاحب عالم کی مایوسی اور بے قراری کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ دِل ہی دل میں خود بھی بے چین اور مضطرب تھی۔ آخر اُس سے نہ رہا گیا۔ ایک معقول بہانہ تراش کر شہزادے کو فی الفور اپنی خواب گاہ میں بُلا بھیجا۔ بہانہ اس قدر معقول تھا کہ شہزادۂ ایران کو ہنسی خوشی خاموش ہونا پڑا۔ بازی ملتوی ہونے پر کوئی حرفِ شکوہ زبان پر نہ لاسکا۔ صاحب عالم نے شاید بازی کے آثار خراب دیکھتے ہی دِل ہی دِل میں یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ وہ شرط کے مطابق اپنی کون سی بیگم کو شہزادۂ ایران کی نذر کریں۔ اِدھر اندرونِ محل دوسری بیگمات بھی اِس صورتِ حال سے خبردار اور ہوشیار تھیں۔ اپنی اپنی جگہ وہ سب اس بات کی منتظر تھیں کہ جوں ہی صاحب عالم دلآرام کی خواب گاہ کا رُخ کریں وہ راہ ہی میں اُن سے مخاطب ہو کر اپنا پہلو محفوظ کریں۔ اِدھر صاحب عالم نے محل کے اندر قدم رکھا کہ سب سے پہلے جہاں بیگم ایک عجیب شوخی اور تمکنت کے ساتھ مسکراتی ہوئی سامنے آئی۔ صاحب عالم اُس کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکے اور پوچھا۔

"کیوں؟"

جہاں بیگم نے جہانگیر کے رُوبرو اپنی تمنائے جہانگیری کو برجستہ

www.bhatkallys.com

یوں پیش کیا:

تو بادشاہِ جہانی، جہاں زدست مدہ

کہ بادشاہِ جہاں را، جہاں بکار آمد

صاحب عالم نے دلآرام کی خواب گاہ کی طرف قدم اُٹھایا اور جہاں بیگم کی جانب دیکھ کر مُسکراتے ہوئے کہا۔ "خوب!"

جہاں بیگم کے بعد حیات بیگم ایک مخصوص ناز و ادا کے ساتھ راہ میں جہانگیر کی منتظر تھی۔ حیات کو اپنی حیات مطلوب تھی۔ اُس کے خیال میں جہان کی خواہش اور وقعت بے معنیٰ تھی۔ چنانچہ صاحبِ عالم کے سامنے آتے ہی اپنی آرزوئے حیات کو یوں پیش کیا:

جہاں خوش است ولیکن حیات می باید

اگر حیات نہ باشد، جہاں چہ کار آید

صاحبِ عالم دوبارہ متبسم ہوئے اور کہا۔ "چہ خوب" یہ کہہ کر پھر دلآرام کی خواب گاہ کی طرف چلے۔ حیات کے بعد تیسری محل فنا بیگم نے اپنے عشوۂ جہاں سوز کے ساتھ غمزۂ حیات کو اپنے فلسفیانہ کلام سے یوں بالائے طاق رکھ دیا:

جہان و حیات و ہمہ بے وفا است

طلب کن فنا را کہ آخر فنا است

جہان اور حیات دونوں بے وفا ہیں۔ نہ جہان کو بقا ہے نہ حیات کو دوام حاصل ہے۔ جب اوّل و آخر فنا ہے تو فنا سے رُوکش ہونا کیا

www.bhatkallys.com

معنی؟ صاحب عالم یہ سُن کر پہلے سے اور زیادہ متاثر ہوئے۔ مُسکرا کر کہا۔ "بسیار خوب" یہ کہہ کر دلآرام کی خواب گاہ میں پہنچے جو ان تینوں بیگمات سے زیادہ محبوب تھی۔ دلآرام نے جہانگیر کے آتے ہی شطرنج کی بازی کا وہ نقشہ پیش کیا جو اُس وقت صاحب عالم کے روبرو تھا اور پھر ایک بڑے دل رُبا انداز میں مُسکرا کر یوں کہا:

شاہا دو رُخ بدہ، دِلآرام را مدہ
پیل و پیادہ پیش کُن اسپ کِشت مات

صاحب عالم! دونوں رُخ دے دیجئے مگر اپنی دِلآرام سے ہرگز دست بردار نہ ہوں۔ فیل اور پیادے کو آگے بڑھائیں، آخری چال گھوڑے کی ہوگی، اُسی کی شہ پر حریف کو شکست دے دیں۔ جہانگیر خوشی کے عالم میں تڑپ اٹھا۔ بے ساختہ کہا۔ "خوب! دِلآرام خوب" باہر آکر دِلآرام کی بتائی ہوئی چالوں کے مطابق شہزادۂ ایران کو مات دی۔

اوّل وقت بازی کا نقشہ یہ تھا:

(ملاحظہ ہو نقشہ صفحہ ۳۲)

www.bhatkallys.com

مہرہ حریف سیاہ — مہرہ جہانگیر سفید

						شاہ سیاہ	
رخ سفید			اسپ سفید				
	پیدل سیاہ	پیدل سیاہ	اسپ سیاہ	پیدل سفید	پیدل سفید		
	فیل سیاہ		پیدل سیاہ			پیدل سفید	
	پیدل سیاہ		اسپ سیاہ				
		وزیر سیاہ	پیدل سیاہ	پیدل سیاہ			رخ سفید
رخ سیاہ							فیل سفید
			شاہ سفید				رخ سفید

مات کے وقت بازی کا نقشہ یہ تھا:

مہرہ حریف سیاہ — مہرہ جہانگیر سفید

					اسپ سفید		
رخ سیاہ					پیدل سفید		شاہ سیاہ
	پیدل سیاہ	پیدل سیاہ	اسپ سیاہ	پیدل سفید			
	فیل سیاہ		پیدل سیاہ	فیل سفید		پیدل سفید	
	پیدل سیاہ						
		وزیر سیاہ	پیدل سیاہ	پیدل سیاہ			
رخ سیاہ							
			شاہ سفید				

www.bhatkallys.com

جہانگیر کو شطرنج سے کس درجہ عشق تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ اپنی چہیتی ملکہ نور جہاں کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا تو اُس کے سامنے ایک مربع فٹ کی بساط اور انگلیوں کی پوروں کے برابر چھوٹے چھوٹے مہرے نہ ہوتے تھے بلکہ اُن کی جگہ محل کے اندر ایک مرصع قطعۂ زمین پر مرمر اور موسیٰ کی پچی کاری کا ایک خوش نما اور دل فریب تختۂ بساط ہوتا۔ اُس پر حسین و جمیل داسیاں کچھ پیادوں کے لباس میں ملبوس ہوتیں، باقی بادشاہ اور وزیر کے رُوپ میں اپنے سر پر تاج رکھے، اسپ و فیل اور رُخ اپنے سروں پر خود لگائے، ہاتھوں میں نیزے، تلواریں اور ڈھالیں سنبھالے، مجسم مہرے بن کر اپنے خانوں میں استادہ ہوتیں۔ بادشاہ اور ملکہ اپنی بلند نشست گاہ پر بیٹھے بیٹھے اپنے مطلوبہ مہرے کو مناسب خانے پر نقل و حرکت کے لئے یاد کرتے۔ وہ پری پیکر مہرہ فوراً ایک دل رُبا انداز میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا۔ اپنے رُتبے اور درجے کے مطابق اپنے حریف پر وار کرتا۔ روکتا یا پیٹ کر بساط چھوڑ دیتا۔ غرض اسی طرح پوری بازی کھیلی جاتی۔ ادھر یہ بازی جاری رہتی اُدھر دل کی بازی لگتی رہتی۔

فی زمانہ شطرنج کا کھیل ایک بین الاقوامی کھیل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مشرق و مغرب میں کوئی ملک اور شہر ایسا نہیں جہاں اس کے دل دادہ اور کھلاڑی موجود نہ ہوں۔ ہر ملک میں بڑے

www.bhatkallys.com

نامی اور ماہرِ شطرنج کھلاڑیوں کا آپس میں مقابلہ ہوتا ہے۔ فاتح پارٹی اور فاتح شاطر کو بازی جیتنے پر گراں قدر انعامات دئیے جاتے ہیں۔ اہلِ مغرب نے شطرنج کی عام اور مقابلے کی بازیوں کے لئے باقاعدہ ضوابط مقرر کرکے دوسرے کھیلوں کے دستور کی طرح ان کو رائج کیا ہے۔

انگریزی ادب میں جو ہر صنف اور موضوع کی کتابوں سے مالا مال ہے شطرنج پر بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ہماری نظر سے بھی ایک کتاب ESSAY GUIDE TO CHESS. مصنفہ بیرورج ایچ وڈگرزی ہے۔ اس کتاب میں شطرنج کھیلنے کے آداب اور قواعد کے علاوہ مختلف بازیوں کے نقشے کھلاڑیوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے دئے گئے ہیں۔ اس میں چند دلچسپ تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ ہم اس وقت اِن تصویروں کا قلمی خاکہ کھینچ کر اُن کا تعارف کراتے ہیں:

ایک تصویر میں "ٹائم کیپر (ناظمِ وقت) گھڑی" کی تصویر دی گئی ہے۔ لکڑی کے ایک کیس میں دو گھڑیاں برابر لگی ہوئی ہیں، جن کے سروں پر دائیں بائیں دو بٹن بھی لگے ہوئے ہیں۔ اِن گھڑیوں کی ساخت میں یہ عجیب و غریب صنعت رکھی گئی ہے کہ جب تک کھلاڑی گھڑی کا بٹن نہ دبائے اُن میں سے ایک گھڑی برابر چلتی رہتی ہے اور دوسری خاموش رہتی ہے۔ گویا اس طرح ہر دو شاطروں کی چال کا وقت

www.bhatkallys.com

جدا جدا شمار میں آتا رہتا ہے۔ گھڑی کے استعمال کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک شاطر اپنی چال چلنے وقت اپنی گھڑی کا بٹن دبا دیتا ہے۔ بٹن دباتے ہی اُس کی گھڑی بند ہو جاتی ہے اور دوسرے شاطر کی گھڑی حرکت کرنے لگتی ہے۔ کچھ وقفے کے بعد دوسرا شاطر بھی یہی عمل کرتا ہے۔ اگر کوئی شاطر بٹن دبانا بھول جائے تو مقررہ مُنصف اس شاطر کو متوجہ کرتا ہے۔ یہ مُنصف اپنی اسکور بک میں شاطروں کی چالیں بھی برابر نوٹ کرتا رہتا ہے تاکہ نتیجے کے اعلان کے وقت وہ یہ بتا سکے کہ ان شاطروں نے ایک گھنٹے میں اس قدر چالیں چلی تھیں۔ دونوں شاطر بھی اپنی اپنی نوٹ بک میں اپنی چالیں فی گھنٹہ نوٹ کرتے رہتے ہیں۔ ابتدا میں ان گھڑیوں پر بٹنوں کی جگہ بارہ کے عدد پر ایک جھنڈا نصب رہتا تھا جو مقررہ وقت میں خود بخود نیچے جھک جاتا تھا تاکہ ہر دو شاطر اپنی اپنی چالیں مقررہ وقت پر باقاعدہ چلتے رہیں۔

ابتدائی چالیں اوّل گھنٹے میں بیس، دوسرے میں پندرہ، تیسرے میں بارہ اور بعد ازاں باقی ماندہ وقت میں بارہ بارہ چالیں فی گھنٹہ چلنا لازم آتا ہے۔ ہر شاطر کو اپنی چال چلنے کے لیے صرف تین منٹ کا وقفہ ملتا ہے۔ ایک سیکنڈ بھی زیادہ نہیں ملتا۔ نیز یہ کہ ایک گھنٹے میں ایک شاطر کو بہر نوع بیس چالیں چلنا لازم ہے۔ جو شاطر اس شرط کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے وہ شکست خوردہ کہلاتا ہے۔ بالعموم زیادہ سے زیادہ ساٹھ چالوں میں ایک بازی ختم ہو جاتی ہے۔

www.bhatkallys.com

دوسری تصویر شہر ماسکو کی ہے جس میں شطرنج کا ایک بین الاقوامی مقابلے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ ایک بلند، طویل اور عریض اسٹیج پر کئی شاطر شطرنج کھیلنے میں مصروف ہیں۔ اُن کے درمیان مناسب مقامات پر منصف مقابلے کی نگرانی میں مصروف ہیں۔ اسٹیج کے گیلری نما فرش پر شطرنج کے شوقین ناظرین کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ اِن ناظرین کے روبرو اسٹیج کی عقبی دیوار پر پردۂ فلم کی طرح ایک لمبے چوڑے بورڈ پر شاطروں کی تعداد کے مطابق شطرنج کی بساطیں نمایاں ہیں۔ شاطر جو چال چلتا ہے، منصف اُس سے متعلق بورڈ پر وہی چال چل دیتا ہے۔ بجلی کے مخصوص سوئچ دبانے سے بھی یہ تمام چالیں خود بخود بورڈ پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ہر شاطر کی بساط کا نقشہ اور اُس کی چال کا رُخ متواتر حاضرین کے رُوبرو رہتا ہے تا آنکہ تمام بازیاں یکے بعد دیگرے ہار جیت پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس طرح بیک وقت کئی شاطر اپنے کھیل اور دانائی کا مظاہرہ کر کے سیکڑوں آدمیوں کو شطرنج کے دلچسپ نقشے پیش کر کے دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

تیسری تصویر میں شہرۂ آفاق شاطر مسٹر کاٹانو سکی کو اپنے اکیس حریف شاطروں کے مقابلے میں بیک وقت کھیلتے ہوئے اس طرح دکھایا ہے کہ وہ اسٹیج کے نیچے ایک میز کے روبرو شاطروں کی طرف پشت کئے ہوئے بیٹھا ہے اُس کا دایاں ہاتھ اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہے۔ اُس کے بُشرے سے

www.bhatkallys.com

ایسا واضح ہوتا ہے گویا اُس کے تمام حریفوں کی بساطوں کے نقشے اُس کے دماغ میں محفوظ ہیں اور وہ اپنی حاضر دماغی کے ساتھ اپنی عقل اور دانائی کو کام میں لا کر ہر ایک حریف کو شکست دینے کا عزم بالجزم کئے بیٹھا ہے اور ایک عالمِ تفکر میں غرق ہے۔

اُس کے قریب ہی ایک بوڑھا منصف موجود ہے۔ دوسرے حریفوں کے رُوبرو بھی الگ الگ منصف کھڑے ہیں۔ باری باری ہر حریف اپنی چال چلتا ہے۔ متعلقہ منصف ہر شاطر کی چال سے کالٹانوسکی کو آگاہ کرتا ہے۔ اب وہ قدرے غور و فکر کے بعد منصف کو اپنی چال بتاتا ہے کہ یہ چال فلاں نمبر کے شاطر کی چال کے جواب میں ہے۔ اس طرح کالٹانوسکی اپنے کسی بھی حریف کی بساط کو دیکھے بغیر اپنے منصف کی زبانی ہر حریف کی چال کے جواب میں اپنی چالیں چلتا رہتا ہے تاآنکہ سب کی بازیاں یکے بعد دیگرے ہار یا جیت پر ختم ہو جاتی ہیں۔ کالٹانوسکی نے اِس یک وقتی مقابلے میں اپنے اکیس حریفوں میں سے چودہ شاطروں کو مات دی اور صرف سات شاطروں سے مات کھائی۔

چوتھی تصویر "الفورڈ کنٹری" اسکول کی ہے۔ اس میں ۱۲۷ لڑکے ایک اُستاد سے شطرنج کا سبق حاصل کر رہے ہیں۔

القصہ اگر شطرنج کو محض لہو و لعب کا ذریعہ نہ بنایا جائے اور وقتاً فوقتاً محض تفریحِ طبع کے لئے اسے کھیلا جائے تو

www.bhatkallys.com

بلاشبہ اس شطرنج کی بدولت انسانی عقل و فہم، غور و فکر اور حافظے و یادداشت کی کافی نشوونما ہو سکتی ہے اور دل و دماغ سے بہت سے مفید کام لئے جاسکتے ہیں۔

---

www.bhatkallys.com

دِلّی کی مُہر کنی

مُہر کنی کا تعلق فنِ خطّاطی یا کتابت سے ہے اور کتابت عبارت ہے عمدہ اور خوش نما تحریر سے۔ تحریر کا رواج آج سے کئی ہزار برس قبل اُس وقت ایجاد ہوا تھا جب حضرت انسان نے حیوانیت اور بربریت کو چھوڑ کر انسانیت اور آدمیت کے دائرے میں قدم رکھا تھا، یا یوں کہیے کہ تہذیب و تمدّن کی ابتدائی داغ بیل پڑ رہی تھی۔

صورت یہ تھی کہ نسلِ انسانی بڑھتے بڑھتے اور پھیلتے پھیلتے ایک دوسرے سے دُور دراز مقامات پر آباد ہونے لگی۔ زندگی بسر کرنے کے لئے اُنھیں نت نئی ضرورتیں پیش آئیں۔ اُن میں سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ سب ایک دوسرے کے حال و قال سے واقف ہوں۔ دُور رہنے کی وجہ سے آپس میں ملنے جُلنے کا موقع نہ ملے تو تحریر بھیج کر کام لیا جائے تاکہ ان تحریروں کے ذریعے لوگوں کے مختلف خیالات، حالات اور واقعات کو آئندہ کے لئے محفوظ

www.bhatkallys.com

کیا جائے اور مستقبل میں سابقہ مشاہدے اور تجربوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

تحریر کو اس طرح شکل دی گئی کہ اوّل اوّل چند مخصوص نشانات (تصاویر اور ٹیڑھی سیدھی لکیریں) وضع کر کے اُن کو حروف کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ بعد ازاں اُن میں مختلف قسم کے دائرے، زاویئے، شوشے اور صحتِ تلفظ کے لئے نقاط اور اعراب مقرر کئے گئے۔ اِن مختلف شکلوں کا نام خطوط رکھا گیا۔ پھر علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اِن خطوط میں خوب صورتی اور بانکپن پیدا کر کے ان کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کیا گیا جن کی تعداد قدیم و جدید خطوط کو ملا کر کئی سو تک پہنچتی ہے۔ اِن صدہا خطوط میں سے جو خطوط برصغیر پاک و ہند میں عربی، فارسی اور اردو رسم الخط کے لئے سب سے زیادہ مستعمل اور رائج ہوئے، وہ نسخ اور نستعلیق ہیں۔ انہی دونوں خطوط سے ہمارے موضوع مہر کنی کا تعلق ہے۔

قدیم زمانے میں آج کل کی طرح چھاپے خانے نہ تھے بلکہ خطاطی کا دور دورہ تھا۔ شاہی دفترِ انشا میں خوش نویسوں کے سوا کسی دوسرے کا تقرر ناممکن تھا۔ انہی خوش نویسوں میں سے ایک فرمان نویس یا سند نگار کہلاتا تھا۔ یہ بادشاہ کے خطوط اور فرمان لکھا کرتا تھا۔ ارکانِ حکومت کے احکام، نئی عمارتوں کے کتبے، چاندی سونے کے منقش کام کی وصلیاں (جن پر آیات

www.bhatkallys.com

قرآنی، احادیث نبوی، حکیمانہ اقوال، قطعات اور رباعیات وغیرہ درج ہوتی تھیں) اور قدیم جدید تصانیف کی کتابت دوسرے نامور خطاط کیا کرتے تھے۔ انہی چیزوں میں مُہر کنی بھی شامل تھی۔

یہ صحیح صحیح نہیں کہا جا سکتا کہ مُہر کب ایجاد ہوئی اور کس نے ایجاد کی، لیکن اتنی بات ضرور تحقیق ہے کہ اس کا تعلق زمانۂ قدیم سے ہر مُلک، ہر قوم اور اُن کے تمام بادشاہوں اور امیروں سے رہا ہے۔ انہی خطاطوں میں سے مُہر کن بھی ہوا کرتے تھے۔

یہ مُہر مختلف ممالک میں مختلف ناموں سے موسوم تھی مثلاً

عرب:	خاتم	KHATAM
فارس:	نگیں	NAGIN
فرانس:	کاشیٹ	CACHET
جرمنی:	پیٹ شافٹ	PETCHAFTE
ٹرکی:	مہرلی	MUHRLE
اسپین، پرتگال:	سلیس	SELLOS
اٹلی:	سگلّی	SIGILLI
رُوم:	سگلّلم	SIGILLUM
انگلستان:	سیل	SEAL
تامل:	مُترا، مُدرا	MUTRA-MUDRA

مُہر کی حیثیت محض مُہر تک ہی محدود نہ تھی بلکہ بعض لوگ اسے

www.bhatkallys.com

بطور انگوٹھی بھی اپنی انگلی میں پہنا کرتے تھے ۔ عیسائیوں میں شادی بیاہ کے موقعے پر دولہا دُلہن ایک دوسرے کو پہناتے تھے ۔ یہ رسم اب تک قائم ہے ۔ اہلِ یونان و روما کی مہروں پر عجیب و غریب قسم کے نقش و نگار اور شکلیں کندہ ہوتی تھیں جس سے اُن کے علم و مذاق کا پتا چلتا ہے ۔ یونانی علم الاصنام کی کتابوں میں ایک ایسی مہر دار انگوٹھی کا بھی ذکر ملتا ہے جس کو پُل قراط نامی جادوگر نے سمندر میں پھینک دیا تھا اور پھر جادو کے زور سے ایک مچھلی نے باہر آکر اُسے زمین پر اُگل دیا تھا ۔ مہرِ سلیمانی اس لئے مشہور تھی کہ اُس پر اسمِ اعظم کندہ تھا جس کے اثر سے تمام جن و پری دیو اور آسیب حضرت سلیمان ؑ کے تابع فرمان تھے ۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ بعض کے نزدیک آسیب کے خلل سے محفوظ رہنے کے لئے مہر کا مصرف صرف تعویذ تھا ۔ ایسی مہروں پر اللہ کا نام یا حروف ابجد میں کوئی آیتِ قرآنی درج ہوتی تھی جسے وہ اپنے گلے میں پہنتے تھے یا بازو پر باندھتے تھے ۔ مہرِ سلیمانی کا نقش SWASTIKA صلیب یا نازی حکومت کے نشان سے ملتا جلتا تھا ۔

مہر کی اہمیت کا اندازہ مزید اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کو آپس کے معاملات اور لین دین تک میں اس کی ضرورت لاحق ہوتی تھی ۔ مہر کسی شخص کی ذاتی تحریر اور اُس کے دستخط سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی تھی ۔ جس کاغذ پر لگ جاتی وہ عدالتی دستاویز

www.bhatkallys.com

سمجھا جاتا تھا۔ قیمتی اشیاء کو محض ایک ڈوری سے باندھ کر اُس کی گرہ کے مقام پر مُہر لگا دیتے تھے تو پھر اُس کے لئے قفل اور کُنجی کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ اور غیر کی دست بُرد سے محفوظ ہو جاتی۔ اسی طرح جب تک خاندانی شجرے اور محضر نامے مُہروں سے مزیّن نہ ہوتے، کسی کے نسب کی تصدیق اور خاندانی عظمت قابلِ تسلیم نہ ہوتی تھی۔ تمام اُمراء کے پاس اپنی مہریں ہوتی تھیں لیکن یہ مُہریں وہ خود استعمال نہ کرتے بلکہ اُن مُہروں کے خفیہ محافظ، اُن کے خاص اور معتمد مہر بردار ہوتے تھے۔ ہر مُہر بردار کے پاس مُہریں رکھنے کے لئے ایک ریشمی خریطہ یا تھیلی ہوتی۔ یہ خریطہ اُن کے سینے پر اُن کے لباس کے نیچے پوشیدہ ہوتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی خریطہ نکال کر مُہریں لگاتے۔ کسی کو اپنی مُہر سپرد کرنے کے معنی یہ ہوتے تھے کہ اُس نے اپنے جملہ اختیارات اپنے مہر بردار کو سونپ دئے ہیں۔

اُمورِ سلطنت میں خواہ وہ فوجی ہوں یا دیوانی جب تک اُن احکام، فرامین اور خطوط پر جو ایک بادشاہ کی جانب سے دوسرے بادشاہ کے نام جاتے تھے مہر ثبت نہ ہوتی وہ نامکمل رہتے اور کوئی کارروائی عمل میں نہ آتی۔

شاہانِ فارس کے ہاں تین مُہر بردار ہوتے تھے اور تین ہی قسم کی مُہریں بھی تھیں جو فوجی، دیوانی اور اُمورِ خارجہ کی مثلوں اور کاغذات پر لگائی جاتی تھیں۔ اِن کے علاوہ دو مُہریں اور تھیں۔ یہ

www.bhatkallys.com

صرف اُن کاغذات پر لگتی تھیں، جن کا تعلق براہِ راست محل شاہی کے معاملات سے ہوتا تھا۔ یہ سب مہریں ایک بکس میں مقفل ہو کر محل میں رکھی جاتی تھیں۔ مہر کے اس بکس پر خود بادشاہ اپنی ایک مُہر ثبت کرتا۔ ایک ہفتے تک تمام کاغذات جمع ہوتے تا آنکہ جمعہ کے دن اِن سب پر مہریں لگائی جاتیں۔

اسلام میں سب سے پہلی مہر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رائج فرمائی تھی۔ اس سے پہلے عرب میں مُہر کا کہیں کوئی رواج نہ تھا۔ رسولِ اکرم ؐ کی مُہر چاندی کی تھی۔ اُس کا نگینہ حبشہ کی ساخت اور تراش کا تھا جس پر

اللّٰہ

محمد ؐ

رسول

کے الفاظ نقش تھے۔ آپ نے یہ مُہر سن ہجری کے ساتویں سال، ماہ محرم میں اُن خطوط پر ثبت فرمائی تھی جو قیصرِ روم، شہنشاہِ عجم، عزیزِ مصر اور دیگر رؤسائے عرب کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ شاہانِ عجم کا دستور تھا کہ وہ کوئی تحریر جب تک مہر شدہ نہ ہو مستند نہ مانتے تھے۔ المختصر یہ مُہر مقدس حضرت کے زمانے میں آپ کے خطوط اور فرامینِ رسالت پر ثبت ہوتی رہی۔ آپ کی وفات کے بعد خلافتِ حضرت عثمان رضؓ تک خلفائے راشدین کے احکامات اسی مُہر

www.bhatkallys.com

سے مزین ہوتے رہے۔ ایک دن اتفاق سے یہ مہر حضرت عثمان رضؓ کے ہاتھ سے مدینہ منورہ کے ایک کنوئیں "بیر اریس" میں گِر کر گم ہو گئی۔

حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مُہروں کے نگینوں پر اُن کے اسم گرامی کے ساتھ "عبد اللہ" کے الفاظ کندہ تھے۔ دیگر اہلِ عرب کی مُہروں کی ساخت عموماً بیضوی، چوکور، شش پہل اور ہشت پہل ہوتی تھی۔ گول اُس وقت تک نہ ہوتی جب تک کہ وہ کافی بڑی نہ ہو۔ یہ گول مہر انگوٹھی کے بجائے لکڑی کے ایک دستے میں نصب ہوتی۔ چھوٹی مہروں کے لئے قیمتی جواہرات میں سے ہیرا، نیلم، یاقوت، عقیق، مرجان یا فیروزہ استعمال ہوتا تھا۔ بقول علّامہ بلاذری اُس وقت عرب جیسے تجارتی مرکز میں سارا کاروبارِ تجارت محض مُہر پہ ہوتا تھا۔

مشہور مصنف چارلس وائٹ لکھتا ہے کہ قدیم تُرکی میں ایک بازار "حکاک لار کرکشی" کے نام سے مُہر کنوں کے لئے مخصوص تھا، جہاں پچاس مشہور اور ماہر مُہر کن، مُہر کنی اور سکہ سازی میں مصروف رہتے تھے۔ اُن میں زیادہ تر مسلمان تھے جو عربی، فارسی اور ترکی رسم الخط میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اُس وقت خط کوفی سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ مہر کنی کا فن حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اوّل ضروری تعلیم، تعلیم کے بعد خوش نویسی کی مہارت پھر مسلسل سات

www.bhatkallys.com

سال تک مہر کنی کی سخت اور کٹھن مشق کرنی پڑتی تب کہیں وہ صحیح معنوں میں مُہر کن کہلاتا۔ پولیس ان لوگوں کی حاضر و غائب نگراں رہتی اور وقت بے وقت باقاعدہ تلاشی بھی لیتی۔ مُبادا وہ جعلی مُہریں بنا سکیں یا کرنا جائز فائدہ اٹھائیں۔ اگر کبھی کوئی مُہر گم ہو جاتی تو نئی مُہر میں ایسا باریک اور نامعلوم سا فرق رکھا جاتا تاکہ اصلی اور نقلی مُہر فوراً شناخت میں آجاتی۔

آئینِ اکبری میں ہم کئی مُہر کنوں اور مُہروں کا ذکر پاتے ہیں۔ اُن میں سے چند یہ ہیں:

مولانا مقصود ہروی: اکبر بادشاہ کی ملازمت میں تھا۔ خطِ رقاع اور نستعلیق کا ماہر تھا۔ اُس نے فولاد کے ایک ٹکڑے پر اکبر اور اس کے اجداد کے تمام نام امیر تیمور صاحبِ قران تک خطِ رقاع میں کندہ کئے تھے۔

تمکین کابلی: خطِ نستعلیق میں ماہر اور مُہر کنی میں کامل تھا۔

میر دوست کابلی: خطِ نستعلیق اور خطِ رقاع کا اُستاد تھا، لیکن نستعلیق، رقاع سے بہتر تھا اور عقیق پر مُہریں بناتا تھا۔

مولانا ابراہیم: اپنے بھائی شرف یزدی کا شاگرد تھا۔ خطِ رقاع اور نستعلیق میں مشہورِ روزگار تھا۔ لعل ہائے شاہی پر "جل جلالہ" کا نقش اسی نے کندہ کیا تھا۔

مولانا علی احمد دہلوی: نستعلیق میں عدیم المثال اور دیگر خطوط میں

www.bhatkallys.com

درجۂ کمال رکھتا تھا۔ فولاد پر نقاشی کے کام میں یگانۂ روزگار مانا جاتا تھا۔ اپنے باپ شیخ حسین کا شاگرد اور نقش و نگار بنانے میں مقصود ہروی کا مقلد تھا۔ شاعری کا بھی ذوق تھا۔ نشانی تخلص تھا۔ جہانگیر بادشاہ کی اُستادی کا شرف بھی رکھتا تھا۔ جہانگیر ہمیشہ علمی و ادبی مسئلے میں اسی سے مشورہ لیتا تھا۔ اُس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ لوگ عراق، ترکستان اور خراسان سے آکر اپنی مُہریں اس سے بنواتے تھے۔ دلّی میں مہروں کی گرم بازاری اور شہرت اسی کے دَم قدم کی بدولت ہوئی۔

عہدِ اکبری کی مشہور پانچ مُہریں یہ تھیں[1]:

مُہر محرابی: اس پر بادشاہ کا نام اور اُس کے چاروں طرف یہ شعر منقش تھا:

راستی موجب رضائے خُدا است
کس نہ دیدم کہ گم شُد از رہِ راست

یہ مُہر احکام اور دادخواہی کے فرامین پر ثبت ہوتی تھی۔

مُہر مدوّر یا اُزوگ: اُزوک چغتائی لفظ ہے۔ یہ مُہر دیگر فرامین پر لگتی تھی۔

مُہر کلاں: اس پر بادشاہ کا نام مع اعدادِ اسم ہر دو طرف نقش تھے اور

---

[1] آئینِ اکبری جلد اول ص ۹۰ سطر مطبوعہ دارالطبع عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۷ھ

www.bhatkallys.com

یہ ان خطوط پر لگائی جاتی تھی، جو بادشاہ کی طرف سے دوسرے بادشاہوں کے نام بھیجے جاتے تھے۔

مہر چہار گوشہ: اس پر "اللہ اکبر جل جلالہ" کا نقش تھا۔ یہ مختلف کے احکام پر ثبت ہوتی تھی۔

مہر شاہی حرم سرا: یہ شاہی حرم سرا کے احکام پر لگائی جاتی تھی۔

ماحصل یہ کہ خطاطی اور مہر کنی میں چولی دامن کا ساتھ ہے قدیم سے ہر زمانے اور ہر بادشاہت میں براجتی، رنگ جماتی، نمو زندگی پاتی اور اپنے بے شمار خطوط اور نقوش میں تاریخ کہن دوہرا عہد مغلیہ کی داستان سناتی۔ ابوظفر بہادر شاہ ثانی کے عہد میں بادشاہ کے ساتھ دہلی کے لال قلعے اور شہر کی چار دیواری میں زندگی کا آخر سانس لیتی ہے۔ اس آخری سانس میں بھی کتنا کس اور بل تھا۔ لال جو لیجیے۔ خود بہادر شاہ، بادشاہ ایک مشہور و معروف خطاط تھے۔ شہر آبادی میں نظر ڈالیے تو وہاں بھی ایک سے ایک بڑھ کر خط اور مہرکن موجود تھے۔

میاں محمد جان، میر امام علی، سید جلال الدین اور بدر الدین علی خاں کو بادشاہ نے "مرصع رقم" کا خطاب دیا تھا۔ بدر الدین خط نستعلیق اور نسخ میں واقعی مرصع رقم تھے۔ ہندی اور انگریزی حروف میں بھی ان کو کافی مہارت تھی۔ اپنے نانا شیخ محمد یار کے شاگرد تھے لیکن خط میں آغا عبدالرشید کی طرز کے مقلد تھے۔ اس زمانے میں دہلی

www.bhatkallys.com

سے بڑھ کر کوئی حکاک مُہر کن نہ تھا۔ اُن کی ایک مُہر ایک ایک اور
ہزار روپے کی ہوئی تھی۔ مرزا غالب کی دونوں تاریخی مُہریں
یگانۂ روزگار نے بنائی تھیں۔ انھیں کے ہاتھ کی تین مُہریں
الحروف کے خاندان میں اب تک موجود ہیں۔ ایک لوہے پر
دو عقیق پر ہیں۔ عقیقی مہروں پر میرے جدّ حضرت سیّد محمد مرحوم
شاہی امام جامع مسجد دہلی کا نام اور سن ۱۲۸۰ ہجری کندہ ہے۔
دریبے میں جس کا اصل نام "دُرِّ بے بہا" تھا ایک کوچہ
قی بیگم کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اُسی کے آس پاس ہیں
کرتے تھے۔ اسی کوچے میں بدرالدین علی خاں کی بنوائی ہوئی
مسجد اب تک موجود ہے۔ مسجد کی پیشانی پر سنگِ باسی کے ایک
کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے۔

کتبہ

برائے حضرت سبحان و رحماں	شد ایں مسجد بنا صد شکر و احساں
تمامی مِلک خود زرعی و سکنی	نمودم وقف آں را از دل و جاں
ازاں نصفے برائے وارثان ہست	دگر بہرِ مساکین، مستحقاں
بریں تقسیم اگر حجت کند کس	ز حاکم منع گردندش مسلماں
الٰہی تا بحشر ایں را نگہدار	ز بیع و رہن غصب و جملہ نقصاں
بگو سال از سرِ للّٰہ نقشی	مساکیں جائے بدرالدین علیخاں

۱۲۵۷ ہجری

www.bhatkallys.com

اِسی کوچہ بلاقی بیگم سے ذرا آگے داہنے ہاتھ کو مشہور گلاب گندھی کی دُکان سے متصل ایک اور چھوٹی سی دو منزلہ مسجد ہے۔ یہ بھی بدرالدین علی خاں ہی کی تعمیر کردہ ہے۔ مغرب کی جانب دیوار کے بیرونی حصے پر سورج کا ایک سُنہری نقش بنا ہوا ہے۔ اِسی کے ایک گوشے میں یہ عبارت درج ہے۔

چوں آفتابِ روشن توحید ذو الجلال | بنمود رُخ ز مطلع ایں غرّہ کمال
اے عابدانِ دہر چو ایں سجدہ گاہِ نور | بینید در رکوع در آئید چوں ہلال
بندۂ مسکیں بدرالدین علی خاں از نیاز | کرد ایں تعمیر بہرِ خالقِ ربّ العلا
از سرِ برکاتِ ہاتفِ سالِ تاریخش بگفت | ہبطِ فیضِ الٰہی مسجد نیکو بنا
۲ | ۱۲۵۹ھ

بدرالدین علی خاں مرصع رقم کے دو لڑکے رشید الدین علی خاں اور سعادت اللہ خاں تھے۔ آخر الذکر لاولد گزرے۔ مرحوم نے اپنے باپ کی بنائی ہوئی مسجد میں ایک مدرسہ عربیہ قائم کیا تھا جو بعد میں بند ہو گیا۔ رشید الدین علی خاں کے لڑکے ظہیر الدین مہر کن تھے۔ اُن کی رہائش لال دروازے میں تھی۔ روایت ہے کہ اُن کے پاس اپنے دادا بدرالدین علی خاں کی بنائی ہوئی مہروں کا ایک البم تھا۔ راقم الحروف کے دیکھنے میں نہیں آیا۔

بدرالدین علی خاں کے شاگردوں میں مُنوّر علی، مہر کن ساکن کٹرہ برٹیاں کا نام لیا جاتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ عبداللہ ابن

www.bhatkallys.com

حسین بخش کے شاگرد تھے۔ یہ عبد اللہ عقیق پر مہریں بناتے تھے۔ حسین بخش کے خاندان میں ابھی تک مہر کنی کا فن باقی ہے۔ چنانچہ حسین بخش کے بعد اُن کے لڑکے عبد اللہ مذکور الصدر اور کریم الدین مہر کن ہوئے۔ کریم الدین کے لڑکے عظیم الدین اور اُن کے پوتے ضیاء الدین مہر کن مٹیا محل دہلی میں رہتے ہیں۔ چاندنی چوک میں اُن کی دکان ہے۔ دلّی میں اِس وقت اُن کی بڑی ساکھ ہے۔ کوفی، ثلث، نسخ، نستعلیق طغرا، گلزار، ماہی تمام قدیم و جدید خطوں کے عالم اور ماہر ہیں۔ چاندی سونا، فولاد اور جواہر جس چیز پر چاہو ان سے مہر بنوا لو۔

عبد اللہ مرحوم کے شاگردوں میں احمد جان اور اُن کے بھائی نثار احمد مرحوم بھی تھے۔ نثار احمد کے شاگردوں میں اُن کے لڑکے محمد احمد مہر کن ساکن لال کنواں ابھی حیات ہیں۔ منوّر علی خاں کے شاگردوں میں فیض علی، خلیفہ عبد العزیز اور اسرار الحق وغیرہ ہوئے۔ اسرار الحق کے لڑکے ضمیر الحق ساکن پہاڑ گنج کی دوکان دریبہ کلاں میں ہے۔ مہر کنی کرتے ہیں۔

اِن لوگوں کے علاوہ اسلام الدین مرحوم کے لڑکے صلاح الدین اور بدیع الدین[1] ساکن کوچہ نٹواں کا شمار بھی خاندانی مہر کنوں میں ہوتا ہے۔ یہ لوہے اور پیتل وغیرہ پر لاجواب مہریں بناتے ہیں۔ انگریزی حکومت کا اکثر کام انہی کے ہاں بنتا ہے۔ اِن کا کارخانہ سرائے

[1] تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان آ گئے۔ اس وقت اُن کی دکان بندر روڈ کراچی پر ہے۔

www.bhatkallys.com

توپ خانے میں ہے۔

مرزا احمد بیگ ہر قسم کی ربڑ کی مہریں بناتے ہیں۔

مہر کنی بظاہر بہت مختصر اور آسان کام ہے لیکن فی الحقیقت اپنی نزاکت، خوب صورتی اور باریکی کے اعتبار سے نہایت کاریگری اور دیدہ ریزی کا کام ہے۔ چاندی، سونے، فولاد اور تانبے کی مہریں بنانا کچھ زیادہ مشکل نہیں لیکن یہی کام جواہرات پر کرنا بہت دشوار ہے جیسا کہ اُن کے طریقۂ عمل سے صاف واضح ہے۔

سب سے پہلے نگینہ ساز آپ کے پسندیدہ نگینے کو گول بیضوی، چوکور یا جس ساخت اور جتنے پہل کا آپ پسند کریں گے اپنی سان پر تراش کر بنائے گا۔ باقی کام مہر کن کا ہے۔ مہر کن اُس نگ کی صاف سطح پر عمدہ قسم کی ایک سیاہ روشنائی سے ہلکی سی تہ قائم کرتا ہے۔ پھر سُرمئی پنسل کی نہایت باریک نوک سے صاحب مہر کا نام اور جو نقش مطلوب ہوتے ہیں اُن کا خاکہ یا اُلٹے آؤٹ بناتا ہے۔ اس عمل کو مہر کنی کی اصطلاح میں الفاظ کی "نشست بٹھانا" یا "کرسی قائم" کرنا کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی ایک خاص قلم سے (جس میں ہیرے کی کنی لگی ہوئی ہوتی ہے) اِن نقوش کو بڑی احتیاط اور چابک دستی سے ذرا گہرا اور پختہ کرتا ہے۔ اب اِن نقوش کو باقاعدہ کندہ کرنے کے لئے اُسے ایک "زیر چوب" (چوبی دستہ یا دستی) پر مسالے سے جماتا ہے۔ باقی کام چرخ اور کمانی کی مدد

www.bhatkallys.com

سے اس طرح کیا جاتا ہے کہ مُہر کن اس زیر چوب کو اپنے بائیں ہاتھ کی گرفت میں لے کر چرخ پر لے جاتا ہے۔ اور دائیں ہاتھ سے کمانی پکڑتا ہے اور چرخ کو حرکت دیتا ہے۔ اس چرخ کی کھونٹیوں کے درمیان فولاد کی وہ چانتی (برما) لگی ہوئی ہوتی ہے جو مُہر کے نقوش کا دَور کاٹتی ہے۔ اس چانتی کے منہ پر ایک اور نہایت تیز دھار فولادی پھِرکی بھی پیوست ہوتی ہے۔ دراصل یہی پھرکی مُہر کے حروف و نقوش کو کندہ کرتی ہے۔ اس برمے کا سیدھا ہونا انتہائی ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر سارا عمل بے کار ہے۔

چاندی، سونے، تانبے، پیتل اور لوہے کی مہروں، تمغوں، مونوگراموں اور چپڑاسوں میں صرف اس قدر کام کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی سطح پر گیرو یا کھریا پھیر کر اُن حروف کی نشست قائم کی جاتی ہے۔ پھر اسپات کی نوک دار قلم سے ان نشانوں کو گہرا کرتے ہیں۔ آخر میں لوہے کے شکنجے میں کس کر فولادی برمے کے ذریعے احتیاط کے ساتھ ان نقوش کو حسبِ دل خواہ کندہ کر لیتے ہیں۔

چپڑاسوں وغیرہ کے حروف کو سیاہ اور روشن کرنے کے لیے چپڑا لاکھ کو مٹی کے تیل یا تارکول میں ملا کر ان حروف پر پھیر دیا جاتا ہے۔

دِلّی کے پُرانے خاندانوں میں جو لوگ قدیم تہذیب کے دلدادہ ہیں اب بھی یہ چاندی سونے کی سادہ اور قیمتی پتھروں کی مُہریں بنواتے ہیں۔ ورنہ فی الاصل اس نئے اور ترقی یافتہ دور میں

www.bhatkallys.com

ان مہروں کی جگہ ربڑ کی مہریں نکل آئی ہیں جو ظاہر ہے کہ چاندی، سونے یا قیمتی پتھروں والی مہروں کی بہ نسبت بہت کم داموں میں بہت جلدی تیار ہو جاتی ہیں۔ آج آرڈر دیجئے کل آکر لے لیجئے۔ فوری ضرورت ہو تو دو چار گھنٹے ہی میں بن جاتی ہیں۔ سرکاری، نیم سرکاری اور تمام نجی دفاتر میں اب انہی مہروں کا رواج ہے۔ ربڑ کی مہریں ایک روپے سے دس بارہ روپے تک اور قیمتی پتھروں کی مہریں اس زمانے میں دس بارہ روپے سے لے کر سو دو سو روپے تک میں بن جاتی ہیں۔

---

www.bhatkallys.com

دِلّی کی سادے کاری

سادہ کاری کو صرف سادہ کاری کہنا میرے نزدیک اس صنعت کو کوسنا ہے۔ ہاں سادہ کاری کو حُسن کاری اور سادکار کو حُسن کار کہیے تو زیب دیتا ہے۔ اس لئے کہ سادگی اور پُرکاری اس صنعت کا ادنیٰ اشعبدہ ہے۔

سادہ کار غالباً "شُدھ کار" کا غلط تلفّظ ہے، شُدھ کار یعنی وہ کام جو خوب صورتی اور نزاکت کے اعتبار سے نہایت خوش نما اور بقول ایک سادہ کار پورے باون تولے اور پاؤ رتّی کا ہو۔ کام اور پیسے کی رعایت سے اگر ہم سادہ کار یا شُدھ کار کی جگہ اُسے "صدکار" کا لقب دیں تو ہمارے خیال میں یہ سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سادہ کاری کا کام اپنی گوناگوں خوبیوں، کام کے پھیلاؤ اور وسعت کے لحاظ سے بہت سے پیشوں پر مشتمل ہے۔ ایک پٹوہ گری کو چھوڑ کر باقی مینا کاری، سُناری، چتائی کاری، مرصّع کاری، نگینہ گری، بندھائی، جڑائی،

www.bhatkallys.com

یہاں تک کہ لوہار اور بڑھئی کے بعض کام بھی اس میں شامل ہیں۔ پھول پتیوں کی ڈرائنگ، مصوری اور خطاطی کو بھی اس فن میں عمل دخل حاصل ہے۔ لہٰذا صحیح معنوں میں سادہ کار وہی ہے جو ان تمام چیزوں سے واقفیت رکھتا ہو اور شروع سے آخر تک سارا کام خود انجام دے۔

دِلّی کے سادے کار عام طور پر لاہوریوں کے نام سے مشہور اور معروف ہیں۔ مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی مؤلف، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں کی تحقیق کے مطابق اُن کا یہ عرف کوٹلی لوہاراں کے باشندے ہونے کی وجہ سے پڑ گیا ہے۔ یہاں کی اعلیٰ ظروف سازی کی صنعت کسی زمانے میں بڑی مشہور تھی۔ دِلّی کے سادے کاروں کو مولوی صاحب کی اس تحقیق سے اختلاف ہے۔ بجز اس بات کے سادہ کاروں کی برادری کے بزرگ مغلوں کے عہد میں دِلّی میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ دِلّی میں[1] ان لوگوں کی تعداد[1] تقریباً تین ہزار رہی ہے۔ کوچہ اُستاد حامد، چاہ رہٹ، کوچہ نٹواں، کوچہ رائے مان اور پہاڑ گنج یہ پانچوں مقامات اُن کی آبادی کے بڑے بڑے مرکز[2] ہیں۔ دِلّی کے علاوہ ان کی برادری کے لوگ ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے شہروں[3] بالخصوص آگرہ، لکھنؤ، مراد آباد، لاہور، بمبئی، کلکتہ، کراچی اور مختلف چھوٹی بڑی ریاستوں مثلاً حیدر آباد، دکن۔ بھوپال۔ رام پور، ٹونک، لوہارو، الور، جے پور، گوالیار، پٹیالہ اور میسور وغیرہ میں

---

[1]، [2]، [3]:- قیامِ پاکستان سے قبل۔

www.bhatkallys.com

پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ فی الاصل خود ان غریبوں کو اپنی بود و باش، اپنے خاندان اور اپنے پیشے کی تاریخ کا پوری طرح علم نہیں۔ وہ شُبہ کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم مشہور اُستادِ زماں، حامد اور احمد، لاہوری و شاہ جہانی کی اولاد سے ہیں اور شاہ جہاں کے عہد میں دِلّی آگئے تھے۔

احمد و حامد کون بزرگ تھے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں جناب محمد عبداللہ صاحب چغتائی کے مضمون "معمارِ تاج" مطبوعہ سالنامہ 'کارواں'، لاہور ۱۹۳۲ء سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس مضمون میں مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے اُس مقالے کے چند اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جو انھوں نے دائرۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور کے جلسے میں بعنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان" پڑھا تھا۔ اس مضمون میں شروع سے آخر تک احمد و حامد اور احمد کے لڑکے عطاء اللہ رشیدی، لطف اللہ مہندس اور نور اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ نیز لطف اللہ مہندس کے دو لڑکوں، امام الدین الریاضی لاہوری اور خیر اللہ نیز امام الدین الریاضی کے لڑکے محمد علی ریاضی وغیرہم کے نام معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ جہاں نے دہلی کی عمارات کی داغ بیل ۱۰۴۸ھ میں ڈالی تھی۔ شاہ جہانی تواریخ "عملِ صالح" اور "بادشاہ نامہ" محمد وارث میں احمد و حامد دو معماروں کے نام مذکور ہیں، جن کی نگرانی میں دِلّی کی عمارات تعمیر ہوئی تھیں جیسا کہ ذیل کے اِن دو اقتباسات سے واضح

www.bhatkallys.com

ہوتا ہے:

"بعد[1] از ترنج ساعت از شب جمعہ، بیست و پنجم ذی الحجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس موافق ۱۰۴۸ھ ہجری در زمان محمود داوان مسعود، استاد احمد و حامد سر آمد معماران، نادرۂ کار، بسرکاری عزت خاں، صوبے دار، در آنجا، و صاحب اہتمام این کار مطابق تازہ و نقشے بدیع کہ ہم چو بہ نظیر آں در شش جہت دنیا بہ نظر نظارہ گیاں درنیامدہ بود۔ الخ"

بحکم اشرف[2] بعد از ترنج ساعت از شب جمعہ، بیست و پنجم ذی الحجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس موافق سنہ ہزار و چہل و ہشت ہجری کہ مختار دانشوران انجم و افلاک بود، استاد احمد و حامد کہ معماران ماہر بودند، کار عمارت سر آمد بسرکاری عزت خاں، برادر زادہ عبد اللہ خاں بہادر، فیروز جنگ کہ ناظم صوبۂ دہلی و اہتمام تاسیس عمارات، مذکورہ باد،

---

[1] عمل صالح ماخوذ از معمار تاج بحوالہ برٹش میوزیم اے ڈی ڈی ۶۲۲۔

[2] بادشاہ نامہ محمد وارث، ماخوذ از معمار تاج بحوالہ نسخہ برٹش میوزیم، سی۔اے۔پی۔ ایس۔او، آر، ڈی ۳۔

www.bhatkallys.com

مفوض فرمود مطابق طرح کہ در پیش گاہِ خلافت مقرر گشتہ بود رنگ ریختند۔ الخ

اسی مضمون مذکورہ بالا میں ایک جگہ سید مرتضیٰ[1]، ہیڈ کلرک کمانڈر انچیف گورنمنٹ برطانیہ دہلی کا بھی ذکر آیا ہے۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ احمد و حامد دونوں بھائی تھے۔ یہ بات قابلِ تحقیق ہے اور خاص طور پر یہ روایت کہ کوچۂ اُستاد حامد میں سادے کاروں کا جو کنبہ اس وقت آباد ہے اُن کا سلسلۂ نسب احمد و حامد سے ملتا ہے یا نہیں۔ بعض سادے کاروں کے بقول اگر ملتا ہے تو پھر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دلّی کے سادہ کار فی الاصل لاہوری ہیں اور بہ عہدِ شاہ جہاں، عزت خاں، ناظم و مہتمم عمارات شاہ جہانی صوبہ دہلی کے بلانے پر دلّی آئے۔ اُن میں سے بعض معمار ہوئے، بعض نے مصوری کو پسند کیا، بعض نے نقاشی کو اور بعض نے سادہ کاری اور دیگر پیشوں کو اختیار کیا۔ جہاں تک اِن سادے کاروں کا تعلق ہے، یہ اپنے ہنر و فن میں اِس درجہ طاق تھے کہ عوام و خواص تو ایک طرف رہے بادشاہ تک اُن کی قدر کرنے لگے۔ شاہی قدر دانی اور سرپرستی نے انھیں خوب چمکایا۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں اُن کی شہرت نہ ہو۔ ۱۸۵۷ء میں ہنگامۂ آزادی برپا ہوا۔ یہ کھکیڑ اٹھانے

---

[1] یہ وہی سید مرتضیٰ ہیں جن کا ذکر دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں میں آ چکا ہے اور اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

www.bhatkallys.com

کے بعد جو باقی رہے اُن میں سے اکثر اسی مشہور و معروف تاریخی کوچہ اُستاد حامد کے رہنے اور بسنے والے تھے۔ مثلاً:

عبدالستار، فیض محمد ولد الٰہی بخش، چودھری ضیاء الدین، محمد یوسف، عبداللہ۔

اور آج بھی اُن کے فن اور ہنر کو یاد دلانے اور زندہ رکھنے والے اُن کے جانشین موجود ہیں۔ اُن میں سے بعض ایسے ہیں جو سادہ کاری کے مختلف شعبوں میں سے کسی ایک شعبے پر اس طرح حاوی ہیں کہ کوئی دوسرا اُن کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ مثلاً:

کوچہ اُستاد حامد میں: محمد سلیمان خلف محمد اکبر اور عبدالغفار۔

محلہ چاہ رہٹ میں: چودھری سعید الدین خلف بدر الدین، ریاض الدین خلف وزیر الدین، محمد فضل اور محمد عثمان ملازم سرکار جے پور۔

پہاڑ گنج میں: عنایت الرحمٰن خلف عزیز الرحمٰن وغیرہ

کا شمار مشہور و معروف سادے کاروں میں ہوتا ہے۔

دِلّی کے انہیں سادہ کاروں کا ایک خاندان آج سے ۱۳۰ برس پہلے ریاست الور میں جاکر آباد ہوا تھا۔ چنانچہ اس وقت اَلور کے اسلحہ خانے میں جس قدر پُرانی تلواریں اور دیگر نادر و قیمتی ہتھیار ہیں وہ سب اسی خاندان کی دست کاری کا تاریخی نمونہ ہیں۔ اَلور کے ان اسلحہ جات کو کئی بار مختلف ولایتوں کی نمائشوں میں بھیجا جاچکا

www.bhatkallys.com

ہے۔ اِن خدماتِ عالیہ کی بدولت آج بھی شیخ بشیر احمدؒ ابن شیخ نثار احمد ابن شیخ محمد ابراہیم ریاست آلور کے منصب داریعنی عزیز السلطنت آنریری مجسٹریٹ معافی دار اور میونسپل کمشنر ہیں۔ لطیف احمد اُن کے برادر خورد ہیں۔

فنِ سادہ کاری کے متعلق ایک عام آگاہی حاصل کرلینے کے لیئے یہ لازم ہے کہ اس کی ضمنی صنعتوں کو بھی تھوڑا بہت ضرور سمجھا جائے۔ فی الحقیقت یہ تمام صنعتیں زیورسازی کی مختلف کڑیاں ہیں جو آپس میں مل کر ایک زیور کا روپ اختیار کرتی ہیں:

پیشہ نیاری: نیارئے کا کام یہ ہے کہ کان سے نکالے ہوئے یا کھوٹے سونے چاندی کو میل اور کھوٹ وغیرہ سے کیمیاوی طریق پر صاف اور ایک دھات سے دوسری دھات کو جدا کرے۔

پیشہ سُناری: یہ زرگری ہے یعنی زیورات کو چند مسالوں سے دھونا، صاف کرنا، چمکانا یا ملمع کرنا۔ اکثر عورتیں اپنے زیورات کا رنگ ماند پڑجانے پر اُن کو اُجلوایا کرتی ہیں۔ جڑاؤ زیورات کو اُجلانے میں بڑی ہوشیاری اور محنت درکار ہے۔

پیشہ چِتائی کاری: اس کام کی نوعیت نقاشی سے متعلق ہے۔ زیوریا

ؔله یہ واقعہ ۱۹۴۲ء تک کا شاہد ہے۔

www.bhatkallys.com

برتن کی سطح پر آہنی قلم کی نوک سے مختلف خوب صورت خطوط اور پھول پتے کندہ کیے جاتے ہیں۔

پیشہ مرصع کاری : یہ اصل میں نگینہ گری ہے۔ جواہرات کو سان پر گھس کر اوّل اُن کے ڈول ڈالے جاتے ہیں۔ بعد ازاں اُن کے پہل اور گھاٹ تراشنے کے بعد اُن پر جلا اور چمک پیدا کی جاتی ہے۔ جواہر کے سان کا چکلا یا چاک، لاکھ اور چینی مٹی کے مرکب سے بنایا جاتا ہے۔

پیشہ بندھائی : موتیوں اور دیگر جواہرات میں نہایت باریک اور مہین سوراخ کرنا۔ اس کام کے کاریگر کو بندھیرا کہتے ہیں۔ بندھائی کا کام سُدھائی کے عمل سے زیادہ مشکل ہے۔ اگر موتی بندھنے میں چٹخ کر ٹوٹ جائے تو وہ زیور کے مصرف کا نہیں رہتا۔ چنانچہ مثل مشہور ہے کہ "بندھ گیا تو موتی نہیں تو کنکر۔"

پیشہ جڑائی : انگریزی زبان میں اس کو سیٹنگ کہتے ہیں، یعنی زیورات میں جواہر جڑنا۔ اس کام کے کاریگر کو جڑیا یا سادے کار بھی کہا جاتا ہے۔ سدھائی بھی اسی عمل کا نام ہے۔

www.bhatkallys.com

پیشہ میناکاری : یہ ایک قسم کی پچی کاری کا کام ہے جو سونے چاندی کے سادہ و منقش دونوں قسم کے زیورات اور ظروف پر کیا جاتا ہے۔ زیور یا ظرف کی سطح پر اوّل پھول پتیاں کندہ کی جاتی ہیں۔ پھر ان نقوش میں کچھ لون یعنی کانچ کے بنے ہوئے رنگین مسالے یا ایک مرکب سیاہ دھات بھرتے ہیں۔ اس عمل سے وہ گُل بوٹے سطح پر رنگ برنگ کے نظر آتے ہیں۔

پیشہ لوہار : نہائی، ہتھوڑے، ہتھوڑیاں، سون، ٹھپے، بانسہ گھوڑی، بنک نال اور دیگر مختلف اوزار لوہے اور پیتل کے بنائے جاتے ہیں۔

پیشہ بڑھئی : مختلف اوزاروں کے دستے، کمانیاں، سونے چاندی کے تار کھینچنے کی گھوڑیاں لکڑی یا کارڈ بورڈ کے مخملی بکس جن میں زیورات کو سجا کر رکھا جاتا ہے۔

اِن کاموں کے علاوہ سادے کار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نقاش، خطاط اور مصوّر بھی ہو تاکہ زیورات اور ظروف پر حسبِ ضرورت مختلف خطوط اور بیل بوٹے بنا کر اُن کے لئے نئے

www.bhatkallys.com

اور خوش نُما نمونے پیش کر سکے۔

ایک سادہ کار کو سونے اور چاندی کی مختلف قسموں سے بھی واقف ہونا ضروری ہے جن کی قسمیں حسب ذیل ہیں:

بارابانی سونا : سب سے اعلیٰ اور عمدہ قسم کا سونا ہے۔ اس میں کھوٹ بالکل نہیں ہوتی۔ انگریزی میں اِسے ۲۴ کیرٹ گولڈ کہا جاتا ہے۔ اصل میں کیرٹ ایک انگریزی وزن ہے جس کی تول سونے میں چار رتّی اور جواہرات میں چار گرین (ایک رتّی) کے برابر ہوتی ہے۔

پاسے کا سونا : کان سے تازہ برآمد شدہ سونے کی تقریباً ۲۰ تولہ وزنی مستطیل ٹکڑی ہوتی ہے۔

روے یا پاٹلے کا سونا: یہ مستعمل سونا ہوتا ہے جس کو تیزاب میں گلا کر نکھارا اور صاف کیا گیا ہو۔

جرمنی سونا : اس میں اصل سونا بالکل نہیں ہوتا۔ پانچ حصے تانبہ اور ایک حصہ جست ہوتی ہے۔

امریکن سونا : اس میں صرف ایک ماشہ سونا ہوتا ہے، باقی نو ماشے تانبہ اور دو ماشے چاندی ہوتی ہے۔ یہ کبھی سیاہ نہیں پڑتا۔

بست بسوہ چاندی : اعلیٰ قسم کی بے کھوٹ چاندی ڈلوں کی صورت

www.bhatkallys.com

میں ہوتی ہے۔

پترے کی چاندی : پرانا زری گوٹا اور اسی قسم کی دوسری نقرئی چیزیں گلا کر اور کھوٹ سے صاف کر کے اوّل ریقے کی صورت میں اور اگر زیادہ مصفا کیا گیا تو ڈلوں کی شکل میں یا اس سے بھی عمدہ قسم کی چاندی بنانی مقصود ہوئی تو پتروں میں ڈھال لیتے ہیں۔

زر و جواہر کی تجارت زیادہ تر بڑے بڑے صرافوں اور جوہریوں کے ہاتھ میں ہے جو ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں بڑی بڑی دکانیں لئے بیٹھے ہیں۔ ان دکانوں میں یا تو سفید چاندنی کا فرش ہوتا ہے جہاں دکان کا مالک اپنے دائیں بائیں ایک چھوٹی سی آہنی الماری اور سامنے ایک خوب صورت صندوقچہ رکھے ایک مخملی گدے پر براجمان اپنی دکان داری میں مصروف نظر آتا ہے یا پھر پوری دکان ایرانی قالینوں، ان پر بیش قیمت کرسیوں صوفوں اور مختلف شیشہ و آلات سے آراستہ نظر آئے گی۔ بجلی کی تیز روشنی میں آپ جا بجا شیشے کے خوشنما گلاس کیسوں اور الماریوں میں مخملی بکسوں کے اندر مختلف سادہ اور جڑاؤ زیورات کو چمکتے دمکتے ہوئے دیکھیں گے۔

غرض یہ کہ اس تجارت میں نمود و نمائش کا تو اس قدر اہتمام ہوتا ہے لیکن وہ غریب سادہ کار جس کی دستکاری کے اعلیٰ نمونوں

www.bhatkallys.com

سے یہ دُکان سجائی جاتی ہے اور اُن کی فروخت سے ہزاروں اور لاکھوں روپے کمائے جاتے ہیں شاذ و نادر ہی اپنے قدردان اور صاحب ذوق خریدار کی شکل تک نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ اس کا متمول دُکان دار اپنے شہر کی بنک یا بازار سے سونا چاندی خرید کر اس کو دیتا رہے اور وہ دن رات اپنا خون پسینہ ایک کر کے مختلف زیورات اور ظروف بنا بنا کر اس کو پیش کرتا رہے۔ اُسے اپنی محنت اور کاری گری کی اُجرت صرف چار یا پانچ روپے یومیہ کے حساب سے روزانہ، ہفتہ وار یا ماہ بماہ ملتی رہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض قیمتی چیزیں ایک مقررہ رقم پر ٹھیکے پر مل جاتی ہیں۔ اس صورت میں سادے کار کو قدرے زیادہ فائدہ ہو جاتا ہے۔

آج کل[1] عام طور پر لاکھ بھرے ہوئے یا ٹھوس سونے کے زیور کی اُجرت پانچ روپے فی تولہ مقرر ہے لیکن جڑاؤ زیورات کی شرح کا کوئی معیار مقرر نہیں۔ ایک جڑاؤ جھومر، نکلس یا ہار کی اُجرت کم از کم بہتر روپے سے شروع ہو کر ہزار ڈیڑھ ہزار تک پہنچتی ہے لیکن ایسے اعلیٰ قسم کے دستکار شہر کے جوہریوں یا صرافوں کی دکانوں کے تاوے کاٹتے نظر نہیں آتے بلکہ وہ نوابوں اور راجاؤں کے ہاں کام کرتے نظر آتے ہیں جہاں اُن کو صحیح معنوں میں اپنی

---

[1] یہ شرح اُجرت ۱۹۴۷ء میں تھی۔

www.bhatkallys.com

محنت کا صلہ اور فن کا انعام ملتا ہے اسی حد تک نہیں بلکہ اُن کی صنعت کے نمونے ریاستوں سے نکل کر سمندر پار ولایتوں میں طلب کئے جاتے ہیں۔ بادشاہوں اور شہزادیوں کے دست و بازو کی زینت اور زیب گوش و گلو ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت اُس وقت اُن کی صحیح قدر و منزلت ہوتی ہے۔

شاہی درباروں میں اُن کی صنعت صرف شاہی زیورات ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ سونے چاندی کے سادے اور جڑاؤ جام، صراحیاں، جگ، سلفچی، آفتابے، عطردان، خاصدان، پیالے، طشتریاں، چاقو، پیش قبض، خنجر، تلوار، زرہ بکتر، ہودے، جنگی رتھ، تاج اور تخت یہاں تک کہ محلوں کے درو دیوار بھی اُن کی مرصع کاری سے منقش اور مزین نظر آتے ہیں۔

یہ بادشاہوں، راجاؤں اور نوابوں کے بے پناہ شوق اور سادے کاروں کی کاری گری ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک طرح طرح کے بیسیوں زیورات پاتے ہیں۔ اُن میں بعض چیزیں تو بادشاہوں اور اُن کی بیگمات کی ایجاد ہیں اور باقی خواص و عوام کے اپنے ذوق و شوق اور پسند کا نتیجہ ہیں۔ ان گہنوں کے رواج کا کیا ٹھکانا، ان کے بغیر عورت کا حسن پھیکا اور شادی بیاہ سب بے کار۔

جب تک عورت کے بالوں میں موتی، مسیں پھول،

www.bhatkallys.com

مانگ میں مانگ، ماتھے پر ٹیکا، جھومر، کانوں کے سہارے، آویزے، بُندے، بجلی بالے، جھلنیاں، جھمکے، پتے، بالیاں، ناک میں نتھنی، لونگ، کیل، بلاق، گلے میں دُگدُگی، ٹیپ، جگنی، چمپا کلی، مالا، گلوبند، توڑا، چندن ہار، کیری، بازوؤں پر بازو بند، اِکّے، نورتن، نونگے، جوشن، ہاتھوں میں جہانگیریاں، نوگریاں، پہنچیاں، چوہے دنتیاں، کنگن، اِک نگیاں، ہاتھ پر ہتھ پھول، انگوٹھے پر آرسی، انگلیوں میں پور پور چھلّے، انگوٹھی، کمر پر کمر زیب، ازار بند کی زنجیر، کنجیوں کا چھلّا، پیروں کی پائل، پازیب، جھانجھن، توڑے، لچھّے، چوڑیاں، انگلیوں کے چھلّے، جتنی نہ ہوں تو سمجھ لیجیے کہ اس کے سولہ سنگار نامکمل ہیں۔

سونا اصل میں عورت کی جان ہے اور سچ پوچھو تو اس سونے نے اس سلونے کی مورت کو کچھ ایسی خوب صورتی اور شوبھا بخشی کہ شاعر، زلف و کاکل، رُخ و رخسار، چشم و ابرو، لب و دنداں، زنخداں اور کمر کی تعریف کے ساتھ ساتھ زیور کی قصیدہ خوانی بھی کرنے لگے۔ امیر خسرو، زیور کی پہیلی بوجھتے ہیں:

فارسی بولی آئینہ	ترکی ڈھونڈی پائینہ
ہندی بولوں آرسی آئے	خسرو کہے کوئی نہ بتائے

مرزا غالب فرماتے ہیں:

www.bhatkallys.com

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

میر حسن دہلوی کہتے ہیں:

سراسر گلے حُسن اُن کے پڑا
لگا ڈگڈگی ترنج لڑا اسّت لڑا

نزاکت میں بھی شاخِ گُل سے دو چند
وہ پہنچی زمرّد کی اور دست بند

غرض دِلّی کی اس قدیم دستکاری کے قصیدے اساتذہ کے کلام میں جا بجا منتشر ہیں۔ دیگر قدیم دستکاریوں کے برعکس جو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مٹتے مٹتے ختم ہوگئیں۔ سادے کاری روز افزوں ترقی پر ہے اور اس میں نت نئے فنّی پہلو اور خوبیوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ سادے کاروں کی مالی حالت بھی پہلے سے بہتر ہے اور شہر کے متمول طبقے میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔

---

www.bhatkallys.com

کاروانِ اسلام

مشہور صاحبِ قلم اور صاحبِ طرز ادیب مورخ جناب رئیس احمد جعفری نے "کاروانِ اسلام" میں ہماری چودہ سو سالہ تاریخ کو ایسے ...بیرانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ اس میں درایت بھی ہے اور روایت بھی، تعریض ...ہے اور تعریف بھی! خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی حکومتوں کے ایک غیر موجود سلسلہ ...نہایت خوبی سے مربوط کیا ہے اور انداز بیان سے تاریخ کو اس قدر دلچسپ بنایا ...طویل مطالعہ ذہن پر بار نہیں گزرتا۔ جعفری صاحب نے کاروانِ اسلام ...منزلیں متعین کی ہیں ان میں جدت بھی ہے اور تاریخی اہمیت بھی! آپ اس تاریخِ اسلام ...ان چند خصوصیات سے اسکی اہمیت اور گرانمایگی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اسلامی اخلاق اور پاکیزہ کردار کا ایک مثالی

مجموعہ

اُسوۃ الصالحین یعنی تذکرۃ الکاملین

مسلمانوں میں اسلامی زندگی اور حیاتِ صالحہ کو بیدار کرنے والا یہ گرانمایہ تذکرہ خلفائے راشدین اور صلحائے امت کے اخلاق و کردار کے مثالی واقعات پر مشتمل ہے! (قیمت مجلد ۔ چھ روپیہ)

ناشر: ایچ۔ ایم سعید کمپنی ناشران تاجران کتب، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی ۱

www.bhatkallys.com

ہماری پہیلیاں

پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں ادب کا ایک حصہ ہیں جنھیں
کے ساتھ نظر انداز نہیں کر سکتے، نہ چٹکلے پن میں نہ بڑپن میں۔ ادب کے یہ ننھے ننھے جواہر
ہمیں اپنی تاریخ، اپنے معاشرے، اپنے چلن اور اپنے ماضی کے بہت سے ایسے
دکھاتے ہیں جن کی آب و تاب سے ہماری آنکھیں کبھی سیر نہیں ہو سکتیں۔ یوسف
بخاری صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر اپنی تحقیق و تدقیق کا ایک اچھا
کیا ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ پہلی تصنیف ہے جس میں پہیلیوں کے متعلق
معلومات افزا مواد فراہم کیا گیا ہے۔ یہ صرف **پہیلیوں یا کہہ مکرنیوں** کا
ہی نہیں بلکہ ایک تاریخ ہے۔ جس کے مقدمہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ بحث
کی گئی ہے کہ پہیلی کب ایجاد ہوئی، اس کے متعلق قدیم اقوام کے کیا تصورات
پہیلی کسے کہتے ہیں اور اس کی کون کون سی قسمیں مختلف زبانوں میں رائج ہیں
اس میں تقریباً ایک ہزار فارسی عربی، اردو، ہندی اور دکنی زبان کی پہیلیوں
حسب ضرورت تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ اس پر یوسف بخاری صاحب کا انداز
مستزاد ہے۔ سائز ۲۷×۱۷، گرد پوش رنگین، طباعت نفیس، (قیمت مجلد چھ روپے

ناشر

ادب منزل (مالکان ایچ۔ ایم سعید کمپنی)

(پاکستان چوک۔ کراچی)